سفرنامے حج: لبیک اور منہ ول کعبے شریف کا تقابلی مطالعہ

(تحقیقی و تنقیدی مطالعہ)

مقالہ نگار:

عبدالعلیم

رجسٹریشن نمبر: 132-FLL/MSURDU/F14

مقالہ برائے ایم ایس (اُردو)

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

یہ مقالہ

ایم ایس (اُردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

کلیۂ زبان و ادب

شعبہ اُردو

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

International Islamic University CENTRAL LIBRARY ISLAMABAD

۲۰۱۹ء

Accession No. IH23092.

MS
915.09538
ع ب س

اردو ادب - سفرنامہ
" " - مکہ (سعودی عرب)

حج

سفرنامے حج: لبیک اور منه ول کعبے شریف کا تقابلی مطالعہ

(تحقیقی و تنقیدی مطالعہ)

تحقیقی مقالہ برائے ایم ایس اُردو

مقالہ نگار:

عبدالعلیم

رجسٹریشن: 132-FLL/MSURDU/F14

نگران:

ڈاکٹر عزیز ابن الحسن

ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اُردو

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

شعبہ اُردو

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

۲۰۱۹ء

2017

مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم

درج ذیل مقالہ شعبۂ اُردو، کلیہ زبان وادب، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی میں MS اُردو کی ڈگری کی جزوی منظوری کے لیے پیش کیا گیا ہے۔ زیرِ دستخطی نے یہ مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے اور MS اُردو کی ڈگری تفویض کرنے کی منظوری دیتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: "سفرنامے حج: لبیک اور منہ ول کعبے شریف کا تقابلی مطالعہ"

مقالہ نگار: عبدالعلیم

رجسٹریشن نمبر: 132-FLL/MSURDU/F14

کمیٹی دفاع مقالہ

ڈاکٹر عزیز ابن الحسن
صدر
شعبۂ اُردو
آئی آئی یو، اسلام آباد

پروفیسر ڈاکٹر ایاز اکبر
ڈین
کلیۂ زبان وادب
آئی آئی یو، اسلام آباد

ڈاکٹر ارشد محمود آصف (ڈاکٹر محمد معراج)
اسسٹنٹ پروفیسر (اُردو)
آئی آئی یو، اسلام آباد
اندرونی ممتحن

ڈاکٹر ... قاسم
اسسٹنٹ پروفیسر
وفاقی اُردو یونیورسٹی، اسلام آباد
بیرونی ممتحن

ڈاکٹر عزیز ابن الحسن
ایسوسی ایٹ پروفیسر (اُردو)
آئی آئی یو، اسلام آباد
نگران مقالہ

مارچ، 2020ء

تصدیق نامہ

عبدالعلیم نے رجسٹریشن:132-FLL/MSURDU/F14 کے تحت اپنا تحقیقی مقالہ برائے ایم ایس اردو، بعنوان ''**سفرنامے حج: لبیک اور منہ ول کعبے شریف کا تقابلی مطالعہ**'' میری نگرانی میں مکمل کیا ہے۔

کمیٹی دفاع مقالہ منعقدہ اجلاس مورخہ ۹/مارچ ۲۰۲۰ء میں جو تجاویز دیں اس کے مطابق مقالہ نگار نے درستی کر لی ہے۔اب یہ مقالہ شعبہ امتحانات کو بھیجنے اور ڈگری جاری کرنے کی سفارش کی جاتی ہے۔

ڈاکٹر عزیز ابن الحسن

سپروائزر/ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اُردو

کلیہ زبان و ادب

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

اقرار نامہ

میں، عبدالعلیم، رجسٹریشن نمبر 132-FLL/MSURDU/F14: حلفاً بیان کرتا ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی ہے اور شعبۂ اُردو، کلیۂ زبان و ادب، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی ،اسلام آباد کے ایم ایس (اُردو) سکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر عزیز ابن الحسن کی نگرانی میں مکمل کیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا اور نہ آئندہ کروں گا اور میرا یہ مقالہ سرقہ سے پاک ہے۔

(عبدالعلیم)

مقالہ نگار

شعبہ اُردو

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

۲۰۱۹ء

تصدیق نامہ

عبدالعلیم نے رجسٹریشن: 132FLL/MSURDU/F14 کے تحت اپنا تحقیقی وتنقیدی مقالہ برائے ایم ایس اردو، بعنوان "سفرنامے حج: لبیک اور منہ ول کعبے شریف کا تقابلی مطالعہ" (تحقیقی و تنقیدی مطالعہ) میری نگرانی میں مکمل کیا ہے۔

یہ مقالہ تحقیقی وتنقیدی حوالے سے ایم ایس کے معیار کے مطابق ہے۔ میں سفارش کرتا ہوں کہ یہ مقالہ جانچ کے لیے ممتحنین کو بھجوادیا جائے۔

ڈاکٹر عزیز ابن الحسن
ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اُردو
کلیہ زبان وادب
بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

فہرست ابواب

صفحہ نمبر	نام ابواب
vi	پیش لفظ
۱	باب اول: اُردو میں سفرنامہ حج: آغاز وارتقاء
۴۱	باب دوم: ممتاز مفتی اور مستنصر حسین تارڑ کا فن سفرنامہ نگاری
۸۲	باب سوم: لبیك اورمنه ول کعبے شریف میں فکری واسلوبیاتی اشتراکات
۱۱۹	باب چہارم: لبیك اورمنه ول کعبے شریف میں فکری واسلوبیاتی امتیازات
۱۵۶	حاصل بحث، نتائج اور سفارشات
۱۶۰	کتابیات

پیش لفظ

سفر انسان کی زندگی میں بہت اہمیت کا حامل ہے۔ سفر کی کشش، اس کی رعنائی، اس کی دلچسپی اور اس کی رنگینی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ بچپن میں جب بڑوں کے منہ سے سفر کی باتیں سنتے تھے دل کی عجیب کیفیت ہوا کرتی تھی۔ خاص طور پر کسی جگہ سیر پر جانے کا پروگرام بن رہا ہوتا تو دل بلیوں اچھلنے لگتا۔ سفر کا یہ شوق عمر کے ساتھ ساتھ پروان چڑھتا رہا۔

کسی دوست کے توسط سے ایک کتاب پڑھنے کو ملی جو حج کے سفر کی داستان تھی۔ پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ اور سفر کے دوران میں آنے والے دیگر مقامات کا بیان تھا۔ مقدس مقامات کے بارے میں تفصیلاً بیان کیا گیا تھا۔ مزید پڑھنے کا شوق جاگا۔ کچھ اور سفرناموں کے بارے میں پتہ چلا۔ چند ایک نظر سے گزرے، کچھ تلاش کیے۔ ابنِ بطوطہ کا رحلة ابن جبیر، شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا جذب القلوب الیٰ دیار المحبوب وغیرہ پڑھے۔ فیوض الحرمین اور سوانح الحرمین جیسے حج کے سفرناموں سے واقفیت حاصل ہوئی۔ اسی طرح تلاش کرتے کرتے مجھے اردو کے معروف ادیب ممتاز مفتی کا سفرنامہ لبیک پڑھنے کا موقع مل گیا۔

اسے پڑھ کر شوق کو تسکین ملی۔ ممتاز مفتی نے ایسے تاثر انگیز انداز میں ہر چیز کو بیان کیا کہ ان کا لکھا ہوا ایک ایک لفظ دل میں اتر گیا۔ مقدس مقامات کو دیکھنے کی طلب اور بڑھ گئی۔ مذہبی وارفتگی اور دین سے لگاؤ میں اضافہ ہوا۔ عشقِ رسول ﷺ قلب میں جاگزیں ہوا۔ اسے پڑھا تو پڑھتا ہی چلا گیا۔ کئی بار پڑھ ڈالا۔

شوق کا یہ رہنما مجھے مستنصر حسین تارڑ تک لے گیا، جن کا سفرنامہ ''منہ ول کعبے شریف'' ایک خاصے کی چیز ہے۔ اُس کے مطالعہ نے مجھ پر علم و حکمت کے بہت سے در وا کئے۔ انہوں نے ایسے رقت آمیز انداز میں ان سارے مقامات کا ذکر کیا جہاں نبیوں، رسولوں کے مسکن تھے۔ جہاں ان کی زندگیاں گزری تھیں۔ خصوصاً خانہ کعبہ، روضۂ رسول اور غارِ حرا کے مناظر نہایت گداز دل سے بیان کیے گئے ہیں۔ پڑھ کر قلب میں عجیب نور سا موجزن ہونے لگا۔

ایم فل کے مقالے کے لئے موضوع کا انتخاب کرنے کا مرحلہ آیا تو میں نے اپنے پسندیدہ موضوع یعنی حج کے سفرناموں کا انتخاب کیا۔ حج کے سفرناموں کی ابتدا، تاریخ، ارتقا، جدت، مصنفین اور موضوعات پر مکمل معلومات حاصل کر کے انھیں اپنے مقالے کا حصہ بنایا۔ مقالے کا خصوصی موضوع ''لبیک'' اور ''منہ ول کعبے شریف'' میں فکری و موضوعاتی اور اسلوبیاتی اشتراکات اور فکری، موضوعاتی اور اسلوبیاتی امتیازات کو موضوع بنایا۔ اس سلسلے میں بہت

سے دوستوں کے مشورے اور اساتذہ کی رہنمائی کی ضرورت پڑی۔

ہر دوست نے میری مدد اور تمام اساتذہ نے بھرپور رہنمائی کی اور میں ایسے دقیق موضوع پر ایسا معلومات سے بھرپور مقالہ لکھنے کے قابل ہوا۔علمی جذبہ اور مطالعاتی جوش وخروش نے میرے قلم کو جنبش دی اور پھر یہ سلسلہ چلنے لگا۔ کتابوں کے مطالعہ میں ڈوبنے کا وقت آیا۔ لائبریریوں کو چھاننے کا مرحلہ آیا۔ جرائد و رسائل کو کنگھالنے کی ضرورت پیش آئی۔اخبارات اور الیکٹرونک میڈیا تک رسائی حاصل کی اور مقالے کا آغاز کر دیا۔

خدائے بزرگ و برتر کی مدد شامل حال رہی اور تمام مراحل طے ہوتے گئے۔اگر چہ یہ سب کچھ اتنا آسان نہ تھا لیکن ہمت باندھ کر اس مشکل سفر پر چل پڑا۔اس سفر میں سفر نامے تھے، سفر نامہ نگار تھے، محققین تھے، حوالے تھے، شرعی نکتہ جات تھے، قلبی کیفیات تھیں، معرفت تھی، رقت تھی، سرخوشی تھی، اداسی تھی۔

ان سب نشیب و فراز کو طے کرتے کرتے بالآخر مقالے کی تکمیل کا مرحلہ قریب آ ہی گیا۔مقالہ مکمل ہوا اور ذہن سے ایک بوجھ اترا، لیکن اس سارے کام میں مجھے جو معلومات حاصل ہوئیں، جن حالات اور واقعات کا بیان میری نظر سے گزرا اور جن کیفیات سے قلب آشنا ہوا وہ بلا شبہ میری زندگی کا ایک قیمتی سرمایہ ہیں۔ان عشق و محبت کی باتوں نے دلوں پر لگے قفل توڑے، میل اتاری، بناوٹی مسلمان میں سے ایک کھرا اور سچا مسلمان نکلا۔بطور طالب علم اس قدر معلومات ملیں کہ مجھے اپنے آپ میں ایسی تبدیلی کا احساس ہوا جسے نے مجھے باور کروایا کہ میں پہلے کیا تھا اور اب کیا ہوں۔میری معلومات میں اس اضافے کو میں نے مقالے کی صورت میں رقم کر دیا ہے۔امید ہے جب یہ تحریر قارئین کی نظر سے گزرے گی تو ان کے علم میں بھی خاطر خواہ اضافے کا موجب ہوگی۔

تسویدِ مقالہ میں مجھے جن شخصیات کا خصوصی تعاون حاصل رہا، اُن کا ذکر نہ کرنا علمی و ادبی بددیانتی کے مترادف ہوگا۔ میں سب سے پہلے اپنے نگران مقالہ ڈاکٹر عزیز ابن الحسن، صدر شعبہ اُردو، کا انتہائی ممنون ہوں جنہوں نے نہ صرف اپنی سرپرستی میں یہ تحقیقی کام کروانے کی عزت افزائی سے نوازا بلکہ اپنی گوناگوں مصروفیات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے میری ہر لحہ مدد فرمائی۔اس کے علاوہ میں اپنے تمام اساتذہ ڈاکٹر طیب منیر (مرحوم)، ڈاکٹر کامران عباس کاظمی، ڈاکٹر رذش ندیم اور ڈاکٹر ارشد معراج کا انتہائی شکر گزار ہوں جن کی محبتوں، مفید مشوروں اور حوصلہ افزائی کی بدولت آج اپنے اس تحقیقی مقالے کو مکمل کرنے میں کامیاب رہا ہوں۔

اور آخر میں اپنے والدین اور تمام بہن، بھائیوں کا بھی بے حد ممنون ہوں۔ علاوہ ازیں محمد اسحاق خان، محمد امجد، سید ماجد گردیزی اور اپنے کلاس فیلو عادل بادشاہ، سید آغا خاور عباس، اعجاز بھٹی، محمد فریاد اور عبدالغنی کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

عبدالعلیم

ریسرچ سکالر (ایم ایس اردو)

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

باب اول:

اُردو میں سفر نامہ حج: آغاز وارتقاء

زندگی سفر ہے اور ہر شخص کی حیثیت ایک مسافر کی سی ہے۔سفر کا لفظ اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ خود انسان۔لوگ لاتعداد اغراض و مقاصد کو پورا کرنے کے لیے سفر پر نکلتے ہیں۔ یہ مقاصد تجارتی ،معاشی ،ادبی اور تعلیمی ہو سکتے ہیں۔ماضی میں جب مسافر سفر سے لوٹتے تھے تو سفر کے دلچسپ و حیرت انگیز واقعات اپنے اہل خانہ اور دوست احباب کو سنایا کرتے تھے یہی روایت بعد میں سفر نامے کا روپ اختیار کر گئی۔

تجارت نام ہی سفر کا ہے یعنی ایک جگہ سے دوسری جگہ اشیاء کی ترسیل۔سفر ہی کی بدولت تجارت ہوتی ہے اور کسی ملک کی معاشی حالت بہتر ہوتی ہے کیونکہ ایک جگہ بیٹھے رہنے سے ملک اور اس میں بسنے والے افراد جمود کا شکار ہو جاتے ہیں۔سفر کی مرہون منت ادبی اور تعلیمی دنیا میں بھی بہت سے کارنامے منظرِ عام پر آئے اور مثبت نتائج دیکھنے کو ملے۔دہلی سلطنت اور مغلوں کا دور اس تناظر میں قابلِ ذکر ہے کہ بہت سے دانشوروں، ادیبوں اور صوفیوں کا تبادلہ عرب اور برصغیر کے درمیان ہوا اور سفر وسیلہ بنا۔

گذشتہ ادوار اور دورِ حاضر میں سفر کو بڑے پیمانے پر سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے بھی استعمال کیا گیا ہے۔مختلف خطوں کے حالات و واقعات ،رسم ورواج اور سیاسی نقطہ نظر اور صورتِ حال جاننے کے لیے سفر ایک نہایت اہم وسیلہ ہے۔اس تناظر میں سب سے بڑی مثال امریکہ کی دریافت ہے۔دورانِ سفر افراد سے گفت وشنید سے ان کی سیاسی سوچ اور فکر جاننے کا بھی موقع ملتا ہے۔سفر سے ایک معاشرے کے فرد کو اپنے ملک کے سیاسی نظام اور حکمران سے متعلق آگاہی ہوتی ہے۔دورِقدیم میں ایک ملک دوسرے ملک کو سیاسی پیغامات بھجوانے کے لیے اپنے باشندوں کو بھیجا جاتا تھا اور آج بھی یہ عمل جدید ٹیکنالوجی کے باوجود اسی طرح ملکی اور عالمی سطح پر جاری وساری ہے۔

ربِ کریم نے اس دنیا میں انسان کے لیے بے شمار چیزیں پیدا کی اور ساتھ انسان کو عقل وشعور عطا کیا کہ وہ ان دلچسپ اور حیرت انگیز چیزوں کو پرکھے، جانے اور اپنے استعمال میں لے کے آئے۔رب کریم نے قرآن میں انسان کو"یسیرو فی الارض" کا بھی حکم دیا ہے تاکہ وہ فطرت سے واقفیت حاصل کرے۔اس ضمن میں عربی کا ایک مشہور مقولہ ہے کہ" علم حاصل کرو چاہے تمھیں چین جانا پڑے"۔اس میں سفر کی اہمیت واضح ہے۔

مولوی نورالحسن نیر نے نوراللغات میں لفظ سفر نامہ کے معنی" سفر کے حالات" اور" سرگزشت" کے

پیش کیے ہیں۔ ۱

فرہنگ آصفیہ میں اس کے معنی ہیں: ''سفر نامہ (ع+ف) اسم مذکر: سیاحت نامہ، سفر کی کیفیت، روز نامچۂ سفر، حالاتِ وسرگزشتِ سفر''۔ ۲

عربی کی مشہور لغت المنجد میں ''الرحلۃ'' کے ہیں: ''....قصت لمسافر عماجری لہٗ فی سفرہٖ....''

''مسافر کو دوران سفر پیش آنے والے واقعات وحوادث کا بیان''۔ ۳

مذکورہ لغات میں سفر نامہ کے جو معنی مشترک یا کچھ ملتے جلتے ہیں، وہ ہیں: ''سفر کے حالات و سر گزشت، سفر کی کیفیت اور مسافر کو سفر میں پیش آنے والے واقعات کا بیان۔ جبکہ فرہنگ آصفیہ میں سفر نامہ کے معنی ''روز نامچۂ سفر'' اور ''سیاحت نامہ'' کے ہیں جو ان سے مشابہت نہیں رکھتے ہیں۔ البتہ لغت میں روز نامچہ کے معنی ہیں: ''ہر روز کے حساب لکھنے کی کتاب، ڈائری، کھاتا''۔ ۴

اس اعتبار سے روز نامچۂ سفر کے معنی ہوں گے وہ کتاب یا ڈائری جس میں سفر کے روزانہ کے حالات لکھے جائیں۔ جبکہ سیاحت کے معنی ہیں ''سیر وسفر'' اور نامہ کے معنی ہیں ''کتاب'' اور ''تحریر'' ۵

یوں سیاحت نامہ کے معنی ہوں گے وہ کتاب یا تحریر جس میں سیر وسفر کے حالات بیان کیے جائیں۔ تاہم مذکورہ لغات سے یہ اخذ کیا جا سکتا ہے ''سفر نامہ مسافر یا سیاح کو سفر میں پیش آنے والے واقعات کے بیان کو کہتے ہیں، جو اپنا تحریری وجود بھی رکھتا ہے، اور جسے روز نامچہ یا عام تحریری شکل میں پیش کیا جا سکتا ہے۔''

سفر نامہ کے لیے Travel اور Travelogue کے الفاظ انگریزی لغات میں استعمال کیے جاتے ہیں۔ یہ معنی مذکورہ معنی سے زیادہ وسعت رکھتے ہیں۔ ۶

آکسفورڈ انگلش ڈکشنری میں اس کے معنی ہیں:

"C.Account of Accurences and Observations of a journey into foreign parts."

ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی اپنی تدوین کردہ انگریزی لغت: "The standard English-Urdu Dictionary" کے مطابق Travelogue کے معنی ہیں: سیاحت کی مہم؛ سیاحت کا بیان؛ تقریر متعلق سیاحت؛ داستان سفر''۔ ۷

جبکہ ویبسٹرس انٹرنیشنل ڈکشنری درج ذیل معنی دیتی ہے:

"Trav.el.ogue also travel.og: a talk, lecture, or discourse on travels usu. with illustrations (as aslides or motion pictures.) ۸

سفر نامہ کے درج بالا مفہوم اور ماہیت کے اعتبار سے چار نکات سامنے آئے ہیں:

(۱) مسافر اور سیاح کے حالاتِ سفر کا بیان

(۲) مسافر اور سیاح کے حالات سفر پر مصوری لکچر

(۳) مسافر اور سیاح کے حالات سفر کا تحریری بیان۔

آکسفورڈ انگلش ڈکشنری میں Travelogue کے معنی زیادہ وسعت اور جامعیت رکھتے ہیں:

"Travelogue: An (illustrated) lecture about places and experieces encountered in the course of travel; hence a film, broadcast, book etc...." ۹

ویبسٹرس انٹرنیشنل ڈکشنری میں سفر نامہ سے متعلق جو معنی درج ہیں، وہ اس طرح ہیں:

"Travels: an account narration of one's travels esp in book form..." ۱۰

مذکورہ لغات کے پیش نظر سفر نامہ کی لغوی تعریف اس طرح سامنے آتی ہے: سفر نامہ کسی مسافر یا سیاح کے سفر کے مشاہدات و واقعات اور تجربات کے اس بیان کو کہتے ہیں، جو بالخصوص کتابی شکل میں ہو۔

اس تعریف پر غور کرنے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ کسی مشاہدے یا واقعے کو وقوع یا تجربات کے اثرات لازماً مسافر یا سیاح کے قلب پر اثر انداز ہوتے ہیں، اور ردعمل کے طور پر قلب کے اندر کچھ احساسات اور تاثرات بھی پیدا ہوتے ہیں، جنہیں سفر نامہ نگار ضرور قلم بند کرتا ہے کیونکہ قلبی تاثرات سفر ناموں میں بہت نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ اس طرح سفر نامہ کی جامع تعریف یہ بنتی ہے: مسافر کے سفر کے مشاہدات، واقعات اور تجربات بطور خاص کتابی شکل میں پیش کیے جاتے ہیں، اور جس میں قلبی تاثرات بھی لازما موجود ہوتے ہیں۔

دورِ حاضر میں بہت سے لوگوں نے اس موضوع پر کام کیا ہے اور سفر نامہ کی ماہیت پر بات کی ہے۔ ڈاکٹر قدسیہ قریشی کی کتاب اردو سفر نامے انیسویں صدی میں، میں سفر نامہ یوں بیان ہوا ہے:

...اس طرح سفر نامہ وہ تحریر اور اسلوب بیان ہوا ہے، جس میں انسان یا سیاح اپنے داخلی احساسات، خارجی حالات کے ساتھ جوڑ کر اپنی ذہنی، دلی اور طبعی کیفیت ظاہر کرتا ہے.... ۱۱

ڈاکٹر خالد محمود نے جو تعریف پیش کی ہے وہ کافی حد تک صحیح ہے۔ چنانچہ وہ اپنی کتاب اردو سفر ناموں کا تنقیدی مطالعہ میں لکھتے ہیں:

....سفر نامہ نگار دورانِ سفر یا سفر سے واپسی پر اپنے ذاتی تجربات و مشاہدات اور تاثرات و احساسات کو ترتیب دے کر جو تحریر رقم کرتا ہے، وہ سفر نامہ ہے.... [۱۲]

ڈاکٹر انور سدید کی کتاب اردو ادب میں سفر نامہ میں سفر نامہ کی تعریف یوں ہے:

.... فنی طور پر سفر نامہ وہ بیانیہ ہے، جو سفر نامہ نگار سفر کے دوران یا اختتام سفر پر اپنے مشاہدات، کیفیات اور اکثر اوقات قلبی واردات سے مرتب کرتا ہے..... [۱۳]

مذکورہ لغوی اور اصطلاحی بحث کے پیشِ نظر سفر نامہ کی تعریف یوں کی جا سکتی ہے کہ "سفر نامہ وہ بیانیہ صنف ادب ہے، جس میں سفر نامہ نگار دوران سفر، یا سفر سے واپسی پر اپنے مشاہدات و واقعات، تجربات اور قلبی تاثرات کو تحریر کرتا ہے۔

سفر نامہ کی ماہیت اور اور اس کی تعریف جاننے کے بعد ضرورت اس امر کی اشد ضرورت ہے کہ اس کے بنیادی مباحث کو سمجھا جائے لہٰذا مذکورہ بحث کی روشنی میں سفر نامہ کے لیے جو اہم چیزیں ہیں وہ درج ذیل ہیں:

(الف) مشاہدہ

(ب) قلبی تاثرات

(ج) زبان و اسلوب

(الف) مشاہدہ

سفر نامہ کا پہلا اور بنیادی عنصر مشاہدہ ہے۔ مشاہدہ اپنے اندر واقعات اور تجرات سموئے ہوئے ہوتا ہے۔ مسافر کے گردونواح میں مشاہدے کے لیے مواد بکھرا ہوا ہوتا ہے۔ اب یہ مسافر کی دل چسپی، اندازِ فکر، رویہ اور انتخاب و استدلال پر منحصر ہے کہ وہ کس طرح سے مواد کو تحریر میں لاتا ہے اور قاری کے دل پہ اثر کرتا ہے۔ جتنی مناظر کے ساتھ قربت، رغبت اور محبت ہوگی اتنا ہی سفر نامہ دلچسپ ہوگا۔ مسافر کے مکمل طور پر حواس بیدار ہوں اور توجہ مناظر کی طرف مرکوز ہو۔ دیانت داری سفر نامہ کو دلچسپ بنانے کے لیے ایک اہم چیز ہے اور یہ کسی سفر نامے کی اصل روح ہوتی ہے۔ مشاہدے کے بارے میں ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

....سفر نامہ ایک ایسی صنف ہے، جس میں مشاہدے کی قوت سب سے زیادہ روبہ عمل آتی ہے۔ یہ صنف علم تاریخ اور علم جغرافیہ کے فنی مقاصد کے لیے میکانکی انداز میں کوائف جمع نہیں

کرتی، بلکہ ایک مربوط، دل چسپ اور خوش گوار بیانیہ مرتب کرنے کے لیے ان سب سے فائدہ ضرور اٹھاتی ہے.... ۱۴؎

(ب) قلبی تاثرات

جب مسافر کوئی چیز دیکھتا ہے تو اکثر اس کے دل پر اثر چھوڑ جاتی ہے اگر چہ کہ وہ اثرات مثبت ہو یا منفی ،مسافر کو وہ چیز پسند آئے یا نہیں البتہ اس کا قلب ضرور متاثر ہوتا ہے۔اس طرح سفر نامہ نگار اپنے مشاہدات اور پیش آنے والے واقعات میں قلبی رنگ شامل کر کے انہیں تحریر کر دے گا۔ چنانچہ قلبی واردات و تاثرات سفر نامہ کا اہم جزو ہے ۔قدیم دور کی نسبت آج کے سیاح اپنے سفر ناموں میں ظاہری منظر کشی کے ساتھ ساتھ قلبی و اندرونی واردات کو بھی رقم کرتا ہے۔اس سے سفر نامہ کو حرارت اور تازگی و زندگی ملتی ہے۔

(ج) زبان واسلوب

ادب کی مختلف اصناف کا زبان و اسلوب بھی مختلف ہوتا ہے ۔اس لیے سفر نامہ نگار کے لیے یہ ضروری ہے کہ الفاظ کے انتخاب و ترتیب ،تراکیب اور جملوں کی ساخت موزوں اور جامع ہو۔مافی الضمیر کی ادائیگی کے لیے وضاحت ہو ،قطعیت اور اختصار کا استعمال ہو۔تحریر میں فصاحت و بلاغت خوب نبھائے گئے ہوں۔تشبیہ و استعارہ کو با خوبی نبھایا گیا ہو۔تازگی، شگفتگی اور تاثیر کو ملحوظِ خاطر رکھا جائے ۔تحریر میں ابہام ،الجھاؤ ،پیچیدگی اور غیر ضروری طوالت سے احتیاط برتی جائے ۔سفر نامہ صداقت سے لکھا گیا ہو۔ ۔علاوہ ازیں منظر کشی سفر نامہ کی جان ہے ۔یہ جان دار، سچی اور حقیقی ہونی چاہیے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ اس میں تخیل سے اچھے سے نمٹا گیا ہو۔ڈاکٹر مختارالدین احمد مکمل اور جاندار منظر کشی کو سفر نامے کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔وہ یوں رقم طراز ہوتے ہیں:

> سفر نامے میں دو خوبیاں ضرور ہونی چاہئیں۔ایک تو یہ کہ وہ قاری کے دل میں سیاحت کا شوق پیدا کر دے،اور اگر پہلے سے موجود ہو تو سفر نامہ آتشِ شوق کو تیز کر دے۔دوسری یہ کہ منظر کشی ایسی مکمل اور جان دار ہو کہ ہر منظر سامنے آجائے.... ۱۵؎

ڈاکٹر قدسیہ قریشی بھی اسی چیز کو سراہتی ہے اور لکھتی ہے:

> سفر نامے کی بنیادی خصوصیات یہ ہیں کہ اس کی نثر دل کش ہو،مشاہدہ گہرا ہو، مصنف جس لطف سے سر شار ہے،قاری کو اس میں برابر کا شریک کر سکے ،مصنف کے ساتھ قاری بھی سیر کرنے لگے.... ۱۶؎

سفرنامے کی اقسام

اردو سفر ناموں کی درجہ بندی کی مطابق درج ذیل قسمیں سامنے آتی ہیں:

(الف) عام سفر نامے

(ب) مذہبی سفر نامے

عام سفر نامے سے مراد ملکی اور غیر ملکی سیاحت کی روداد پر مشتمل وہ سفر نامے ہیں، جو حج، عمرہ اور ممالک اسلامیہ کے سفر ناموں سے الگ ہیں۔ مذہبی سفر ناموں کو بھی موضوعاتی اعتبار سے تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

(الف) حج کے سفر نامے

(ب) عمرے کے سفر نامے

(ج) بلاد اسلامیہ کے سفر نامے

حج اور عمرہ دونوں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

سفرِ حج مکہ کا سفر ہوتا ہے۔ بیت اللہ کے علاوہ عرفات، منیٰ اور مزدلفہ میں بھی حاضری دیتے ہیں۔ اور عبودیت کے اہم اجزاء نبھاتے ہیں۔ عمرہ بھی سفرِ مکہ ہے لیکن اس میں مکہ کے علاوہ کہیں اور جانا ضروری نہیں ہوتا۔ حج کے ایام مخصوص ہوتے ہیں۔ عمرہ میں ایسی کوئی قید نہیں۔ حج کے معمولات و مقامات زیادہ ہوتے ہیں۔ مکانی اعتبار سے یکسانیت کے باوجود حج کے سفر ناموں کی کمیت و کیفیت میں زیادہ اضافہ ہوتا ہے۔ سفری سہولیات کے سبب عمرہ الگ سے کرنے کا رجحان پیدا ہو گیا ہے اور عمرہ کے سفر نامے لکھے جانے لگے ہیں۔ عمرہ کے سفر نامہ کو الگ سے مقام دینا غیر مناسب نہیں ہے۔

حج کا سفر نامہ۔۔۔تعریف اور خصوصیات

مذکورہ سفر نامہ کی لغوی اور اصطلاحی بحث کی روشنی میں حج کے سفر نامے کی تعریف بھی پیش کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ یہ بات طے پائی ہے کہ حج نامہ، سفر نامہ کی ہی ایک قسم ہے اور اس میں سفر نامہ کی تمام بنیادی خصوصیات ہونا ضروری ہے۔ البتہ دونوں ظاہری اور باطنی اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اس لیے حج نامہ کی تعریف الگ سے کرنی چاہیے۔ چنانچہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ حج نامہ وہ بیانیہ صنف ادب ہے جس میں حج نامہ نگار دوران سفرِ حج یا سفر سے واپسی پر اپنے مشاہدات، واقعات، تجربات اور قلبی تاثرات کو تحریر کرتا ہے۔

سفرِ حج اپنے مالک کے ہاں سرنگوں ہونے کا سفر ہے۔ یہ بندے کا اپنے رب کے سامنے اظہارِ تشکر کا ایک ذریعہ ہے۔ یہ پاکیزگی اور روحانیت کا سفر ہے۔ پاکیزہ خیالات واعمال اس کے بدن اور روح کا حصہ

بننے شروع ہو جاتے ہیں۔ بندے کے دل میں اپنے رب کے لیے محبت پھوٹتی ہے۔گر یہ و زاری کرتا ہے۔ اپنے گناہوں کی معافی مانگتا ہے اورسفید لباس کو جزو بدن کرتے ہوئے اپنی بندگی کا کھلم کھلا اعلان کرتا ہے۔ بغیر کسی ستائش و صلے کے وہ بارگاہِ رب کریم میں حاضر ہوتا ہے۔چنانچہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ عازمِ حج نہ تو سیاح ہوتا ہے نہ مسافر بلکہ اس کی حیثیت ایک زائر کی سی ہوتی ہے۔

حج نامہ سفر کرنے والے کے ذاتی مشاہدات و واقعات کی ایک داستان ہے۔دورانِ مقاماتِ حجاز جو اس کے دل و روح پر گذرتی ہے وہ سب تحریر کرتا ہے۔اور ایک ایک راستہ بڑے شوق و ولولے کے ساتھ طے کرتا چلا جاتا ہے۔ہر ایک چیز کو حسرت اور تجسس سے دیکھتا ہے۔جہاں جہاں آپﷺ رہے، چلے وہ جاننے اور ان مقامات کو چومنے کی کوشش کرتا ہے۔اس کے باوجود کے سب اپنی اپنی روداد پیش کرتے ہیں سب میں ایک وا ضح فرق ہوتا ہے۔یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ہر حج نامہ دوسرے حج نامہ سے مختلف اور منفرد ہوتا ہے۔ہر حج نامہ نگار کی اپنی اپنی قلبی واردات اور روداد ہوتی ہے۔چنانچہ شوکت علی شاہ کہتے ہیں:

> مقامات ایک جیسے کیوں نہ ہوں ،رسومات بھی ایک ہوں ،دعاؤں میں یک رنگی ہو،پھر بھی انہیں محسوس کرتے ہوئے وارداتِ قلب مختلف ہوسکتی ہے،ان کی Intensity میں واضح فرق ہوسکتا ہے ،پیرائے اظہار بھی مختلف ہوسکتا ہے۔غالبا ایسی باتیں انفرادیت کے زمرے میں آتی ہیں۔۱۷

اسی تناظر میں محمد ذاکر علی خان لکھتے ہیں:

> ....یہ موضوع اس قدر وسیع اور دل کش ہے کہ ارادہ کرتے ہی خیالات کی فراوانی سے قلم میں ازخود روانی پیدا ہو جاتے ہے،اور چہل قدمی کی نیت سے چلنے والا قدم ہزاروں منزلیں بغیر ڈوب لیے طے کر جاتا ہے۔ ہر منزل کے بعد ایک عالی شاں شان و حسیں منزل نظر آنے لگتی ہے،اس کا یہ سفر لا متناہی سا ہو جاتا ہے۔اس لیے سب کچھ لکھنے کے بعد بھی محسوس یہی ہوتا ہے کہ ابھی تو کچھ بھی نہیں لکھا۔چنانچہ باوجودیکہ ہر ہردور کے جید اہل قلم ،اکابر عقیدت کیش،مشاہیر،شعراء،صدہا سال سے ہر ہر طرح سے،ہر ہر زبان میں اپنی جزبات کی ترجمانی کرتے چلے آرہے ہیں ،لیکن موضوع کی تشنگی ہنوز برقرار ہے۔دراصل یہ مقامات معلی نوازشات واکرام کے دریا نہیں،سمندر ہیں،جنہیں کسی کوزے میں بند نہیں کیا جا سکتا۔۱۸

سفر نامہ کی طرح حج نامہ کے لیے وہی چیزیں ضروری ہیں جو سفر نامہ کے لیے ہیں کیونکہ حج نامہ سفر نامہ کی ہی ایک قسم ہے۔چنانچہ حج نامہ کے بنیادی عناصر درج ذیل ہیں:

(الف) مشاہدہ

حج نامہ میں جو مشاہدہ کی اہمیت وضرورت ہے اس پہ گذشتہ اوراق میں گفتگو ہو چکی ہے۔ چنانچہ اس کی حج نامہ میں اتنی ہی اہمیت ہی کہ جتنی سفر نامہ میں۔ سفر نامہ کے برعکس حج نامہ میں کچھ ایسا مناظر درکار ہوتے ہیں جن کی منظر کشی لازمی ہے۔ جس کے بغیر حج نامہ ادھورا اور ناقص ہوتا ہے۔ یوم عرفات کی روداد کے بغیر سفر نامہ مکمل نہیں ہوتا۔ سفرِ مدینہ اگرچہ حج کا حصہ نہیں لیکن وہاں جانے کا احادیث میں بار بار کہا گیا ہے۔ اس لیے ہر حج نامے میں مدینہ کی روداد بھی تحریر کی جاتی ہے۔ دیانت داری مشاہدے میں نمایاں حیثیت رکھتی ہے بلکہ حج نامہ میں اس کی اہمیت وضرورت اور بڑھ جاتی ہے۔ تحریر میں متوازن نقطہ نظر ہو اور تعصب سے پاک ہو۔

(ب) قلبی اثرات

حج نامہ ایک داخلی عمل اور روحانی سفر ہے۔ مسافر جو جو مناظر دیکھتا ہے اس کہ دل پہ ایک گہرا اثر چھوڑتے جاتے ہیں۔ کئی مقامات پر آنسو بہاتا ہے تو کئی مقامات پر خوشی کا اظہار کرتا ہے۔ کہیں پہ اس کی رحمت کے گیت گاتا ہے تو کہیں پہ توبہ استغفار کرتا ہے۔ اس کی قلبی کیفیت تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ چنانچہ یہ ثابت ہوا کہ داخلی کیفیات کا اظہار حج نامہ میں ایک اہم مقام رکھتا ہے۔ ورنہ حج نامہ ناقص اور ادھورا جانا جائے گا۔

(ج) زبان واسلوب

گذشتہ بحث سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ فنی اعتبار سے حج نامہ سفر نامہ سے زیادہ مختلف نہیں ہے۔ جس زبان واسلوب کی ضرورت سفر نامہ میں ہوتی ہے وہی حج نامہ کی بھی ضرورت ہے۔ لیکن حج نامہ میں، قلبی کیفیات بکثرت پائی جاتی ہیں۔ لہذا اس، میں ایسے الفاظ اور اسلوب کی ضرورت ہوتی ہے جو صحیح معنوں میں کیفیات کی ترجمانی کرے۔ علاوہ ازیں حج نامہ کی تحریر میں احترام و ادب زیادہ پایا جاتا ہے جس کے لیے موزوں الفاظ کا استعمال عین ضرورت ہے۔

اردو حج ناموں کا پسِ منظر اور ابتدائی دور

جب اردو میں حج کے سفر ناموں کا آغاز انیسویں صدی کے وسط میں ہوا۔ اس دور میں اردو حج نامہ نگاروں کے سامنے فارسی اور عربی کے حج ناموں کی خاصی قدیم اور مستحکم روایت موجود تھی، جن کو اردو حج ناموں کی پسِ منظر کی حیثیت حاصل ہے، ذیل کی سطور میں ان کا مختصر تعارف پیش ہے۔

سفر نامۂ حکیم ناصر خسرو (سفر: ۴۳۷ھ۔۴۴۴ھ/۱۰۴۶ء۔۱۰۵۲ء):

فارسی زبان کے سفر ناموں میں حکیم ناصر خسرو کا سفر نامہ بہت قدیم ہے۔ جس میں مشاہدات کو بڑی تفصیل و جامعیت، توازن و استدلال اور بہت سادگی کے ساتھ رقم کیا ہے۔ اس سفر نامے میں ایک ہزار سال

قبل کے اسلام کے عروج و ترقی کی جھلک ملتی ہے اور یوں یہ سفر نامہ تاریخی نقطہ نظر سے بھی بہت اہم ہے۔ اسلام کے روشن دور کے قیمتی آثار اس سفر نامے میں محفوظ ہیں۔ سفر حجاز کو ناصر نے بخوبی اور عقیدت کے ساتھ قلم بند کیا ہے۔ جیسا کہ وہ لکھتے ہیں:

> نویں ذی الحجہ ۴۴۲ھ کو (توفیق الٰہی سے) میں نے چھوتھا حج کیا، اور غروب آفتاب کے بعد حجاج اور خطیب۔۔۔ایک فرسنگ کے فاصلہ پر مشعر الحرام میں آ کر ٹھہرے، جس کو مزدلفہ کہتے ہیں۔ اس مقام پر ایک خوب صورت عمارت مقصورہ کی طرح بنائی گئی ہے، جہاں حاجی نماز پڑھتے ہیں، اور منیٰ میں جو کنکریاں پھینکتے ہیں، وہ اسی جگہ سے اٹھاتے ہیں۔ ۱۹

رحلتہ ابن جبیر (سفر: ۵۷۸ھ۔۵۸۱ھ ۱۱۸۳ء۔۱۱۸۵ء)

حج کی نیت سے ابنِ بطوطہ نے اپنے سفر کا آغاز کیا۔ اس بات کے باوجود اس زمانے میں سفر مشکلات سے بھرا پڑا تھا لیکن پھر بھی ابن بطوطہ نے پختہ عزم کے ساتھ اسے سر کیا۔ ابن بطوطہ نے پچیس سال سیاحت میں گذارے اور یوں ممالک عالم کی سیاحت کے تفصیلی حالات اپنے سفر نامے میں رقم کیے۔ مشتملات کی اہمیت کی بنا پر یہ سفر نامہ انتہائی مقبول ہوا اور دنیا کی بہت سی زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوا۔ سفر نامے میں جغرافیائی، سماجی، تمدنی اور تہذیبی، ثقافتی، سیاسی اور معاشی تفصیلات کو پڑھنے پر ابن بطوطہ کی تحریر میں وضاحت، صفائی اور بے ساختگی نظر آتی ہے۔ جو اس سفر نامے کی مقبولیت کا باعث ہے۔ ابن بطوطہ نے چار حج کیے۔ علاوہ ازیں مشرقی افریقہ، عرب، مصر، شام، ایران، ایشیائے کوچک، ہسپانیہ، ہندوستان، مالدیپ، سیلون، سماترا اور چین وغیرہ کو بھی اپنے سفر کا حصہ بنایا۔ کعبہ، مکہ، مسجد نبوی ﷺ اور مدینہ منورہ سے متعلق حالات، واقعات اور مشاہدات کو بھی تحریر کیا۔ حجر اسود، زم زم، کتب خانہ حرم، مسجدِ حرام کے دروازوں، صفا و مروہ، قبرستانِ مکہ، مزار حضرت خدیجہ وغیرہ کا ذکر بھی سفر نامے میں ملتا ہے۔ مثال کے طور پر ابن بطوطہ لکھتے ہیں:

> صفا اور مروہ کے مابین ایک نالہ ہے۔ یہاں ایک بہت بڑا بازار ہے۔ اس میں غلہ، گوشت، کھجور، گھی وغیرہ اور پھل پھلاری بکتے ہیں۔ جو مابین صفا اور مروہ سعی کرتے ہیں، اس بازار میں لوگوں کے اژدہام کی وجہ سے، جو دکانوں پر ہوتا ہے، پھنس جاتے ہیں۔ مکہ میں ماسوا اس بازار کے اور کوئی باقاعدہ بازار نہیں لگتا۔ ہاں باب بنی شیبہ کے پاس بزازوں اور عطاروں کی دکانیں ضرور لگتی ہیں۔ ۲۰

جذب القلوب الی دیار المحبوب (۱۰۰۱ء/ ۹۳۔۱۵۹۲ء):

شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے فارسی زبان میں سفر نامۂ حج تحریر کیا۔ اسے سفر نامہ کے معروف اسلوب میں تحریر نہیں کیا گیا۔ یہ سفر نامہ کی بجائے تاریخِ مدینہ کی کتاب لگتا ہے۔ مگر کچھ جگھوں پر سفر نامہ کے اسلوب کی

جھلک نظر آتی ہے۔جس سے اسے سفر نامہ کہا جاسکتا ہے۔اس میں مدینہ کے فضائل ومناقب،حاضریٔ مدینہ، حاضریٔ روضہ،مسجد نبوی ﷺ اور قیامِ مدینہ کے مختلف آداب اور متعلقہ ادعیہ،اسلام،احادیث،آیات قرآنی اور مسائل کا تذکرہ ہے۔[۲۱]

برہِ آورد (سفر:۱۲۵۴ھ/۱۸۳۹ء):

نواب محمد مصطفیٰ خان شیفتہ کا حج نامہ فارسی اورعربی کے قدیم موجود ہندوستانی حج ناموں کے تسلسل کی آخری کڑی نظر آتا ہے۔شیفتہ عہد غالب کے مشہور شاعر اور تذکرہ نگار تھے۔ان کی مشہور تالیف تذکرہ ء گلشن بے خار ہے۔

شیفتہ نے سفرِ حجاز بذریعہ بادبانی جہاز دو سال اور چھ دن میں پورا کیا۔ان کا بادبانی جہاز زیرِ آب چٹان سے ٹکرا کے ٹوٹ گیا تھا۔ بڑی دقت اور مشکلات سے حجاز پہنچے۔ان کے حج نامہ میں اس عہد کی سفر کی مشکلات کا ذکر واضح نظر آتا ہے۔

عقیدت مندی،داخلی جذبات،ادبی حسن،تذکرہ اور سوانح نگاری ان کے حج نامہ کی نمایاں خصوصیات ہیں جو اس حج نامہ کی خوبصورتی کا باعث ہیں۔ان کی عقیدت مندی کا اندازہ درج ذیل اقتباس سے لگایا جاسکتا ہے:

> ... خدا کا شکر ہے کہ مجھ ناچیز نے رات منیٰ میں گذاری اور ۹ تاریخ کو بعد نکلنے والے آفتاب کے بقصدِ عرفات اٹھا۔اگر چہ ترویہ کے دن ظہر کی نماز مجھ کو اس مقام پر میسر نہ ہوئی،لیکن بحکم مالا یدرك كله لا يترك كله "جو کچھ نصیب ہوا غنیمت ہے۔ بالجملہ مسجد نمرہ کے متصل اترا ،اور بعد جمع بین الصلوتین ایک پہر دن رہے عرفات میں جا کر ٹھہرا۔خداوند تعالی کی رحمت اور مہربانی کی بارش جو اس مبارک مقام پر ہوتی ہے،دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے،نہ سننے سے ،کیوں کہ دیکھنے اور سننے میں بہت فرق ہے۔ جو شخص کہ یہاں آکر کھڑا ہو وہی قدر جان سکتا ہے۔اے خدا! کہ تو بلا شمار وحساب بخشش کرنے والا ہے،میں اس نعمت کی دوبارہ آرزو رکھتا ہوں،اور اس قند کو مکرر چاہتا ہوں.... [۲۲]

اردو کے اولین غیر مطبوعہ حج نامے:

مختلف زبانوں کا مطالعہ کرنے سے یہ بات عیاں ہوتی ہے اس زمانے میں فارسی کا دور دورہ تھا، کے وسط میں بولے جانی والی زبانوں کے بغور مطالعہ کرنے سے یہ عیاں ہوتا ہے کہ اس زمانے میں فارسی کا دور دورہ تھا۔علمی اور ادبی میدان میں اسے دوسری تمام زبانوں پر فوقیت حاصل تھی،لیکن بتدریج اس کی اہمیت کم ہونے

لگی اور اردو نے سر اٹھایا اور اپنی راہیں ہموار کرنے لگی۔شعری اور نثری اصناف پہ تیزی سے کام شروع ہونے لگا۔ابراہیم ذوق،مرزا اسداللہ خاں غالب،مومن خاں مومن،شیفتہ اور سر سید احمد خاں جیسے مشہور شاعر اور ادیب اردو کے فروغ اور استحکام کے لیے ہمہ تن مصروف تھے۔جہاں ادب کی دوسری اصناف پہ اردو کے گہرے اثرات مرتب ہوئے وہاں اردو حج ناموں کے لیے بھی استعمال ہونے لگی۔شیفتہ کے فارسی حج نامہ رہ آورد کے بعد اردو میں حج نامہ دیکھنے کو ملا۔اب تک کی معلومات کے مطابق یہ حج نامہ دید مغرب المعروف به ہدایت المسافرین ہے جو ایک صوفی بزرگ اور صاحب دیوان شاعر سید شاہ عطا حسین فانی گیاوی نے لکھا ہے۔آپ کا شمار قدیم نثر نگاروں میں ہوتا ہے۔سوانح نگار بھی ہے۔اردو، فارسی اور عربی دونوں میں شاعری کی۔ان کا حج نامہ ابھی تک شائع نہیں ہوا۔دوسرا غیر مطبوعہ حج نامہ یاداشت تاریخ و قائع حج نواب سکندر بیگم نے تحریر کیا ہے۔یہ بھی اردو حج نامہ ہے۔ان غیر مطبوعہ حج ناموں کے بعد اردو میں مطبوعہ حج ناموں کا سلسلہ باقاعدہ شروع ہوا۔

یاداشت تاریخ و قائع حج (۱۸۶۴ء):

یہ بات بڑی خصوصیت کی حامل ہے کہ اردو کا دوسرا حج نامہ ایک خاتون،نواب سکندر بیگم رئیسہ ءبھوپال نے تحریر کیا ہے۔۱۸۶۴ء میں سفر کیا گیا۔اس کی اشاعت نہ ہو سکی لیکن قلمی نسخے کے طور پر رضا لائبریری رام پور میں موجود ہے۔اسے فارن سیکرٹری شملہ مسٹر رورانڈ کی اہلیہ اور خود مسٹر رورانڈ کی فرمائش پر تحریر کیا گیا تا کہ وہ وہاں کے رہنے والے لوگوں کے احوال اور رہن سہن سے واقف ہو سکے۔اس کا انگریزی ترجمہ ہوا اور برطانیہ میں انگریزی میں شائع بھی کیا گیا اور اسے بعد میں ملکہ وکٹوریا کی خدمت میں پیش کیا گیا۔اس حج نامے میں مکہ وحجاز کی سماجی،تہذیبی،جغرافیائی اور سیاسی سے آگاہی ملتی ہے۔اس میں دوسرے حج ناموں کی نسبت عورتوں میں طلاق کی کثرت کا ذکر زیادہ کیا گیا ہے۔اس میں حج کے احوال کا ذکر بہت کم ملتا ہے۔

مزید یہ کہ اس حج نامے کے اقتباسات میں عقیدت جھلکتی ہے۔اپنے مشتملات اور اسلوب بیان کے اعتبار سے اہم نہیں۔سماجی اور تہذیبی لحاظ سے اہمیت کا حامل ہے۔تاریخی نقطہءنظر سے بھی اہم ہے۔اس حج نامے کی زبان و اسلوب کو جاننے کے لیے درج ذیل اقتباس غور طلب ہے:

> .... مکہ شریف میں ایک قلعہ ہے،اس پر توپیں چڑھی ہیں،مگر توپیں میلی، اور سامان جنگ خراب ہے۔ترک لوگ بہت میلے کپڑے رکھتے ہیں،اور موٹا کھانا کھاتے ہیں،میں نہیں جانتی کہ جس وقت وردی پہنتے ہیں اور قواعد کرتے ہیں،اس وقت خوب ڈریس معلوم ہوتے ہیں یا نہیں،حالاں کہ اپنے گھروں میں بڑے میلے کچیلے کپڑوں سے رہتے ہیں۔اونٹ بہ کثرت پائے جاتے ہیں۔گائے،بیل اور بکری،بھیڑ شاید اس قدر ہوں گے،جس قدر ہندوستان میں

ہیں،مگر دنبے زیادہ ہیں، بھینس نہیں ہیں ۔گھوڑے بہت عمدہ اور قیمتی ہیں،مگر ساز وسامان ان کے ویسے نہیں ہیں اور نہ وہاں کے لوگ اچھے سوار ہیں مگر سنا ہے کہ ترک اچھا سوار ہوتے ہیں۔ ۲۳

چند اہم ابتدائی حج ناموں کا فنی و ادبی مطالعہ

ماہ عرب المعروف بہ کعبہ نما (۱۲۸۸ھ/۱۸۷۱ء):

حج نامہ ماہ عرب المعروف بہ کعبہ نما" جو حاجی منصب علی خان نے لکھا ہے۔آپ میرٹھ شہر کے رئیس اور سرکاری ملازم تھے۔۱۸۷۱ء میں مطبع محب کشور ہند،میرٹھ سے طبع ہو کر سامنے آیا۔ ان کا یہ حج نامہ اردو کے ابتدائی حج ناموں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔اس وقت سفر نامہ نگاری کا آغاز ہی تھا اور لوگ اس کے فن تھے اتنے آشنا نہیں تھے۔باوجودیکہ حاجی منصب علی خان اسے باخوبی نبھایا۔فنی خوبیوں کے ساتھ ساتھ ادبی خوبیوں اس سفر نامے کی اہمیت میں اضافے کا باعث بنتی ہیں۔سفر کے متعلق ہدایات دینے میں توازن سے کام لیا گیا ہے جو کہ اس عہد کے سفر ناموں کے مترادف ہے۔

یہ سفر نامہ محسوسات اور قلبی کیفیات سے لبریز ہے۔مشاہدات کو باخوبی تحریر کیا گیا ہے بلکہ قلبی روح بھی بخشی ہے۔ان کا قلب کا اخلاص و یقین اور جذبات سے خالی نہ تھا۔اپنے سفر نامے میں وہ ایک جگہ تحریر کرتے ہیں:

> ....احرام کے باندھتے ہی گویا اخلاص و یقین کے دروازے کھل گئے، دلوں کا اور ہی عالم ہو گیا ،عجیب کیفیت طاری و ساری ہوئی،بجز ذکرِ الٰہی اور لبیک۔لبیک کے علاوہ نہ کوئی بات زبان تک آتی تھی ،نہ دل کو بھاتی تھی۔دینا اور مافیہا فراموش ، یاد خدا میں مدہوش،شوق طواف کا جوش وخروش.... ۲۴

اس سفر نامے میں تشبیہات اور اشعار کا استعمال بھی ملتا ہے اور کہیں کہیں تک بندی بھی۔اس سفر نامے میں میدانِ عرفات کی روداد بڑے دلکش انداز میں تحریر کی گئی ہے۔مصنف ایک میدان میں جمع لوگوں کو دیکھ کر ان کا دل عبرت و حیرت سے بھر جاتا ہے اور ان کے نزدیک اس جیسی اسلامی مساوات کی مثال کہیں نہیں ملتی ۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

> ....یہ مقام عجیب عبرت گاہ اور مظہر بدائع قدرت الٰہ ہے۔ہفت قلیم کے آدمی،جن کے لباس، قطع، بول چال،باہم بدرجہ اتم مختلف ہیں،یہاں آ کر برابر ہم ازبان اور ہم پوشاک ہو جاتے ہیں۔صرف احرام کے سفید کپڑے،ایک تہہ بند ناف سے نیچے بندھا ہوا،ایک ردا کاندھے پر

پڑی ہوئی، سر برہنہ عرفات پر لبیک لبیک پکارتے ہیں....۲۵؎

اس سفر نامے میں ظرافت کا پہلو بھی ملتا ہے جو مصنف کے ذوقِ مزاح کو ظاہر کرتی ہے۔ان کی تحریر پڑھ کر قاری مسکرانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔درج ذیل اقتباس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

جہاز پر ایک کپتان، تین انجینئر، تین معلم، بیس پچیس خلاصی، بارہ حبشی، کوئلے والے، (کیا رنگ میں رنگ ملا ہے) رہتے ہیں....۲۶؎

املا نگاری کا طرز قدیم اور متروک ہے۔سرسید کے ہم عصر ہوتے ہوئے بھی ان سے استفادہ نہیں ہوئے۔یائے معروف اور مجہول کو یکساں تحریر کرتے ہیں۔ان کے استعمال میں کوئی فرق نہیں کرتے۔درج ذیل پیراگراف سے اس بات کو باخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

میرے مکالمات انگریزی سی صاحب بہادر محفوظ ہو کر فرمانی گی کہ ہم تمہاری مددگار رہیں گے۔ ۲۷؎

مکہ و مدینہ کے افراد کے مزاج وطبیعت

مدنی خوبصورت، نیک سیرت، خوش خلق، نرم خو و بردبار، پسندیدہ اطوار، صابر قانع، خوش پوشاک، نفیس مزاج ہوتے ہیں۔جب طفل نوازد چالیس روز کا ہو جاتا ہے، روضہء اقدس میں لے جاتے ہیں۔اس عمل سے انسان ملکوتی صفات، حمیدہ خصال ہو جاتا ہے۔۲۸؎

مسجد نبوی میں روضہء اطہر کے سامنے جذبات کا منظوم اظہار بھی مصنف نے پیش کیا گیا۔وہ اپنے جذبات کا اس طرح اظہار کرتے ہیں:

دل منصب شیدا کا محبت سے بھرا ہے
دم نکلے گا نکلے گا نہ ارمانِ مدینہ
احسان ہے اجازت نظارہ دور سے
جل جاتے اور بڑھتے اگر برق نور سے
تم منہ دکھاؤ یا نہ دکھاؤ گلہ نہیں
کب ہوش ہے تصور ذوق حضور سے۲۹؎

قوتِ اظہار، وضاحت، سادگی، سہل پسندی، روانی اور توازن و جامعیت، اور بے ساختگی اس سفر نامے کی نمایاں خوبیاں ہیں۔محسوسات و خیالات کو بہت اچھے سے نبھایا گیا ہے۔تک بندی اور مشکل پسندی بھی بہت

پڑی ہوئی، سر برہنہ عرفات پر لبیک لبیک پکارتے ہیں....۲۵

اس سفر نامے میں ظرافت کا پہلو بھی ملتا ہے جو مصنف کے ذوقِ مزاح کو ظاہر کرتی ہے۔ان کی تحریر پڑھ کر قاری مسکرانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔درج ذیل اقتباس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

جہاز پر ایک کپتان، تین انجینئر، تین معلم، بیس پچیس خلاصی، بارہ حبشی، کوئلے والے، (کیا رنگ میں رنگ ملا ہے) رہتے ہیں....۲۶

املا نگاری کا طرز قدیم اور متروک ہے۔سرسید کے ہم عصر ہوتے ہوئے بھی ان سے استفادہ نہیں ہوئے۔یائے معروف اور مجہول کو یکساں تحریر کرتے ہیں۔ان کے استعمال میں کوئی فرق نہیں کرتے۔درج ذیل پیراگراف سے اس بات کو باخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

میرے مکالمات انگریزی سی صاحب بہادر محفوظ ہو کر فرمانی گی کہ ہم تمہاری مددگار رہیں گے۔ ۲۷

مکہ و مدینہ کے افراد کے مزاج وطبیعت

مدنی خوبصورت، نیک سیرت، خوش خلق، نرم خو و بردبار، پسندیدہ اطوار، صابر قانع، خوش پوشاک، نفیس مزاج ہوتے ہیں۔جب طفل نوزائد چالیس روز کا ہو جاتا ہے، روضہ اقدس میں لے جاتے ہیں۔اس عمل سے انسان ملکوتی صفات، حمیدہ خصال ہو جاتا ہے۔۲۸

مسجد نبوی میں روضہ ءاطہر کے سامنے جذبات کا منظوم اظہار بھی مصنف نے پیش کیا گیا۔وہ اپنے جذبات کا اس طرح اظہار کرتے ہیں:

دل منصب شیدا کا محبت سے بھرا ہے
دم نکلے گا نکلے گا نہ ارمانِ مدینہ
احسان ہے اجازت نظارہ دور سے
جل جاتے اور بڑھتے اگر برق نور سے
تم منہ دکھاؤ یا نہ دکھاؤ گلہ نہیں
کب ہوش ہے تصور ذوق حضور سے ۲۹

قوتِ اظہار، وضاحت، سادگی، سہل پسندی، روانی اور توازن و جامعیت، اور بے ساختگی اس سفر نامے کی نمایاں خوبیاں ہیں۔محسوسات و خیالات کو بہت اچھے سے نبھایا گیا ہے۔تک بندی اور مشکل پسندی بھی بہت

نمایاں ہے جو مصنف کی زبان کے استعمال پر بھر پور قدرت کو ظاہر کرتے ہیں۔مجموعی طور یہ سفر نامہ دلچسپ ہے اور حج ناموں ایک نمایاں مقام رکھتا ہے۔

سراج الحرمین (۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳ء):

تجمل حسین۔۱۲۹۰ھ/ ۱۸۷۳ء میں شائع۔حج اور سفرِ حج کی تفصیلی رہ نمائی۔حج اور زیارات مکہ و مدینہ کے دوران پڑھی جانے والی دعائیں۔برمحل احادیث کا استعمال۔سفر نامہ گائیڈ بک کی خصوصیات بھی رکھتا ہے ۔جذبات وعقیدت کی کثرت موجود ہے۔مصنف کا قلب خدا اور رسول ﷺ کی محبت میں ڈوبا ہوا ہے وہ اس کا اظہار کئی ایک جگہوں پر اپنے سفر نامے میں کرتے ہیں۔جذبات و احساسات کی نوعیت کے حوالے سے تجمل حسین حاجیوں کو ہدایت کرتے ہیں:

> .....جب عرفات کی حد پر پہنچے خوش ہو اور شکر کرے کہ جس مراد کے واسطے اپنا گھر بار،وطن چھوڑ کر سفر دور دراز اختیار کیا تھا وہ مراد پوری ہوئی ۔جس وقت نگاہ جبلِ رحمت پر پڑے دعا مانگے،اور تسبیح اور تہلیل و تحمید و استغفار و تکبیر پڑھے،اور عرفات پر وسوائے وادیء عرنہ کے،جہاں جگہ پاوے ٹھہرے،مگر جبلِ رحمت کے پاس بڑے بڑے سیاہ پتھروں کے فرش پر ٹھہرنا بہتر ہے،کہ وہ موقف حضرت سرورعالم کا ہے۔....۳۰

اس سفر نامے میں عرب کی منظر کشی بھی کئے گئی ہے جس سے،عرب کی جغرافیائی اور تمدنی صورتِ حال کا پتہ چلتا ہے۔عرب کی صحرائی زندگی اور سفر کی دشواریاں سامنے آتی ہیں ۔مصنف ایک جگہ سفر نامے میں لکھتا ہے:

> مکہ معظمہ سے مدینہ طیبہ شمال کی طرف تخمیناً دوسو پچاس کوس سے زیادہ ہے۔راہ میں کوئی شہر نہیں ملتا اور سوائے درخت کے ببول کے نہ کوئی درخت سایہ دار ہے اور نہ پھل دار،البتہ رابق اور صفرا وادی میں مثل قصبات کے آبادی ہے اور بعض بعض قسم کی زراعت ہوتی ہے اور کھجور کے باغات بھی ہیں۔سوا کہیں کہیں کوئی قطعہ مزروعہ زمین کا نظر آتا ہے،ورنہ بجز کوہستان اور کف دست میدان کے کچھ نہیں دکھائی دیتا.....سفر کرنے کا یہ دستور ہے کہ کئی ہزار آدمی اکٹھے ہو کر کرایہ کے اونٹوں پر جایا کرتے ہیں اور تمازت آفتاب کے سبب رات کو زیادہ تر چلتے ہیں.....جس جگہ کوئی کنواں یا شیریں پانی چشمہ ہوتا ہے،وہیں قیام کرتے ہیں،چنانچہ منزل کا نام بھی کنویں کے نام سے شروع ہوتا ہے۔بدوی عرب جو جا بجا پہاڑوں میں بود و باش رکھتے ہیں،وہ قافلے کے پہنچنے کی خبر سن کر لکڑی،پانی،گوشت،انڈے،روغن زرداور اناج اور ترکاری،تربوز،ککڑی وغیرہ بیچنے کو اکثر مقامات پر آجاتے ہیں....۳۱

اس سفر نامے میں مسافروں کی آسانی کے لیے رہ نمائی چارٹ بھی دیا گیا ہے۔اس سفر نامے کی زبان سادہ ہے اور اس میں موزوں الفاظ کے استعمال کو ملحوظِ خاطر رکھا گیا ہے۔تحریر میں روانی دیکھنے کو ملتی ہے لیکن الفاظ لکھنے کا انداز قدیم ہے۔اختصار اور جامعیت بھی اس سفر نامے کو خوبصورت بنانے میں مدد دیتی ہے۔فنی خامیوں اور املا کی قدامت کے باوجود اسلوب بیان کا حسن اس سفر نامے میں پایاں جاتا ہے۔یہ سفر نامہ اس عہد کی جغرافیائی اور تمدنی صورتِ حال کی عکس بندی بھی کرتا ہے۔یہ سفر نامہ اپنے عہد کا ایک عمدہ رہ نمائے سفر ہے۔

رسالہء حج (۱۸۹۲ء):

حاجی علیم الدین کا یہ سفر نامہ ۱۸۹۲ء میں شائع ہوا۔یہ سفر نامہ دل کش نثر رکھنے کے باوجود حج نامہ کے فن پر پورا نہیں اترتا۔اس عہد کے دوسرے حج ناموں کی طرح یہ سفر نامہ بھی رہ نما کتاب کے طور پر منظر پر آیا۔اس سفر نامے کے باخوبی مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس میں حج کے احوال و مشاہدات موجود نہیں ہیں۔چنانچہ یہ سفر نامہ گائیڈ کی حیثیت اختیار کر گیا۔اس سفر نامے سے پہلے سفر کے دوران جان و مال محفوظ نہ ہوتے تھے۔حاجی علیم الدین نے اپنے سفر نامے میں مسافروں کو اس خوف سے آزاد کروایا اور جدہ سے مکہ تک کے سفر کو تقریباً محفوظ قرار دیا۔وہ لکھتے ہیں:

> جدہ سے مکہ مکرمہ تک چھ یا سات چوکیاں ہیں لیکن فی زمانہ راستہ بالکل صاف اور بے خطر ہے ،اور جا بجا چوکیاں بنی ہوئی ہیں کہ بالکل اندیشہ نہیں رہا ہے اور جو مقامات پرخوف تھے اس دو تین برس میں وہاں جدید چوکیاں قائم کر دی گئی ہیں۔ ۳۳

یہ سفر نامہ عرب کی تہذیب اور ثقافت پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔ثقافت کے اعتبار سے اس سفر نامہ میں قہوہ خانوں کا ذکر دوسرے سفر ناموں کی نسبت زیادہ ملتا ہے۔مصنف ایک جگہ تحریر کرتا ہے:

> ملک عرب میں دستور ہے کہ ہر محلے اور عام گذرگاہ اور مکانات تفریح پر کسی مکان یا دوکان میں سرراہ قہوہ خانہ قائم کر لیتے ہیں ،بیٹھنے کا سامان ملکی رواج کے موافق ہوتا ہے ،ہر آدمی بلا تمیز و تخصیص اس میں جا سکتا ہے اور جو چیز چائے ،قہوہ ،حقہ ،منظور ہو طلب کر سکتا ہے۔مہتمم قہوہ خانہ بلا عذر ہر چیز مطلوبہ پیش کرے گا اور جب تک دل چاہے بیٹھے رہے وہ متقاضی نہیں ہو گا.... گرمی کے موسم میں اکثر عرب ایسے قہوہ خانوں میں جو کنارہء شہر پر یا ہوا زیادہ آنے کے موقع پر واقع ہیں ،رات کو سویا بھی کرتے ہیں.... ۳۴

زبان و اسلوب کے اعتبار سے یہ سفر نامہ اپنے عہد کے سفر ناموں میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔نثر صاف اور رواں ہے۔فنی خامیوں کے باوجود یہ سفر نامہ کی زبان و اسلوب کے اعتبار سے بہت سی خوبیاں رکھتا

ہے جن میں قطعیت اور وضاحت، اختصار و جامعیت شامل ہیں۔

سیاحت الحرمین بزیارت الثقلین (۱۸۹۳ء):

مولوی سید دلاور علی نے ۱۸۹۳ء میں سفر اختیار کیا اور سفر سے واپس آ کر حج نامہ تحریر کیا۔ یہ روز نامچہ کی شکل میں لکھا گیا ہے۔ اس عہد کی روایت کے مطابق جزئیات سفر کو تفصیل تحریر کیا گیا ہے۔ مشاہدے میں آنے والی ضروری و غیر ضروری چیز کو تحریر کرنے کے سبب مشتملات میں توازن قائم نہیں رہا۔ اس عہد کے رجحان کے پیش نظر مکہ کی تاریخ بھی اس سفر نامہ میں پڑھنے کو ملتی ہے۔ مصنف کا قلب عشق و محبت سے لبریز ہے اور سفر نامہ کو پڑھنے میں تازگی کا احساس ہوتا ہے اور تاثیر کے باعث تحریر قاری کے دل پر گہرا اثر کرتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ایسے تنگ وقت پر یہاں عرفات میں پہنچنے کے صرف نماز فریضہء صبح کی ملی اور سنن ترک ہوئے۔ بارہ بجے تک ضروری کاموں سے فراغت ہوئی اور نماز کا وقت آ پہنچا۔ آج کا وہ دن ہے کہ جس کہ واسطے تمامی مصائب اور مصیبت اٹھائی۔ آج وہ خوشی مسلمانوں کو ہوئی کہ شاید اس سے زیادہ خوشی ہوئی پھر نصیب نہ ہوگی.... ۳۵

اس سفر نامہ میں حجاز کی جغرافیائی، سماجی اور سیاسی پہلو کو بھی تحریر میں لایا گیا ہے۔ اس دور کی سفر کے دوران مشکلات کو بھی زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ اگر چہ طوالت سے سفر نامہ کے حسن میں کمی آئی ہے پھر بھی یہ سفر نامہ ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ قلبی کیفیات کی مقدار کم نظر آئی ہے لیکن مشاہدات سادہ اور سلیس زبان میں بیان کیے گئے ہیں۔ بے ساختگی اور زورِ بیان اس حج نامہ کی خاص خصوصیات ہیں۔ مزاح کا پہلو بھی دیکھنے کو ملتا ہے:

> خدا کی قدرت ہے کہ بقید حیات مجنوں نے اس ذلت سے بسر کیا اور بعد مرنے کے یہ عزت پائی، اور لیلی نے بقید حیات بڑی عزت سے بسر کی اور بعد مرنے کے اس کے مکان کی یہ خرابی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ مرنے کے بعد مجنوں لیلی بن گئے اور لیلی مجنوں ہو گئی ہے۔ لیلی کی قبر کے گرد و نواح ہم نے بہت سے کتے پھرتے ہوئے دیکھے۔ ایک کتا اس کی قبر کے رو برو مرا پڑا تھا اور اس قدر پھول گیا تھا کہ تمیز نہیں ہوتی تھی کہ یہ کس جانور کی نعش ہے۔ ہمارے ہمراہیوں سے جو محمد فیض علی خاں گوالیری تھی، انھوں نے بے ساختہ کہا کہ یہی سگِ لیلیٰ ہے۔ ۳۶

سفر نامۂ عرب (۱۳۱۲ھ/۹۵-۱۸۹۴ء):

محمد حفیظ اللہ نے سفر نامہء عرب اپنے سفر واپسی پر تحریر کیا جو ۹۵-۱۸۹۴ء میں شائع ہوا۔ وہ ۱۳۰۸ء حج

کے سفر پر روانہ ہوئے۔ان کا حج کا سفر نامہ برائے نام ہی تھا اصل میں انھوں نے سر زمین حجاز کی سیاحت کی اور اس کے بارے میں زیادہ تر لکھا۔محمد حفیظ اللہ نے عرب کی سیاسی ،سماجی ،تمدنی ،مذہبی اور اخلاقی حالت پر روشنی ڈالی۔ پہلے سفر نامہ نگاروں نے جو غلط فہمیاں اہلِ عرب بالخصوص بدوؤں اور سلطان روم کے خلاف پھیلائی تھی انہیں رو کیا اور عرب کی صحیح صورت حال پیش کی ۔اس کے علاوہ آپ نے حسن معاشرت کی ترقی اور مذہبی تقدس کا فروغ کو بھی اپنے حج نامہ کا حصہ بنایا ۔ یہ سفر نامہ اصل میں سر زمین حجاز کا سفر نامہ میں زیادہ محسوس ہوتا ہے۔آپ نے عربوں کی روزمرہ عادتوں کو بھی قلم بند کیا اور یہ چیز باور کروانے کی کوشش کی گئی عرب کے دل میں قرآن پڑھنے کا بہت جذبہ ہوتا ہے وہ لکھتے ہے:

> عرب عموما ،خصوصا اہل مکہ ،محذرات قرآنی کے جس قدر شیفتہ ہے اور قاریوں کی عظمت و جلالت جس قدر ان کے دلوں میں ہے، ہندوستان کس باغ کی مولی ہے ،اسلامی دنیا میں کسی کو یہ مرتبہ حاصل نہیں ۔ اہل مکہ کسی عائق و موانع کی وجہ سے جس روز قرآن کی سماعت سے ناکام ہوتے ہیں اس روز ان کو ایسی بے چینی ہوتی ہے جیسی ہمارے ملک کے افیونیوں کو بر وقت عدم دستیابی افیون، یا عیاشوں کو ناچ مجرہ کی محرومی سے ..... امرا اپنے گھروں میں خوش الحان قاریوں کو بلاتے ہیں اور دو چار رکوع سنتے ہیں۔متوسط و غربا روزانہ قاریوں کے مدرسوں میں قرآن کی سماعت کے لیے حاضر ہوا کرتے ہیں ۔ ۳۷

انھوں نے بدوؤں کے حالات کی تحقیق بڑے احسن انداز سے کی۔شرعی پابندیوں کے مقابلے میں با اصول ،مہمان نواز ،سخاوت،شراب خانہ کا ذکر جدہ میں لیکن عثمان پاشا کے دور میں بند،ارض حرم عقیدت و محبت ، جذبات کی پاکیزگی اور ہلچل نظر آتی ہے، روضہ مبارک کو سامنے دیکھ کر احساس ندامت ،قلب و ذہن سکون سے لبریز،خلوصِ قلب درج ذیل اقتباس میں:

> روضہ ءمبارک کے دیکھنے سے ہر شخص کو یقینی معلوم ہوتا ہے کہ ہم نے آں حضرت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔جس کو ذرا بھی اللہ تعالی و رسول ﷺ سے محبت ہوتی ہے اس کو وہاں عجیب کیفیت حاصل ہوتی ہے ۔ میں پہلی مرتبہ جب مواجہہ شریف کے سامنے جا بیٹھا۔فی الفور ندامت دامن گیر ہوئی کہ اے شخص! تیرا منہ ہے کہ اس پاک مقام میں بیٹھے گا۔ چنانچہ غایت ندامت سے اٹھا اور صحن مسجد کی طرف چلا،اسی اثنا میں تہجد کے وقت مؤذن نے ندا دی۔یا عبادی انا الستار۔اس ندا کے سنتے ہی اس قدر دل کو تسکین ہوگئی کہ گویا ہمارے عصیان سب معاف کر دیئے گئے ۔پھر اسی وقت میں مواجہہ شریف کے سامنے آکر بیٹھ گیا۔ ۳۸

حج نامے میں مدینے کی عید کا ذکر سے سرزمین حرم کی ثقافتی جھلک دیکھنے کو ملتی ہے ۔حج کی روداد سفر

نامہ میں برائے نام ہے اور حج پر جو بھی لکھا گیا ہے وہ فنی اعتبار سے اہمیت نہیں رکھتا۔ یہ اس حج نامہ کا ایک نقص ہے۔ البتہ حج نامہ کی تحریر شستہ و رواں۔تحریر میں صفائی اور اسلوب میں پختگی دیکھنے کو ملتی ہے، موزوں اور مناسب الفاظ کا چناؤ کیا گیا ہے تا کہ حج نامہ میں تازگی اور دل کشی پیدا ہو۔طرزِ املا قدیم ہے۔ اس سب کے باوجود اس حج نامہ کا شمار عہد کے ممتاز حج ناموں میں ہوتا ہے۔ اس میں اصل خوبی ادبی اور تنظیمی ہے اور فنی اعتبار سے یہ حج نامہ برائے نام ہے۔

سفر نامہ' حجاز (۱۸۹۵ء):

عرفان علی بیگ کا حج نامہ سفر نامۂ حجاز فنی و ادبی اعتبار سے انیسویں صدی کے حج ناموں میں ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ۱۸۹۵ء میں لکھنوء سے شائع ہوا۔اس حج نامہ میں سفر کے احوال اور رہ نمائی کے حوالے سے اختصار سے کام لیا گیا ہے۔ حج کے مقامات کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔تحریر میں خاصا توازن پایا جاتا ہے۔اس حج نامہ کے لیے روز نامچہ کی تکنیک استعمال کی گئی ہے۔تحریر مربوط ہے۔تاثرات میں شائستگی اور تازگی موجود ہے۔

یہ حج نام خاص طور پر قلبی واردات و جذبات سے معمور ہے۔جیسے جیسے قلبی واردات سے گذرتا ہے حج نامہ نگار ویسے ویسے ان احساسات کو حج نامہ کا حصہ بناتا جاتا ہے۔احرام باندھتے ہی حج نامہ نگار عجیب عاجزی انکساری کی کیفیت سے گذرتا ہے۔حج نامہ نگار ایک جگہ لکھتا ہے:

> ....اور آج ہم دونوں نے قرآن کی نیت کر کے احرام باندھا اور جوش دل کے ساتھ لبيك اللهم لبيك لاشريك لك لبيك ان الحمدوالنعمته لك والملك لا شريك لك بار بار پکارا۔شان وعظمت الٰہی ذرہ ذرہ سے نمود ہو رہی ہے۔عجب شان ہے اور عجب خودمختاری ہے کہ ہم سے اپنے بال توڑنے تک کا مواخذہ ہے اور یہ ثبوت اس کا ہے کہ ہم میں کوئی چیز ہماری نہیں۔پس ہم محض ناچیز ہے اور صاحبی اسی کی ہے جس کو قدامت ہے.... ۳۹

مختلف مقامات پر عرفان علی بیگ مختلف قلبی کیفیات سے گذرتے ہیں۔جیسا کہ بیت اللہ کے قریب آتے ہی ان کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو جاتی ہیں۔ ان کا بدن کانپنا شروع ہو جاتا ہے۔اس حج نامہ کی تحریر میں سلاست اور روانی پائی جاتی ہے۔تحریر خوبصورت و پرکشش ہے نثر میں کہیں کہیں شعر کی سی نغمگی پڑھنے کو ملتی ہے۔کہیں کہیں قدیم انداز لیکن عام طور پر الفاظ کو جدید انداز میں لکھتے ہیں۔اس کا اندازہ درج ذیل اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے۔عرفان علی بیگ اپنی قلبی و روحانی کیفیات کو بڑی خوبصورتی سے قلمبند کرتے ہیں۔ان کا مشاہدہ تیز ہے اور قاری کو اپنی طرف راغب کرتا ہے۔وہ علی الصبح ستاروں پر نگاہ پڑنے کو بڑے خوبصورت انداز میں بیان کرتے ہے ایک جگہ لکھتے ہیں:

آج شب کو ہر طرح سے خیریت رہی، نہ دریا میں جوش نہ ہوا کو خروش۔ آخری بار جب آنکھ کھلی تو صبح کے ستارے پر نگاہ پڑی۔ نور کا تڑکا ہے۔ سطح دریا پر عجب پیاری صبح ہے۔ ادھر مہتاب نے اس سیہ تاب دریا پر چاندنی کا فرش بچھا رکھا ہے۔ ادھر نور کے ستارے نے اپنی تابش سے اس کو چمکا رکھا ہے۔ روئے زمین پر یہ لطف کہاں.... ۴۰

زاد غریب (۱۳۱۳ھ/۹۶-۱۸۹۵ء)

نواب محمد عمر علی خان صاحب بہادر کا سفر نامہ زاد غریب سفرِ حج کی روداد اور عرب ممالک کی زیارت گاہوں کا احوال پر مشتمل ہے۔ انھوں نے عرب کی جغرافیائی صورتِ حال کا بخوبی جائزہ لیا اور تحریر کیا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے عربوں کی نسل اور عہدِ صحابہ سے اپنے عہد تک کے خلفا اور حکمرانوں کی بھی تحریر کو پیش کیا۔ شہرہ جدہ کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

ایک شہر مختصر قریب ۱۵ یا ۲۰ ہزار آدمیوں کی آبادی کے ہوگا۔ مکانات بلند بلند، کوچہ تنگ، بازار اوپر سے لکڑی سے پٹا ہوا۔ وسط شہر میں بازار سے ملی ہوئی جامع مسجد ہے، فوج سلطانی اور توپ خانہ رہتا ہے۔ شہر کے متصل قلعہ ہے، اس میں فوج رہتی ہے۔ اس کے متصل حضرت حوا کی قبر ہے۔ جدہ سے تین چار کوس تک میدان ریتلا ہے۔ جگہ جگہ ٹیلے زردی مائل ہیں، اور شہر سے ایک میل کے قریب چاہ بنے ہوئے ہیں کہ بارش کا پانی وہاں جمع ہوتا ہے۔ اسی کا سال بھر تک خرچ ہے۔ ۴۱

اس حج نامہ میں حج نامہ نگار اپنی عقیدت کا اظہار تو کرتا ہے لیکن جذبات کی کمی واضح نظر آتی ہے۔ پہلی نظر خانہ کعبہ کو دیکھتے ہیں تو جب بیان کرتے ہیں تو اپنے دلی کیفیات اور اور جذبات کا اظہار نہیں کرتے۔ بیانیہ خشک اور اسلوب میں سقم پایا جاتا ہے۔ درج ذیل اقتباس قابلِ غور ہے:

... پھر یہ نیاز مند باوضو مطوف کے ہمراہ اول حرم شریف میں دروازہ باب السلام سے داخل ہو کر سات شوط یعنی پھیرے کعبہ شریف کے لیے، اسے طواف قدوم کہتے ہیں۔ پھر دو رکعت واجب طواف کی پڑھ کر باب الصفا سے نکل کر صفا اور مروہ میں سات مرتبہ سعی کی.. ۴۲

زاد غریب حج نامہ میں اسلوب میں پختگی کی کمی اور زبان میں خوبی موجود نہیں البتہ مختصر طور پر حج کے دوران ہونے والے مشاہدات موجود ہیں۔ تاہم یہ حج نامہ اپنے عہد میں اوسط درجے کا حج نامہ ہے۔ عقیدت تو موجود ہے لیکن جذبات کی کمی واضح طور پر محسوس کی جا سکتی ہے۔ اندازِ بیان گائیڈ بک کی طرح کا ہے۔ غیر ضروری چیزیں شامل کرنے کی وجہ سے عدم توازن پایا جاتا ہے۔ یہ سفر نامہ زمینِ حرم کی تہذیبی اور سماجی زندگی کی تصویر پیش کرتا ہے۔

ابتدائی عہد کے حج ناموں کا مجموعی جائزہ

بیشتر حج نامے گائیڈ کی حیثیت رکھتے ہیں۔حج نامہ نگاروں نے کوشش کی کہ وہ سفر کے دوران پیش آنے والی ضرورت اور مشکلات کا ذکر اپنے حج نامہ میں کر کے مستقبل کے حجاج کے لیے آسانی پیدا کر سکے۔مختصر یہ کہ مذکورہ حج ناموں کے مطالعے سے دو بڑے رجحان سامنے آتے ہیں اول رہ نمائی سفر ہے اور دوسرا تاریخ وجغرافیہ اور تہذیب وثقافت کی پیش کش ہے۔

ان حج ناموں کے عہد میں سرسید احمد خان کی اصلاح و زبان کی تحریک عروج پر تھی لیکن ۔زبان و اسلوب کے حوالے سے کوئی اثرات نہیں۔اس وجہ یہ تھی کہ چند ایک حج نامہ نگاروں کو چھوڑ کر باقی سارے معروف اہلِ قلم نہیں تھے۔ان حج ناموں میں عربی اور فارسی زبان کے مشکل الفاظ کا استعمال بھی پایا جاتا ہے۔زبان مشکل اور ثقیل ہے۔اسلوب میں الجھاؤ اور جملوں کی ترکیب اور طرزِ املا میں قدامت کا رویہ پایا جاتا ہے۔اس عہد کے حج نامہ نگار یائے معروف اور مجہول میں کوئی فرق نہیں کرتے۔اس کے علاوہ دوچشمی ھ کے بجائے ہائے ہوز کا استعمال کیا گیا ہے۔دو الفاظ (طرحکا،اوسجگہ) کو ملا کر لکھنے کا رجحان بھی ملتا ہے۔قدیم طرز پر زائد الفاظ کا استعمال بھی ملتا ہے۔

اس عہد کی آخری دہائی کے حج ناموں میں سہل زبان کا استعمال اور اسلوب میں حسن کی آمیزش نظر آتی ہے۔حاجی علیم الدین کا رسالہ حج ،سید دلاور علی کا سیاحت الحرمین بزیارت الثقلین، محمد حفیظ اللہ کا سفر نامۂ عرب، یوسف بن شہاب الدین کا یادگار یوسف اور مرزا عرفان علی بیگ کا سفر نامۂ حجاز اپنی زبان و اسلوب کی خوبیوں کے سبب جملہ جملہ حج ناموں میں ممتاز نظر آتے ہیں۔ان میں زبان و اسلوب کی خوبیاں نمایاں پائی جاتی ہیں۔حمد و مناجات اور اشعار کا استعمال بھی ملتا ہے۔وقت کے رجحان کے مطابق ٹائٹل پر نقش و نگار اور بیل بوٹوں کا رجحان بھی ملتا ہے۔

اردو حج نامے ------ ۱۹۰۱ء تا ۱۹۴۷ء

سفر نامہ ء حجاز و مصر (۱۹۰۴ء)

نواب احمد حسین خاں، حسن پور، ضلع مراد آباد کے رئیس تھے۔ان کا یہ سفر نامہ روزنامچہ کی شکل میں تحریر کیا گیا ہے۔یہ سفر نامہ منظر کشی کے حسن سے لبریز اور واقعات و مشاہدات کی حقیقت بیانی سے مالامال ہے ۔زبان و اسلوب میں ادبی رنگ نمایاں ہے ۔اس عہد کے حجاز کی منظر کشی، مقامات حج کے تاثرات و مشاہدات، مکہ حالات و معاشرت، مسجد نبوی کے تذکرے، اور سفر حج کے علاوہ مصر کے سفر کی روداد اس حج نامہ کی نمایاں خصوصیات ہیں۔علاوہ ازیں اس حج نامہ میں سفر کے متعلق ضروری ہدایات ومسائل اور جہاز کے حالات کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔اس سفر نامہ کی نمایاں خصوصیات منظر کشی کی عمدگی ہے جس میں تازگی اور شگفتگی پائی

جاتی ہے۔درج ذیل سطور میں منی کی منظر کشی کی گئی جس سے مذکورہ خوبیاں واضح ہیں:

کثرت سے سپاہی،فوجی پہرہ پر مقرر ہیں۔اکثر افسر خیمہ زن ہیں۔یہیں پر احمد راتب پاشا کا قریب میں خیمہ ہے، جونہایت پر تکلف آراستہ ہے۔فوج اور توپ خانہ بھی قریب ہی پڑا ہوا ہے۔شریف صاحب کا خیمہء درباری بھی اس جگہ تھا۔ ہمارے مقام گاہ کے قریب شفا خانہء ترکی بہت بڑا امکان ہے،جس پر سلطانی جھنڈا اڑتا ہے۔رات کو بلندی پر لالٹین نشان سلطانی کی روشن ہوتی ہے۔۔پشت شفا خانہ پر قافلہء محمل مصری مقیم ہے،جو مسجد خفیف کے متصل ہے۔اس کا سامان شاہی وفوج وتوپ خانہ وخیمہ پر تکلف علاحدہ نصب ہیں۔ مقام ذبح حضرت اسماعیل علیہ السلام پر، جودامن کوہ پر واقع ہے،ایک چبوترہ بنا ہوا ہے،اوراس پر ایک قبہ سابنا ہوا ہے،اس کے نیچے تہہ خانہ ہے، یہ خاص جگہ ذبیحہ حضرت اسماعیل علیہ السلام ہے،جہاں پر ہزاروں آدمی زیارت کے واسطے جاتے ہیں۔اس کے تھوڑے فاصلہ پر شاہی قافلہ مقیم ہے۔شاہی قافلہ کا سب سے زیادہ تکلف سامان ہے۔ ہر پنج وقتہ نماز پر تینوں لشکروں سے ۲۱۔۲۱ توپیں ۹ تاریخ سے ۱۳تک چلتی رہتی ہیں۔گیارھویں تاریخ شب کو تمام منی میں سرکاری مقامات پر روشنی بکثرت ہوئی اورآتش بازی چھوڑی گئی۔سواری شریف ہر روز نہایت تزک واہتمام سے بازار میں شام کے وقت نکلتی ہے۔یہ کیفیت قابل دید ہے.. ۴۳

اگرچہ مصنف منظر کشی کو بخوبی نبھا پایا لیکن داخلی کیفیات کے اظہار میں مصنف پوری طرح کامیاب ہوتا ہوا دکھائی نہیں دیا۔درج ذیل اقتباس سے اس بات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔مصنف لکھتا ہے:

.... آج کا دن کیسا مبارک ہے کہ مجھ روسیاہ وگنہ گار و مع ہمراہیان دربار عالی جناب احمد مختار رسول ﷺ میں عزت وشرف حضوری حاصل ہو۔ بریں مژدہ گر جاں فشانم رواست ۔یہ وہی اعزاز وشرف تو ہے کہ ہزاروں میل چل لیے،اوراپنی امیدیں دل ہی میں لے گئے۔اس نعمت عظمیٰ وعطیہ کبریٰ پر جس قدر ناز کریں،تھوڑا ہے۔خداوند کریم یہ دن سب میرے اعزہ و احباب کو و نیز مجھ کو پھر نصیب کرے۔آمین،ثم آمین.... ۴۴

اس سفر نامہ کی زبان عام طور پر سلیس و رواں ہے لیکن بعض جگہوں پر بیان میں الجھاؤ اور سقم پایا جاتا ہے۔قدیم مروجہ الفاظ اور طرز املا کا استعمال ہوا ہے،مثال کے طور پر:''کوٹھیات''،''جہازات''،''چٹھیات''، ''تالاش''،''لیوے''اور''اون کا''وغیرہ۔یہ حج نامہ اگرچہ فنی طور پر کمزور ہے مگر اس کے مقابلے میں ادبی خصوصیات بہتر طور پر موجود ہیں۔تفصیل اور جزئیات نگاری کا خاص رنگ موجود ہے۔حج نامہ کے مشتملات کو نبھایا گیا ہے۔

سفر حجاز(۱۳۲۵ھ/۱۹۰۷ء)

خطیب قادر بادشاہ جنوبی ہند کے شہر وانم باڑی کے رئیس تھے۔عمدہ شاعر تھے بادشاہ ان کا تخلص تھا۔۱۹۰۶ء میں سفرِ حج اختیار کیا۔اپنے حج نامہ کو خطوط کی شکل میں تحریر کرتے رہے اور ایک اخبار ''مخبر دکن'' کو ارسال کرتے رہے جو''ایک عازم حرمین شریفین کی مراسلت'' کے عنوان سے شائع ہوتے رہے۔بعد میں انہیں کتابی شکل میں مرتب کیا۔اس حج نامہ کو اردو حج ناموں میں مکاتیب کی شکل میں اولین حج نامہ ہونے کا شرف حاصل ہے۔یہ۱۵مکاتیب پر مشتمل ہے۔اختصار کے باوجود میں ہر مراسلے میں قاری کے لیے کشش رکھتا ہے۔

سفر نامہ نگار ادائیگی حج کے حوالے سے اپنی خوشی کا اظہار پوری سادگی، روانی اور سلاست کے ساتھ کرتا ہے جس میں عقیدت ،شکر گذاری، رجائیت نظر آتی ہے۔ورج ذیل اقتباس سے اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

> ...اس پاک پروردگار جل جلالہ وعم نوالہ کا ہم کس زبان سے شکریہ ادا کریں کہ اس نے بغیر حرج ومرج کے ہمیں نعمت حج سے سرفراز فرمایا، پورے مناسک حج ہم سے ادا کروایا، ہماری آرزوئے دیرینہ برلایا، ہماری آنکھوں کو اسلامی شان وشوکت کا وہ نظارہ دکھلایا جو عمر بھر ہم کو یادرہے۔جس طرح اس نے ہمیں یہ نعمت عطا کی ہے اسی طرح اس کو مقبول بھی کرلے تو کیا خوب ہوگا۔اس کے فضل وعنایت سے یہ کوئی بڑی بات ہے؟نہیں ہرگز نہیں
>
> اوسے فضل کرتے نہیں لگتی بار
>
> نہ ہو اس سے مایوس امیدوار ۴۵

اس حج نامہ میں کیفیات کا منظوم اظہار بھی پایا جاتا ہے۔نظمیں اور غزلیں مل کر ایک مکمل اور مختصر حج نامہ کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔یہاں پر بھی دلی کیفیات کا اظہار سادگی ،سلاست اور تاثیر کے ساتھ کیا جاتا ہے۔کچھ اشعار تو قاری کو دل نکال لیتے ہیں۔چند ایک بطور مثال پیش کئے جا رہے ہیں:

عنادل ہم ہیں سب نغمہ ہے لبیک
چمن ہے دین کا میدان عرفات
مقدر کھینچ لایا ہے وگرنہ
کجا ہم یہ کجا میدان عرفات

مشاہدات عموی نوعیت کے ہیں۔قلبی کیفیات کا اظہار بھی ہے لیکن ان کیفیات میں کوئی نیا پن نظر نہیں آتا۔اسلوب بیان کی وجہ سے مشاہدات و کیفیات میں حسن پیدا ہوتا ہے۔اظہار میں سادگی اور صداقت پائی

جاتی ہے۔

سفر نامہ ء حجاز، شام و مصر (۱۹۰۹ء)

امتہ الغنی نور النساء حیدر آباد دکن سے تعلق رکھتی ہے۔ اردو کے مشہور محقق مولوی نصیر الدین ہاشمی کی بہن تھیں۔ ان کے زمانے میں خواتین میں سفر نامہ لکھنے کا رواج نہیں تھا۔ سلطان جہاں بیگم کے بعد وہ دوسری خاتون حج نامہ نگار کی حیثیت سے سامنے آئی۔ یہ حج نامہ روز نامچہ کی تکنیک میں تحریر کیا گیا ہے۔ حج نامہ میں ادبی حسن موجود ہے۔ حرم شریف کے منظر کی دل کشی کو بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیا گیا:

> .... عشاء کے وقت حرم شریف میں عجیب بہار ہے ۔ نیلگوں آسمان ابر کے سیاہ ٹکڑوں سے پاک ہے ۔ افق نیلگوں میں چاند آب وتاب سے چمک رہا ہے اپنی سفید با صفا روشنی حرم کعبہ پر سے نثار کر رہا ہے ۔ چھوٹے چھوٹے خوبصورت تارے اپنی بہار دکھلا رہے ہیں۔ حرم شریف کے سیاہ پردے پر سفید سفید چاندنی کیا ہی دل فریب لطف دے رہی ہے۔ اللہ اکبر! کی بار بار صدا عجیب سماں پیدا کر رہی ہے ۔ چاند کی روشنی میں رنگ برنگ کے قمقمے پر لطف معلوم ہو رہے ہیں۔ سفید سفید عمارتیں اور بلند بلند مینار اور چوٹی دار پہاڑ، کسی کا نماز پڑھنا، کسی کا طواف کرنا، کسی کا قرآن پڑھنا، کسی کا درود پڑھنا، کسی کا حجر اسود کو بوسہ دینا، غرض عجیب دل کو فرحت دینے والا سماں ہے۔ جو بیان سے باہر ہے، قلم تحریر سے عاجز، سیاہی کام دینے سے بے کار ہے۔ خدا سے دعا ہے کہ تمام احباب واقرباء کو کعبہ کی زیارت نصیب کرے۔ آمین۔ [۴۶]

مصنفہ نے کہیں کہیں اپنے خوبصورت اشعار سے بھی اپنی قلبی واردات و کیفیات کا اظہار کیا ہے۔ کچھ اشعار درج ذیل ہیں:

طواف کعبہ میں رہا کرتے ہیں
اس کے کوچہ میں پھرا کرتے ہیں
خوب کرتے ہیں بجا کرتے ہیں [۴۷]

حج نامہ نگار نے حجاز کی عورتوں کے لباس کا حال بیان کرتے ہوئے مغربی تقلید کی روش پر تنقید کی ہے اور افسوس کا اظہار کیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتی ہیں:

> یہاں کی عورتوں نے اپنا لباس اور ملکوں کی عورتوں کی طرح تبدیل کر دیا ہے ۔ سینہ وغیرہ عیسائیوں کی طرح کھلا رکھتے ہیں۔" چہ کفر است کعبہ بر خیزد کجا ماند مسلمانی۔" افسوس کے یہاں کی عورتوں کا یہ لباس ہو گیا ہے ۔ اخلاق میں یہاں کے لوگ بہت بڑھے ہوئے

> ہیں۔یہاں تک کہ غلام کو بھی اپنے برابر سمجھتے ہیں۔درحقیت ایسا ہی ہونا چاہیے،کیونکہ اسلام ایسا ہی حکم دیتا ہے۔کل مومن اخوت۔۴۸؎

اس حج نامہ میں اختصار و جامعیت،دل چسپ اندازِ تحریر اور بھر پور ادبی حسن پایا جاتا ہے۔لسانی حیثیت سے اس عہد کے حج ناموں میں یہ خاص اہمیت کا حامل ہے۔

پا پیادہ حج خداداد(ت-ن)

پاپیادہ حج خداداد، خداداد خان نے لکھا ہے جنہیں سیاحت کا بہت شوق تھا۔وہ حج کے سفر پہ پا پیادہ نکل پڑے۔سفر نامہ کے آغاز میں اپنے اس سفر،سفر نامہ اور اس کے مشتملات کے بارے میں لکھتے ہیں:

> میرے اعزا و احباب مجھ سے اصرار کرتے تھے کہ اپنا سفر نامہ سنایئے۔چونکہ سفر طویل ہے اور مسافت بعید کے حضرات اس سے مستفید نہیں ہوسکتے تھے،اس لیے اس کو ضبط تحریر میں لایا گیا ،لیکن ضخامت میں اضافہ ہی ہوتا گیا۔اس لیے اس کے تین حصے کیے۔پہلا حصہ مرادآباد سے کراچی،بصرہ،بغداد،کربلائے معلٰی،نجف اشرف،سامرہ،موصل،حلب وغیرہ۔وحصہ دوم میں حلب سے اور نہ،ازمیر،بروصہ،استنبول،رومانیہ،بلغاریہ،یونان،سلائیک،اسکندریہ،سوئز،مصر وغیرہ کے حالات۔وحصہ سوم میں مصر سے ینبوع،اور ینبوع سے مدینہ منورہ،رابق،مکہ معظّمہ،جدہ،بمبئی تا مرادآباد نذر ناظرین ہے۔چوں کہ یہ سفر قریب قریب پا پیادہ کیا گیا ہے ،اس لیے ہر ملک و شہر، وقریہ کے حالات،وہاں کے ساکنان کی بودوباش،رہائش،طرزِ معاشرت،عادت،تہذیب وتمدن،وتمول وتجارت وسلوک وطریقہ ءحکمرانی وغیرہ وغیرہ کے بڑے دلچسپ،تاریخی،وچشم دید حالات تحریر کیے ہیں۔ ۴۹؎

وہ اپنے حج نامہ میں عربوں کی مہمان نوازی،عقیدت،غیرت وخودداری اور اکھڑ پن کا بھی ذکر کرتے ہیں۔درج ذیل اقتباس میں بدوؤں کی مہمان نوازی کی داستان بیان کرتے ہیں جو کسی اور حج نامہ میں نظر نہیں آتی:

> ... سردی کی وجہ سے آنکھ کھل گئی،اتنے میں دوسرے خیمے والوں نے جو کہ آگئے تھے،چوک میں آگ جلائی۔میں بھی جا کر تاپنے لگا۔ابھی انہوں نے مجھ سے دریافت ہی کیا تھا کہ ایک شخص شور مچاتا ہوا آیا۔میں اس شور پر بھوں چکا ہوگیا۔ابھی مڑ کر دیکھنے بھی نہ پایا تھا کہ ایک شخص نے مجھے بیٹھے ہوئے کو پشت سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے جس خیمہ سے گیا تھا وہیں لے آئے۔جب خیمہ کا مالک آیا تو اس نے اپنی بیوی سے دریافت کیا کہ آج ایک نووارد آگ کے قریب بیٹھا ہوا نظر آرہا ہے،تو بیوی نے بتلایا کہ وہ تمہارے ہی مہمان ہے۔یا وہ شکار

وغیرہ نہ ملنے کی وجہ سے رنجیدہ تھا یا طبیعتا ہی غضبناک تھا فورا بندوق اٹھائی اور چلایا کہ بندوق ہی فیصلہ کرے گی کہ میری برکت (مہمان) کو کس نے بہکایا ہے، تو ان لوگوں نے بتلایا کہ یہ خود ہی آیا ہے، تو چلا کر یہ شور مچاتا ہوا مجھے اپنے خیمے میں لایا کہ یہ آگ بھی تو اسی کے للچانے کو جلائی گئی تھی۔ مجھ ہندوستانی نے ایسی مہمان نوازی نہ کبھی دیکھی نہ سنی تھی۔ سخت پریشانی کے عالم میں مجبور خاموش ہو کر بیٹھ گیا کہ ان لوگوں کی تو برکت ہوتی ہے اور میرا کچومر نکلتا ہے۔...۵۰

ایک جگہ سفر نامہ نگار نے مدینہ منورہ میں خندق کی باقیات کے مشاہدے کا حال بھی تحریر کیا ہے:

..اس سے آگے بڑھے تو ساڑھے تیرہ سو برس کے بعد بھی گڑھے نمایاں دکھائی دیے۔ یہ خندق سلمان فارسی کی رائے سے کفار مکہ کی یورش کے زمانے میں مدینہ منورہ کی حفاظت کے لیے کھودی گئی تھی.... ۵۱

اس حج نامہ میں واقعات کو داستانی طرز پر تحریر کیا گیا ہے جو قاری کی دلچسپی کا سبب بنتی ہے۔ حج نامہ کو صداقت بیانی کے ساتھ تحریر کیا گیا ہے۔ زبان و اسلوب ٹھوس، سادہ، سلیس اور رواں ہیں۔ بعض مقامات پر اسلوب میں پختگی اور متانت اور تحریر میں تسلسل کی کمی پائی جاتی ہے۔ حج نامہ پر قدیم طرز اسلوب کی چھاپ موجود ہے۔

زاد السبیل (۱۹۲۳ء)

اس سفر نامہ کی مصنفہ راحیل شیروانیہ ہے۔ دینی جذبہ سے سرشار خاتون تھیں۔ ۱۹۲۳ء میں اپنے بھائی کے ہمراہ سفر حج اختیار کیا۔ حرم شریف پہنچنے پر مصنفہ کے دل میں زبردست ہلچل پیدا ہو گئی۔ اس کیفیات کے اظہار میں عاجزی، خشیت و ہیبت، عظمت و محبت اور وارفتگی پائی جاتی ہے۔ درج ذیل اقتباس سے اس کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے:

.... میں وہیں زمین پر بیٹھ گئی، اس وقت بلا مبالغہ مجھ کو اپنا وجود کتے سے بھی بدتر نظر آرہا تھا، اور ایسا سکتہ سا مجھ پر طاری ہوا کہ جو سچے دل اور شوق سے داخل ہو چکا ہو، وہی خوب اس کا اندازہ کر سکتا ہے.. میں نے پہلے تو شکرانہ کا دوگانہ ادا کیا، پھر نماز عشاء کی پڑھی۔ اس وقت تک میرے رعب سے ایسی بری حالت تھی کہ کعبہ شریف کو نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتی تھی، اور مجھ کو اس وقت بالکل احساس نہیں ہوا کہ نماز میں نے کس طرح ادا کی۔ اس کے بعد بہت ہمت کر کے میں نے جو کعبہ شریف کی طرف نگاہ اٹھائی، آنکھیں نیچی کرنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ ایک دم کعبہ کو تکے جاتی تھی، اور سبحان اللہ، سبحان اللہ کر رہی تھی۔ لوگ جوق جوق اس کے گرد نثار ہو رہے تھے (یعنی طواف کر رہے تھے)۔ اس کا شوق اور محویت مجھ کو پاگل کیے دیتی

> تھی۔خدا جانے میں وہاں کب تک بیٹھی رہی .... اتنے میں ہمارے معلم بھائی عبدالغنی صاحب آئے اور کئی آوازیں مجھ کو دیں، اور جب میں گویا چونکی۔انہوں نے کہاں کہ طواف کو چلیے۔اس وقت معلم صاحب کی ہم شیرہ بھی مجھ کو نظر آئیں۔میں نے کہا کہ ہیں آپ کدھر؟ انھوں نے کہا کہ میں تو آپ کے پاس بہت دیر سے بیٹھی ہوں۔خیر ہم طواف کو گئے اس وقت کی خوشی کا بیان میرے امکان سے باہر ہے. ۵۲

حج نامہ نگار نے خواتین کے رویوں کو بھی زیرِ بحث لایا ہے کیوں کہ وہ خود بھی صنفِ نازک سے تعلق رکھتی ہے۔چنانچہ لکھتی ہیں:

> .... کعبہ کے اندر داخلی کے شوق میں پہنچی تو میں گنہ گاروں کی طرح زینہ سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔عورتیں مجھے دھمکی دیتی تھی، اور ہاتھ پکڑ کر کھینچنا چاہتی تھی۔مگر میں ایک جگہ جمی رہی اور ہٹی نہیں۔تھوڑی دیر میں ایک خوجہ نے مجھے بلانے کا اشارہ کیا تو میں کشمکش سے اندر گئی۔وہاں ایک کا دوسرے کو ہوش نہ تھا۔میں نے ایک جگہ خالی نفل کی نیت کی، لیکن جس جگہ میں نے نیت باندھی تھی، اس سے ڈھائی تین گز پیچھے کو دھکے مار کر ہٹا دیا گیا۔بڑی مشکل سے اپنے کو گرنے سے بچا کر یہ دو نفل پورے کیے۔سجدہ میں جس وقت گئی، تو ایک بی بی صاحبہ میرے اوپر چڑھ کر بیٹھ ہی گئی۔خدا جانے بیٹھ کر دعا مانگی یہ کیا قصہ تھا، ہر چند میں ہلنا چاہتی تھی یعنی اٹھنا، مگر جنبش ناممکن تھی۔خود ہی شاید ان کو خدا کا خوف آیا، یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے کچھ ہدایت ہوئی جو کھڑی ہوگئیں... ۵۳

رمضان المبارک میں اہلِ مکہ کے معمولات تبدیل ہو جانے پر بھی مصنفہ نے اپنے حج نامہ میں لکھا ہے کہ رمضان کے مہینے میں لوگ دن کو سوتے ہیں اور رات کو کام کرتے ہیں۔سفر نامہ نگار لکھتی ہیں:

> .... بازار کی چیز رات ہی کو ملتی ہے۔دوست احباب سے ملنے جائے تو رات کو اور عورتیں سینہ پرونا کریں تو رات کو ہی کرتی ہیں۔غرض کہ پانچ سال کا بچہ بھی تمام شہر میں مشکل سے سوتا ہوگا۔سڑکوں پر بچوں کا کھیل ہے تو رات کو ہے، اور کسی کام والوں کو ضرورت ہو تو رات کو، غرض رات کیا ہے، گل زار ہوتی ہے .... ڈاک رات ہی کو تقسیم ہوتی ہے، اور رات ہی کو روانہ ہوتی ہے اور کوئی خاص مقدمہ ہو تو وہ بھی رات ہی کو حمیدیہ میں فیصل ہوگا۔اول تو کوئی جھگڑا یا مقدمہ اس مہینے میں ہوتا ہی نہیں۔اشد ضروری کام کچہری دربار کے رات ہی کو ہوتے ہیں۔غرض رمضان المبارک کا وہ مہینہ متبرک دیکھنے کو قابل ہے۔میری رائے میں تو جس مسلمان نے مکہ مکرمہ میں رمضان نہ دیکھے، اس نے دینا میں کچھ نہ دیکھا... ۵۴

واقعات کا دل کش پیرائیہ بیان میں اظہار کیا گیا ہے۔اس حج نامہ میں احساس کی شدت، بے ساختگی کا اظہار، روانی، سادگی و صفائی اور عزم و امنگ بہت نمایاں ہیں۔واقعات و مشاہدات کو جامعیت کی بجائے غیر ضروری طوالت سے کام لیا گیا ہے۔اسی وجہ سے اسلوب میں ڈھیلا پن اور خیال میں ربط کی کمی نظر آتی ہے۔

راہ وفا(۱۹۳۸ء)

اس حج نامہ کے مصنف محمد حفظ الرحمٰن وفا تھے جو شاعر بھی تھے۔وفا تخلص استعمال کرتے تھے۔مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں کیشیر تھے۔حج نامہ نگار نے اپنی قلبی کیفیات کا اظہار ایک جگہ سوئز سے جدہ کے سمندری سفر میں کوہ طور کے قریب سے گذرتے ہوئے کیا ہے۔آپ مقاماتِ مقدسہ کی زیارت پر حیرت اور خوشی کا اظہار کرتے ہیں۔ساتھ ساتھ بیت اللہ اور دیار رسول ﷺ کی حاضری کے تصور نے اس کے قلب کی گہرائی تک ہلچل مچا رکھی ہے۔ان کی تحریر دل پر گہرا اثر چھوڑتی ہے۔جس بات کا اندازہ ذیل میں پیش اقتباس سے بھی بخوبی لگایا جاسکتا ہے:

> .. صبح وشام وہی مناظر فطرت ہیں اور وہی ہماری حیرانیاں۔کبھی طلوع کا منظر سامنے ہے،کبھی غروب کا سماں پیشِ نظر ہے۔طور سینا جہاں حضرت کلیم اللہ نے جلوہ ءوحدت کی ایک جھلک دیکھی تھی ہماری آنکھوں کے سامنے نکل چکا ہے، جب موسیٰؑ تاب دید نہ لا سکے تو ہماری کیا مجال کہ اس جلوہ حقیقت کی طرف آنکھ بھی اٹھا سکیں،لیکن دیدار کی تمنا ضروری ہے کاش کہ پوری ہو۔اس وقت دل کی حالت غیر ہے،برق تصور سے دل کی دنیا میں جگمگاہٹ پیدا ہوگئی ہے اور میں حیران وششدر ہوکر خود اپنے آپ کو دیکھ رہا ہوں کہ یہ جسمِ خاکی جس کے ذرہ ذرہ میں معصیت کی آمیزش ہے کیسے کیسے مقدس مقامات پر ہوتا ہوا آج جلوہ گاہِ احدیت، سے بھی گذر گیا اور اب اس جگہ پہنچنے والا ہے جو تمام خشکی وتر میں خدائے وحدہ ءلاشریک کا واحد گھر ہے،اور جہاں تجلیات الٰہی کی شب و روز بارش ہوتی ہے۔اللہ اللہ ان پاکیزہ ومطہر مقامات سے گذرنے کے بعد ان کے دربار پر انوار میں حاضری ہوگی،جن کی شان میں وماارسلنک الہ رحمت للعالمین نازل ہوا... ۵۵

ایک جگہ احرام باندھتے وقت حفظ الرحمان نے اپنے دل کے اندر ہلچل ولولہ انگیزی کا اظہار کیا ہے۔بیک وقت تسکین و اضطراب جیسی متضاد کیفیات سے دوچار ہوتا ہے اس سے یقین ،رجائیت اور عبودیت سامنے آتی ہے۔یوں رقمطراز ہوتے ہیں:

> اللہ اللہ کس شان سے مولا کے دیوانے اس کی خدمت میں حاضر ہورہے ہیں ،گناہوں کی مغفرت چاہی جارہی ہے۔وہ سب کی سنتا ہے،یقین کامل ہے کہ میری بھی سنے گا،اور کعبہ

پہنچنے سے پہلے کاتبِ تقدیر نے میری قسمت پلٹنے کا حکم دے دیا ہوگا۔اس وقت کی حالت ہی کچھ اور ہے۔تڑپ بھی ہے اور اضطراب بھی تسکین بھی ہے،راحت بھی۔اسی طرح آنکھوں کا حال ہے کبھی کبھی اشک بار کبھی شرم سار،یہی حال زبان کا ہے،وفور جوش میں بار بار لبیک کی آواز نکلتی ہے۔کون یاد آرہا ہے،کس کس کے لیے دعا نکل رہی ہے یہ عالم الغیب کے علم میں ہے۔۔۔۔۵۶

حج نامہ نگار نے داخلی کیفیت کی ولولہ انگیزی کا اظہار متعدد جگہوں پر کیا ہے۔شوق حرم مصنف کو تڑپاتا ہے اور اس کی کشش حج نامہ نگار کو صبح کے دھند لکے میں مسجد حرام کھینچ لے جاتی ہے۔اس نورانی سحر اور حسین لمحات کی کیفیات میں وفور شوق،جوش عبودیت،منظر کشی کا حسن اور اسلوب کی دل کشی عمدہ طور پر پائی جاتی ہے:

نیند کسے آئی کروٹیں بدل بدل کر اشتیاق میں رات کاٹی،صبح کے دھند لکے میں آنکھیں مل کر بستر سے اٹھا۔وضو کر کے باب امہانی سے حرم محترم میں داخل ہوا۔آسمان پر تاروں کی جھلملاہٹ،کعبۃ اللہ کے چاروں طرف برقی قمقموں کی جگمگاہٹ،نظر میں عجیب خیرگی پیدا کر رہی تھی،جدھر آنکھ اٹھائی جھلک نظر آئی۔مخلوق خدا کا مطاف میں گھومنا،اللہ اکبر کا زور وشور ،دیوانگانِ وحدت کی صدائیں،یہ سب باتیں مجھ جیسے رقیق القلب کے تڑپا دینے کے لیے کافی تھیں۔ ۵۷

اس حج نامہ میں قلبی کیفیات میں والہانہ پن اور وفور جیسی خصوصیات ہیں جو بے ساختگی،شگفتہ ادبی اور تخلیقی نثر میں پیش کی گئی ہیں۔ادب کے ساتھ ساتھ فن کے تقاضوں کو بھی ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے۔مناسک حج کو تفصیل سے بیان کرنے سے حج نامہ کا فنی حسن متاثر ہوا ہے۔

اس عہد کے حج ناموں کا مجموعی جائزہ

اس عہد کے حج ناموں میں معمولی فرق کے ساتھ وہی گذشتہ عہد کے دو بڑے رجحان پائے جاتے ہیں:رہ نمائی اور حجاز کی تہذیب وثقافت اور رسوم و معاشرت کی پیش کش۔اس عہد کے حج نامے مشتملات کے اعتبار سے پرانی روش پر قائم ہیں۔اس عہد کے حج ناموں میں تاریخ کی شمولیت کا رجحان کم پایا جاتا ہے۔ادبی حسن کی آمیزش کا جو سلسلہ گذشتہ صدی کی آخری دہائی میں شروع ہوا تھا اس صدی کے آغاز میں ہی اپنے ارتقاء کی جانب مائل رہا۔اس صدی کے آغاز سے ہی حج ناموں میں فنی خامیوں کے باوجود بالعموم زبان واسلوب کی خوبیاں نمایاں نظر آنے لگتی ہیں جو بتدریج مراحل ارتقا کی جانب گامزن رہیں۔حج نامہ نگار نے اس عہد کے حج ناموں میں خود کو منظر کا جزو بنانے کی کوشش کی ہے۔قلبی واردات و کیفیات خانہء دل سے نکل کر صفحہء قرطاس کی زینت بننے لگے۔تحریریں محض تحریریں نہیں تھی بلکہ ان میں جذبے کی آنچ اور قلبی سوز پایا جاتا تھا۔اس عہد کے

تقریباً ایک تہائی حج نامے روزنامچہ کی شکل میں لکھے گئے ہیں جب کہ پہلے دور میں یہ رجحان بہت کم رہا ہے ۔مکاتیب کی شکل میں بھی حج نامے لکھے گئے ہیں۔اس عہد کا حج نامہ گذشتہ عہد کے مقابلے میں اپنی کمیت میں زائد ہیں۔ادبی شناخت قائم کر لی ہے۔سفر نامہ باقاعدہ حج نامہ کی صنف کے طور پر بن کر ابھرا ہے جس کی بنیاد پر آئندہ حج ناموں نے انفرادیت اور کامیابی کے روشن نقش چھوڑے ہیں۔

اردو حج نامے ------ ۱۹۴۷ء تا حال

اس دور کے چند اہم حج ناموں کا فنی و ادبی مطالعہ

دیار عرب میں چند ماہ (۱۹۵۰ء)

مولانا مسعود علام ندوی ایک جید عالم دین، عربی زبان کے ماہر اور جماعتِ اسلامی کے داعی اور مصنف کی حیثیت سے مشہور ہیں۔آپ مولانا سید سلمان ندوی کے شاگرد ہیں۔آپ نے ۱۹۴۹ء میں یہ سفر حج کیا۔آپ کا سفر نامہ ۱۹۵۰ء میں کراچی سے روزنامہ کی شکل میں شائع ہوا۔حج نامہ میں جگہ جگہ آپ کی محبت و عشق کے نقوش ملتے ہیں۔منظر کا حسن ان کے دل کو لبھا لیتا ہے۔آپ اپنی کیفیات کا اظہار بڑی بے ساختگی اور دل کشی کے ساتھ تحریر کرتے ہیں:

> شام کو قافلہ پھر اپنی رفتار سے چلا، عشاء کے قریب تھوڑی دیر کے لیے ایک جگہ ٹھہراؤ ہوا۔ریت پر ہم سب بے تکلفی کے ساتھ بیٹھ گئے۔سامنے ایک قہوہ خانہ تھا۔جوں جوں مکہ مکرمہ قریب ہوتا جا رہا ہے، ٹھہراؤ کی جگہیں اور چائے خانے بہ کثرت ملنے لگے ہیں۔سب نے اپنے اپنے ذوق کے مطابق قہوہ اور چائے پی۔بڑی خوش گوار رات تھی۔آسمان پر تارے چھٹکے ہوئے، صاف ریت کا فرش، چند منٹوں کے لیے لیٹ بھی گیا۔یہ دن پھر کہاں آنے کے.... ۵۸

آپ نے مناسکِ حج کو پورے جذبے اور عقیدت کے ساتھ پورے کرنے کی کوشش کی ہے۔تمام مشاہدات کو بخوبی قلمبند کیا مگر مشاہدات میں داخلی کیفیات کی بجائے خارجی کیفیات زیادہ نمایاں ہیں۔علاوہ ازیں آپ کی تحریر میں اختصار اور تسلسلِ بیان جیسی خوبیاں نمایاں ہیں:

> صبح ہوئی اور بڑے ارمانوں کی صبح۔آج یوم عرفہ ہے، حج کا خلاصہ اور رکن اعظم۔عرفات کے میدان میں ایک دن کے لیے پوری دنیا بسے گی اور شام ہوتے ہوتے آبادی ختم ہو جائے گی...۵۹

کاروان حجاز (۱۹۵۴ء)

یہ اردو کے ممتاز شاعر معروف ادیب اور مشہور صحافی ماہر القادری کا سفر نامہ حج ہے۔ان کا اصل نام

TH 9369

منظور حسین صدیقی تھا۔ادبی دنیا میں ماہرالقادری کے نام سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ماہرالقادری نے ۱۹۵۴ء میں بیت المقدس کے لیے رختِ سفر باندھا اور اس سفر میں درپیش آنے والے حالات و واقعات کو قرطاس پر اتارا۔آپ کے سفر نامہ حج میں سمندری سفر کے واقعات،مکہ مدینہ کے مشاہدات ،داخلی اور خارجی کیفیات کے ساتھ ساتھ حجاز کی معاشی ،ثقافتی ،جغرافیائی اور سیاسی صورتحال کا بھی ذکر ملتا ہے ۔ماہرالقادری کے سفر نامہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے اندر حرمِ پاک کی زیارت کے حوالے سے ایک دیرینہ اور شدید خواہش پائی جاتی تھی ۔یوں محسوس ہوتا ہے سرزمینِ مکہ و مدینہ آپ کی منزلِ مقصود ہے۔یہی وجہ ہے کہ جب آپ سر زمینِ مکہ پر اپنا پہلا قدم رکھتے ہے اورتو آپ ایک عظیم جذبے سے سرشار ہوتے ہیں ۔اپنی اس داخلی کیفیات کا اظہاران الفاظ میں کرتے ہیں :

> انتظار کا یہ وقت بھی کسی نہ کسی طرح گذر ہی گیا ۔تین بجے ہمارا جہاز ساحل پر جالگا اور کوئی آدھے گھنٹے کے بعد ہم جہاز سے اتر کر موٹر بس میں سوار ہو گئے ۔سر زمین حجاز پر پہلے قدم رکھتے ہی ایسا محسوس ہوا کہ ہم مسافر اور غریب الوطن کاہے کو ہیں۔اللہ تعالی نے مدت کے بعد اپنے اصلی وطن میں ہم آوارگانِ غربت کو پہنچا دیا ہے۔یہاں کی ایک ایک چیز پر تنقید نہیں،محبت آمیز نگاہیں پڑ رہی ہیں۔ ٦٠

کاروانِ حجاز کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ماہر القادری ایک سچے عاشقِ رسول ہیں۔جو محبوبِ کبریا کے آستانے پر لفظوں کی بجائے آنسوؤں سے گفتگو کرتا ہے۔محبوبِ کبریا کی چوکھٹ پر حاضری دیتے ہوئے وہ حالتِ غیر کا شکار ہوتے نظر آتے ہیں۔اور اس کیفیات کو الفاظ کا پیرہن پہنا کر سپردِ قرطاس کرتے ہیں۔ان کیفیات کا اظہار آپ کی اس تحریر میں نمایاں نظر آتا ہے:

> لیجیے حدودِ حرم سے بھی کچھ آگے نکل آئے ۔تلبیہ پڑھتے میں آنکھیں بھی زبانِ اشک سے لے میں لے ملا رہی ہیں۔مکہ کے قریب کے میدان اور پہاڑیوں کو دیکھ کر بار بار یہ خیال آرہا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ ادھر سے ضرور گزرے ہوں گے۔کیا عجب ہے ان وادیوں میں سرکار ﷺ نے بکریاں بھی چرائی ہوں۔نہ جانے اس سرزمین کے کون کون سے قطعے ہیں جو حضور ﷺ کی پابوسی کے شرف کو اپنی جبینوں اور سینوں میں محفوظ کیے ہوئے ہیں۔ ٦١

انھوں نے کاروانِ حجاز کے لیے جس اسلوب کا انتخاب کیا ہے اس میں عقیدت ومحبت کا جذبہ نمایاں نظر آتا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ شگفتہ نثر،سلیس اور آسان لہجہ،زبان و بیاں کی سادگی آپ کی نثر کا خاصا ہے ۔یہی انداز آپ کو دیگر سفر نامہ نگاروں سے ممتاز کرتا ہے۔

میاں کی اٹریا تلے (۱۹۷۲ء)

محمد ذاکر علی خان میاں کی اٹریا تلے کے مصنف ہیں۔ مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز اسوسی ایشن سے وابستہ ہیں۔ محمد ذاکر علی خان نے حدیث حرم، سرحبا الحاج اور میاں کی اٹریا تلے کے نام سے حج نامے لکھے ہیں۔ لیکن ان کا مشہور حج نامہ مؤخر الذکر ہے۔ ۱۹۷۲ء میں اس کی اشاعت ہوئی۔ ان کی تحریر میں شوخی کے بہت گہرے اثرات پائے جاتے ہیں۔ چند الفاظ کو مخصوص معانی میں بہت کامیابی کے ساتھ استعمال کیا ہے جو مصنف کی ندرت فکر کا عکس ہے درج ذیل سطور میں یہ چیز واضح ہے:

> میاں نے اپنی اس پیاری اٹریا میں ڈیوڑھی بھی کیسی حسین لگائی ہے۔ جس کی چوکھٹ آکاش کو چھوتی ہے، لیکن پھر بھی میاں کے دیوانوں کی پیشانیاں اس کو چھوئے بغیر نہیں ٹلتیں۔ واقعی میاں اگر تمہاری یہ اٹریا بھی آسمانوں پر ہوتی تو نہ جانے کتنے دیوانوں کے سر اس چوکھٹ پر لگنے سے محروم رہ جاتے اور بڑے ہی بڑے تم تک پہنچ پاتے... ۶۲

مصنف نے اپنے حج نامہ میں جدائی کے وقت کیفیات اور جذبات کو قلم بند کرنے کی کوشش کی ہے۔ جس میں جذبہ و شدت پائی جاتی ہے:

> .... اس چند روز قیام میں پیار محبت کی تمام منزلیں اس طرح طے ہو جاتی ہیں کہ محسوس یہ ہوتا ہے جیسے ہم نے آنکھ ہی اس سرزمین میں کھولی ہے اور اس اٹریا کے سائے تلے ہی گھوم گھوم کر جوان ہوئے، پروان چڑھے۔ لہذا اس کی عارضی جدائی بھی گوارا کرنے کی ہمت نہیں پاتے، دم واپسیں کے خیال سے ہی دم گھٹ گھٹ جاتا ہے اور وداع کے اس تصور سے قلب شدت جذبات سے اس قدر بھر آتا ہے کہ اٹریا کی طرف دیکھتے ہی آنکھوں کے پیمانے چھلک اٹھتے ہیں.... ۶۳

ان کے سفر نامہ سے منظوم جذبات کا اظہار بھی ملتا ہے۔ کچھ اشعار بطورِ مثال پیش کیے جا رہے ہیں:

منور ہر سحر روشن ہر اک شام
یہ دنیا تو نہیں خلد بریں ہے
نوازے گا کوئی کیا اس سے بڑھ کر
خود اس کا سنگِ در اور یہ جبیں ہے
ترا احسان پھر تونے بلایا!
کہاں ہم اور کہاں یہ سر زمین ہے ۶۴

محمد ذاکر علی خان کا یہ حج نامہ خیال و اسلوب کی جدت و ندرت کی وجہ سے ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے۔

ان کی تحریر میں عشق و محبت اور جذبہ نمایاں ہے اور اس اظہار کے لیے اسلوب میں شوخی کا استعمال کیا گیا ہے۔اس حج نامہ کی خصوصیت جدت و ندرت، انوکھا پن، البیلا اسلوب اور بے ساختگی ہیں۔

خیموں کے شہر میں (۱۹۹۸ء)

حج نامہ خیموں کے شہر میں کی مصنفہ صادقہ ذکی ہیں۔یہ حج نامہ ۱۹۹۸ء میں شائع ہوا۔یہ حج نامہ اپنے مشتملات اور زبان و اسلوب کے اعتبار سے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔اس میں حج نامہ احساس کی شدت اور تخیل کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔مشاہدات کو ٹھوس اور منجھی ہوئی زبان و اسلوب میں پیش کیا گیا ہے۔تحریر میں شگفتگی اور سلیقگی کا حسن نمایاں ہے۔مشاہدات اور کیفیات کو داخلی اور خارجی طور پر بڑی کامیابی سے پیش کیا گیا ہے۔مصنفہ کا جمالیاتی شوق واضح نظر آتا ہے۔درج ذیل اقتباس میں بھی جمالیاتی اور روحانی لطف اندوزی کی کامیاب کوشش کی گئی ہے:

> .... اس وقت تک خیموں کا شہر اجڑ چکا تھا۔کہیں کہیں اب بھی خالی دریاں پڑی ہوئی تھیں، جو پورے دن کی اسلامی رونقوں کی داستان بیان کر رہی تھی۔اچانک ایک بس سامنے آئی اور ہم سب لوگ دوڑ کر اس میں سوار ہو گئے۔نیم کے قطار بند درخت بڑے قرینے سے خاموش کھڑے تھے۔شاید یہ روشیں فضا کی خنکی اور نمی میں اضافہ کا سبب تھیں۔قرب و جوار کے اندھیروں، اجالوں میں پہاڑی ٹیلوں کے بیچ وسیع ترین رقبہ پر پھیلی ہوئی مسجد نمرہ کے بلند سبک اور پر وقار میناروں کے حسن کی شعاعیں دور تک محسوس ہوتی رہیں۔۶۵

اس حج نامہ میں نسائی اور معاشرتی رویوں کی جھلک بھی موجود ہے۔درج ذیل اقتباس میں نسائی جذبوں کا اظہار کیا گیا ہے:

> ....ان عمارتوں کے زیر سایہ نسبتاً چھوٹی دکانوں اور پٹریوں کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔جن میں دنیا بھر کا سامان ابلا پڑتا ہے۔یہ بازار چوبیس گھنٹے کھلے رہتے ہیں۔حرم شریف جاتے ہوئے نگاہ اکثر ان سے الجھ جاتی ہے۔ذوق بھی اپنی تسکین چاہتا ہے اور پرس میں پڑے ہوئے کچھ ریال بھی کلبلانے لگتے ہیں۔لیکن اف کعبۃ اللہ کی کشش ہی کچھ ایسی ہے کہ ان تمام رنگینیوں سے گذرتے ہوئے چہرہ پیچھے کی طرف اور قدم آگے کی طرف بڑھتے چلے جاتے ہیں....۶۶

لا شریک (۱۹۹۹ء)

لا شریک کے مصنف محمد قیوم جو کہ پیشہ کے اعتبار سے ایک بیوروکریٹ تھے۔اس سفر نامہ کی دورانِ

اشاعت وہ پاکستان کے ضلع چکوال بطور اسسٹنٹ کمشنر کا سرانجام دے رہے تھے۔ لاشریک ۱۹۹۹ء میں لاہور سے شائع ہوا۔ اس سفر نامہ میں مصنف نے اپنی داخلی کیفیات کو بکثرت و خوبی تحریر کیا ہے۔ بعض جگہوں پر ایسی تحریریں بھی دیکھنے کو ملتی ہیں جو حج کے اسلوبِ بیان سے الگ اور اس کے مزاج سے مختلف ہیں۔ اس کے باوجود آپ کی تحریر جذبہ وعقیدت سے اور داخلی کیفیات سے بھری ہوئی ہے جو بخوبی بیان کی گئی ہیں۔ درج ذیل اقتباس میں بھی مصنف کا اظہارِ تطہیر اور لذت و سرور کی کیفیت نمایاں نظر آتی ہے:

> ہم دیوانہ وار مرکزِ توحید و رحمت بیت اللہ کی طرف دوڑے۔ حجر اسود کے سامنے پہنچ کر طواف کے جوہری عمل میں شریک ہو گئے، جیسے جیسے قدم بڑھتے گئے جسمانی کثافتیں کم سے کم تر ہوتی گئیں۔ یوں لگا جیسے اس گھر کے مالک نے ہمیں کسی چھلنی سے چھان کر لطیف تر کر دیا ہو۔ ہمارے قدم خود تیز سے تیز ہونے لگے، ان وجد آفریں لمحوں میں جس کیفیت اور جس سرور سے شاد کام ہوئے وہ بیان سے باہر ہے۔ ۶۷

درج ذیل اقتباس میں مصنف حضرت بلال حبشی سے اپنی محبت وعقیدت کا اظہار والہانہ انداز میں کیا ہے۔ ان کے دل میں یہ محبت سفرِ حج کے دوران ایک حبشی سے مل کر آگ پکڑتی ہے اور سفر نامہ نگار اپنے جذبات کا اظہار کیے بنا نہ رہ سکا:

> .... میں نے ممنونانہ انداز میں دریافت کیا کہ 'یا اخی آپ کون ہیں اور آپ کا وطن کونسا ہے، اس نے مسکراتے چہرے سے کہا: الحمد للہ میں اولادِ بلالِ حبشی میں سے ہوں'۔ یہ سننا تھا کہ فرطِ جذبات سے مغلوب ہو کر میں نے ان کے چہرے آنکھ، پیشانی اور ہاتھوں پر بے اختیار بوسے دیے، ان سے معانقہ کیا اور تادیر ان سے لپٹا بلکہ چمٹا رہا اور مشام جان و بلال حبشی کی خوشبو سے معطر کرتا رہا۔ نجانے کتنی دیر یہ کیفیت رہی۔ وہ صاحب میری دیوانگی پر حیران تھے۔ اس واقعہ کے بعد میرا دل کسی بات میں نہ لگا۔ میں نے بیت اللہ کو استلام کیا اور حرم کے باہر آ گیا۔ میں چاروں طرف نظر دوڑائی۔ بلند و بالا عمارتوں کو دیکھ کر سوچنے لگا۔ انھی عمارتوں کے نیچے وہ گرم ریگ تہہ در تہہ بچھی ہوئی ہوگی جس پر امیہ بن خلف بلال حبشی کو لٹا کر سینے کے اوپر پتھر کی بھاری سل رکھ دیا کرتا تھا اور کہتا تھا کہ خدا کو ایک ماننے سے باز آتے ہو کہ نہیں۔ بلال اپنی ہکلائی ہوئی زبان سے کہتے 'احد ہے احد ۶۸

داخلی اور خارجی کیفیات سے بھرپور یہ سفر نامہ عمدہ تشبیہات واستعارات سے مالا مال ہے۔ نیز اس سفر نامہ کی سلیس رواں اور اس میں شگفتگی پائی جاتی ہے۔ قلبی واردات اپنے اندر سمیٹے ہوئے یہ سفر نامہ کہیں کہیں طنز و مزاح کا عکس بھی پیش کرتا ہے جو قاری کے لیے دلچسپی کا باعث بنتا ہے۔

جلال و جمال (۲۰۰۰ء)

ممتاز چٹھ جلال و جمال کی مصنفہ کا تعلق پاکستان کے موضع مندرانوالہ سے ہے۔آپ اشاعتِ حج نامہ کے دوران ایک کالج میں پروفیسر تھیں۔یہ سفر نامہ ۲۰۰۰ء میں شائع ہوا۔زبان دانی اور طرزِ اظہار کے لحاظ سے جدید حج ناموں میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔مصنفہ نے سفرِ حج کو والہانہ انداز میں اختیار کیا ہے۔یہ سفر نامہ خاص وجد اور سرشاری کی کیفیت میں تحریر کیا گیا ہے۔شگفتگی اور بے ساختی اس سفر نامے میں بکثرت پائی جاتی ہے۔درج ذیل اقتباس میں مصنفہ کے محسوسات میں شدت اور انکی حیرت اور تجسس واضح طور پر نمایاں ہیں اور انکی داخلی کیفیات کا عکس دیکھا جا سکتا ہے:

> ... اب قبلہ رخ ہوئے تو بیت الحرام سامنے تھا۔یہاں سے بیت الحرام کی طرف نظریں ٹکا کر دیکھنا ہم سے کبھی نہ ہوسکا۔اس بقعہ ءنور کی طرف جب بھی آنکھیں اٹھیں،ایک لمحہ میں جھک گئیں۔واللہ اعلم اس رنگ ونور کے گھر میں کیا چیز تھی۔یہ نور کیسا نور تھا۔یہ حسن الہی کا پرتو تھا،یا گھر والے کا عکسِ جمیل۔میں آج تک اس گتھی کو سلجھا نہیں سکی.... ۶۹

ایک اور اقتباس اس سفر نامہ سے بطور مثال پیش کیا جا رہا ہے جس میں مصنفہ کی خوشی اور اسکی اندرونی کیفیات کو دیکھا جا سکتا ہے جوانہوں نے اچھے اسلوب کے ساتھ شگفتگی کو برقرار رکھتے ہوئے پیش کیا ہے:

> کنکریوں کا چننا بھی ایک دل فریب اور روح انگیز مشغلہ تھا۔یہ کنکریاں کوہ طور کے کنکروں سے کم نہ تھیں۔تھکے تھکے چہرے،تکمیل حج کی بے پایاں مسرت،ہر ایک چہرے سے ہویدا تھی۔تکمیل حج کا الوہی جذبہ،سنت نبوی کی ادائیگی،نہاں خانہ ءدل میں ان حسین و سرمست جذبوں نے ہلچل مچا رکھی تھی۔خدا کی رضا جوئی اور عظیم تر پیغمبر کی عطا جوئی،اسی ارفع جذبہ نے ہر کسی کو وجدانی کیفیت سے دوچار کر دیا تھا۔ ۷۰

ممتاز چٹھہ نے اس سفر نامہ کو بڑے وجد و حال کے ساتھ تحریر کیا ہے۔ وہ بے شمار مقامات پر قلبی کیفیات سے دوچار ہوئے اور انہیں نہایت احسن انداز میں قلمبند کیا۔ان کی تحریر ونثر میں استعارات کا استعمال حسبِ ضرورت دیکھنے کو ملتا ہے،احساس کی شدت،محاسبہ ذات،محبتِ رسول کا والہانہ اظہار،تاریخی مقامات کا احوال ومشاہدات ممتاز چٹھہ کے سفر نامہ کو خوبصورت اور مؤثر بناتے ہیں۔

اس عہد کے اردو حج ناموں کا مجموعی تجزیہ

اس عہد کے حج ناموں نے فن وادب ترقی کے اعلی مدارج طے کئے ہیں۔فنی وادبی اعتبار سے اس عہد کے حج نامے ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔اس عہد کے حج ناموں نے قدیم طرز سے انحراف کرتے ہوئے فنی وادبی

طور پر نئی اور بہت مستحکم شناخت قائم کی ہے۔حج نامہ نگاروں نے حج ناموں کو حشو زائد سے پاک کیا ہے اور تحریر میں ترتیب، توازن اور اعتدال کا خیال رکھا ہے۔چنانچہ اس عہد کا حج نامہ اہم حیثیت اختیار کر گیا ہے۔شوق و دلچسپی سے پڑھا جانے لگا ہے۔عام سفر ناموں کے علاوہ حج کے سفر نامے بھی تیزی سے اور بحیثیت صنف لکھے جانے لگے ہیں۔مطبوعہ حج ناموں کی خاصی تعداد نظر آنے لگی ہے۔مطبوعہ حج نامے اس لحاظ سے بھی اہمیت کے حامل ہیں کہ ان کے قارئین کی تعداد کافی ہے۔لوگ انھیں پڑھتے ہیں اور ایک دوسرے کو اس کے بارے میں بتاتے ہیں۔ان حج ناموں میں قارئین کی دلچسپی کی ایک بڑی وجہ مذہبی لگاؤ ہے۔لوگ مذہب کے معاملے میں خاصے عقیدت مند اور پر جوش ہوتے ہیں۔اسی عقیدت اور جوش کی وجہ سے وہ ایسے سفر ناموں میں دلچسپی کا اظہار کرتے ہیں، مصنف کے جذبات اور قارئین کے احساسات ایک نہج پر پہنچ کر ایک دوسرے سے ملنے لگتے ہیں۔قلبی اثرات کے ساتھ ساتھ ان حج ناموں میں موجود زبان و بیان اپنے پڑھنے والوں کے ذہنوں میں اترتا جاتا ہے۔

ابنِ بطوطہ بطور سیاح پہلے سفر کے احوال لکھا کرتا تھا، لیکن جب اس نے حج کے سفر کو تحریری شکل دی تو اس کا انداز اور ہو گیا۔اسی طرح شیخ عبدالحق محدث دہلوی جیسے ماہر مصنف نے بھی اپنے قلب کی کیفیات تحریر کیں۔مصطفیٰ خان شیفتہ جیسے شاعر اور ادیب نے جب اس موضوع پر قلم اٹھایا تو اس دور کے قارئین ضرور اس طرف متوجہ ہوئے۔انھیں عرب کے سفر اور مقدس مقامات کی زیارتوں کا احوال ان سفر ناموں سے معلوم ہونے لگا۔لوگوں کا مطالعاتی کینوس وسیع ہونے لگا۔سب سے بڑی بات یہ کہ ان مقامات پر جانا لوگوں کی پہلی اور آخری خواہش ہوتی ہے، اور ان جگہوں کے بارے میں معلوماتی اور جذباتی تحریر کو پڑھنا ان کے لیے ایک نعمت سے کم نہ تھا۔اُس دور میں برصغیر میں عربی اور فارسی زبانیں بھی بولی، پڑھی اور سمجھی جاتی ہیں۔لہٰذا ان زبانوں میں شائع شدہ حج نامے بھی قبول عام کی سند حاصل کرنے لگے۔کچھ حج نامہ نگاروں نے پیدل سفر کر کے یہ سعادت حاصل کی تھی، ایسے سفر کے حالات اور بھی دلچسپی کا باعث تھے۔ان سفروں کے دوران میں دکھائی دینے والے عجیب و غریب مناظر پیش آئے، دلچسپ واقعات اور قریہ قریہ، شہر شہر ملنے والے بھانت بھانت کے انسان قارئین کے لیے حیرت انگیز معلومات کا باعث تھے۔

عرفان علی بیگ اور نواب عمر علی خان جیسے مؤلفین نہ صرف جغرافیائی حالات پر لکھا بلکہ عہدِ صحابہ سے لے کر عہدِ حاضر تک کے حکام کے اقوال نقل کیے۔ان کے ادوار کے بارے میں مختصراً بیان کیا۔یہ سفر نامے محض مؤلف کے ذاتی حالات اور نقطہ ہائے نگاہ کی وضاحت ہی نہیں کرتے بلکہ نئے عازمین حج کے لیے ایک گائیڈ کا کام بھی کرتے ہیں۔جن لوگوں نے حج پر جانا ہوتا ہے ان کو ان سفر ناموں سے بدرجہ معلومات مل جاتی ہیں جو ان کی رہنمائی اور ہدایت کا کام کرتی ہیں۔

خطیب قادر بادشاہ اور محترمہ امۃ الغنی نور النساء جیسے شاعر اور مصنفین نے جب حج نامے لکھے تو ان میں منظوم اظہارِ عقیدت بھی کیا۔ یہ خوبصورت انداز ادب کے دلدادہ خواتین و حضرات کو بہت بھایا اور باذوق قارئین میں بے حد مقبول ہوا۔ خواتین حج نامہ نگاروں کے حالات و واقعات پڑھنے سے حج پر جانے والی خواتین کو بطور خاتون عازمِ حج پیش آنے والے حالات کے بارے میں بھرپور معلومات حاصل ہو جاتی ہیں۔ راحیل شیروانیہ کا حج نامہ زاد السبیل اس سلسلے کی اہم کڑی ہے۔

۱۹۴۷ء سے قبل کے حج ناموں میں رہنمائی کے ساتھ ساتھ حجاز کی تہذیب و معاشرت اور رسوم و رواج کا بکثرت ذکر ملتا ہے۔ اگرچہ ان حج ناموں میں زبان و بیان کی کچھ کوتاہیاں موجود ہیں لیکن اپنی اثر آفرینی میں یہ حج نامے کسی طرح بھی کم نہیں۔

۱۹۴۷ء کے بعد کے حج ناموں میں جذبات کی شدت اور قلبی کیفیات بدرجۂ اُتم پائی جاتی ہیں۔ ماہرالقادری کا سفرنامۂ حج کاروانِ حجاز اس سلسلے میں بہت اہمیت کا حامل ہے۔ وہ اپنے مقدس سفر کے مناظر کو آنسوؤں کی زبان سے بیان کرتے ہیں اور قاری کو بھی آبدیدہ کر دیتے ہیں۔ محمد ذاکر علی خان کے حج نامہ میاں کی اٹریا تلے میں اپنے رب سے لاڈ پیار کرتے ہوئے حج کے مناسک ادا کرنے کا ذکر ہے۔ یہ ایسے حج نامے ہیں جن کے مصنفین نے الگ ہی انداز اختیار کیا اور اپنے اس انداز کو ایک روایت کی شکل دی۔

بیوروکریٹس، وکلاء، پروفیسرز، زبان دان، شعراء، ادیب، رئیس، عام مسلمان اور خواتین کی زبان مختلف انواع کے خیالات اور نظریات ان حج کے سفرناموں کی زینت بنے۔ ہر مکتبۂ فکر اور شعبۂ زندگی سے تعلق رکھنے والے لوگ کیسا سوچتے ہیں، کیسی عقیدت رکھتے ہیں، ان کی قلبی کیفیات کیسے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ مقدس مقامات پر پہنچ کر ان کی جذباتی کیفیت کیا ہوتی ہے۔ مناسکِ حج ادا کرتے وقت ان کے ساتھ کیا واقعات پیش آتے ہیں، ان کی ملاقات کیسے کیسے لوگوں سے ہوتی ہے۔ ان سب چیزوں کو بیان کرنے کے سب مصنفین کے اپنے اپنے انداز ہیں۔ ان حج ناموں کی اشاعت سے جہاں قارئین نے حظ اٹھایا، وہاں تبصرہ نگاروں اور تجزیہ کاروں نے ان کے بارے میں بہت کچھ لکھا۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو یہ سفرنامے اردو ادب میں بہت خوبصورت اور اعلیٰ ہیں۔ یہ مسلمانوں کی زندگی کی اہم ترین مذہبی عبادت حج جیسے اہم موضوع پر سیر حاصل معلومات فراہم کرتے ہیں۔ لوگوں کی رہنمائی کرتے ہیں۔ ان کے اس مقدس مذہبی فریضے سے کما حقہٗ آگاہی دیتے ہیں۔ مصنفین اپنے نقطۂ نظر بیان کرتے ہیں۔ حج کے جدید سفرنامے حشو و زوائد سے پاک ہیں۔ ان میں ترتیب، توازن اور اعتدال موجود ہے۔ زبان کی صحت کا خیال اور ادب سے وابستگی ان حج ناموں کا نمایاں پہلو ہے۔

حوالہ جات

۱۔ نورالحسن نیر، مولوی، نوراللغات، نیر پریس لکھنو، ۱۳۴۷ھ، ج:۳

۲۔ سید احمد دہلوی، مولوی، فرہنگ آصفیہ، اردو سائنس بورڈ، لاہور، ۱۹۸۷ء، جلد ۳،۴

۳۔ لویس معلوف، ''المنجد''، المکتبۃ الکاثولیکیۃ، بیروت، ت۔ن۔ مادہ رحل

۴۔ فیروز الدین، مولوی جامع فیروز اللغات، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۱ء

۵۔ ایضاً

۶۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، قومی انگریزی اردو لغت، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، س ن، جلد ۲

۷۔ عبد الحق، ڈاکٹر، The Standard English, Urdu Dictionary، انجمن ترقی اُردو، نئی دہلی، ۲۰۰۱ء

8. Webester's Third International Dictionary, Massashusetts, U.S.A, Vol.II, p.2433

9. The Oxford English Dictionary, p.445

10. Webester's Third International Dictionary, p.2433

۱۱۔ قدسیہ قریشی، ڈاکٹر، اردو سفر نامے۔انیسویں صدی میں، مکتبہ جامع لمیٹڈ، نئی دہلی، ۱۸۹۷ا، ص:۴۹

۱۲۔ خالد محمود، ڈاکٹر، اُردو سفر ناموں کا تنقیدی مطالعہ، نئی دہلی، ۱۹۹۵ا، ص:۲۲

۱۳۔ انور سدید، ڈاکٹر، اُردو ادب میں سفر نامہ، ص:۵۹

۱۴۔ ایضاً، ص:۶۵

۱۵۔ مختار الدین احمد، پروفیسر، نشاط آبلہ پائی، از اطہر صدیقی (فلیپ)، علی گڑھ ہیریٹیج پبلی کیشنز، علی گڑھ، ۲۰۰۷ء

۱۶۔ قدسیہ قریشی، ڈاکٹر، اردو سفر نامے۔انیسویں صدی میں، مکتبہ جامع لمٹیڈ، نئی دہلی، ۱۸۹۷ا، ص:۵۴

۱۷۔ شوکت علی شاہ، پہنچے تیرے حضور، زینہ علم وادب، لاہور، ۲۰۰۲، ص:۱۹

۱۸۔ محمد ذاکر علی خان، میاں کی اٹریا تلے، کراچی، ص:۷

۱۹۔ ناصر خسرو، حکیم محمد عبدالرزاق کان پوری، (مترجم): سفر نامہ حکیم ناصر خسرو، انجمن ترقی اردو، دہلی، ۱۹۴۱ء، ص: ۲۴،۲۵

۲۰۔ ابن بطوطہ، مولانا عطا الرحمان (مترجم)، عجائب الاسفات، رحمانی پریس، دہلی، ۱۹۴۹، ص: ۱۹۵

۲۱۔ عبدالحق محدث دہلوی، حکیم سید عرفان علی (مترجم)، دیـــار المـــحبـــوب، تاج کمپنی، دہلی، ۱۹۸۴ء، ص: ۲۵۱

۲۲۔ محمد مصطفیٰ خان شیفتہ، سید زین العابدین (مترجم): ســـراج مـــنیـــر، مطبع آگرہ اخبار، آگرہ، ۱۹۱۰ء، ص: ۵۸

۲۳۔ نواب سکندر بیگم، یادداشت تاریخ و قائع حج (قلمی)، مخزونہ: رام پور رضا لائبریری، رام پور، ص: ۳۹

۲۴۔ منصب علی خان، ماہ عرب المعروف بہ کعبہ نما، میرٹھ، مطبع محبّ کشور ہند، ۱۲۸۸ھ/۱۸۷۱ء، ص: ۵۹

۲۵۔ ایضاً، ص: ۸۴،۸۵

۲۶۔ ایضاً، ص: ۳۲

۲۷۔ ایضاً، ص: ۴۹

۲۸۔ ایضاً۔ ص: ۱۲۱

۲۹۔ ایضاً۔ ص: ۱۱۰

۳۰۔ تجمل حسین، سراج الحرمین، بریلی، مطبع صدیقی، ۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳ء، ص: ۷۲،۷۳

۳۱۔ ایضاً، ص: ۹۲،۹۳

۳۲۔ ایضاً، ص: ۱۰۷

۳۳۔ علیم الدین، رسالۂ حج، لکھنو، نامی پریس، ۱۸۹۲ء، ص: ۴۲

۳۴۔ ایضاً، ص: ۷۲

۳۵۔ سید دلاور علی، سیاحت الحرمین، بزیارت الثقلین، حیدرآباد، مطبع عزیز دکن، ت ن، ص: ۲۰۱

۳۶۔ ایضاً، ص: ۹۳

۳۷۔ محمد حفیظ اللہ، سفر نامۂ عرب، پٹنہ، مع احمدی، ۱۳۱۲ھ/۹۵-۱۸۹۴ء، ص: ۱۸

۳۸۔ ایضاً، ص:۸۹،۹۰

۳۹۔ عرفان علی بیگ،مرزا،سفر نامہ ء حجاز،لکھنو،مطبع منشی نول کشور،۱۸۹۵ء،ص:۷۸

۴۰۔ ایضاً،ص:۲۷۰

۴۱۔ محمد عمر علی خان،زادِ غریب،میرٹھ،مطبع گلزار محمدی،۱۳۱۳ھ/۹۶۔۱۸۹۵ء،ص:۱۴

۴۲۔ ایضاً،ص:۱۹

۴۳۔ احمد حسین خان،نواب،سفر نامہ ء حجاز و مصر،دہلی،کرزن اسٹیم پریس،۱۹۰۴ء،ص:۱۱۶

۴۴۔ ایضاً،ص:۱۳۳

۴۵۔ خطیب قادر بادشاہ،سفر حجاز،مدارس،مطبع نامی،۱۳۴۵ھ/۲۷۔۱۹۲۶ء،طبع دوم،ص:۹

۴۶۔ امۃ الغنی نورالنساء،مرتبہ:حسن جہاں،سفر نامہ ء حجاز،شام و مصر،حیدرآباد،ورڈ ماسٹر کمپیوٹر پبلی کیشنز سینٹر،۱۹۹۶ء،ص:۹،۱۰

۴۷۔ ایضاً،ص:۴۱

۴۸۔ ایضاً،ص:۴۱،۴۲

۴۹۔ خدادادخان،پا پیادہ حج خدا داد،مرادآباد،مصنف،ت ن،ص:۱

۵۰۔ ایضاً،ص:۳۳،۳۴

۵۱۔ ایضاً،ص:۲۰

۵۲۔ راحیل شیروانیہ،زادالسبیل،مقام اشاعت و مطبع نامعلوم،ت ن،ص:۴۴

۵۳۔ ایضاً،ص:۱۰۷،۱۰۸

۵۴۔ ایضاً،ص:۸۴

۵۵۔ محمد حفظ الرحمٰن وفا ڈبائیوی،راہ وفا،علی گڑھ،مسلم یونیورسٹی پریس،۱۹۳۸ء/۱۳۵۷ھ،ص:۲۱۲،۲۱۳

۵۶۔ ایضاً،ص:۲۴۷

۵۷۔ ایضاً،ص:۲۶۶،۲۶۷

۵۸۔ مسعود احمد ندوی،مولانا،دیارِ عرب میں چند ماہ،کراچی،مکتبہ ء چراغ راہ،۱۹۵۰ء،ص:۲۲۷۔۲۲۸

۵۹۔ ایضاً،ص:۲۶۶

۶۰۔ ماہر القادری، کاروان حجاز،نئی دہلی،مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز،۲۰۰۳ء،ص:۲۷

۶۱۔ ایضاً،ص:۳۶

۶۲۔ محمد ذاکر علی خان،میاں کی اٹریا تلے،کراچی،انٹرنیشنل پریس،۱۹۷۲ء،ص:۱۷،۱۸

۶۳۔ ایضاً،ص:۴۸

۶۴۔ ایضاً،ص:۱۵،۱۶

۶۵۔ صادقہ ذکی،خیموں کے شہر میں،نئی دہلی،مصنفہ،۱۹۹۸ء،ص:۱۳

۶۶۔ ایضاً،ص:۱۹

۶۷۔ محمد قیوم اعوان،لاشریک،لاہور،ساگر پبلشرز،۱۹۹۹ء،ص:۷۲،۷۳

۶۸۔ ایضاً،ص:۶۹

۶۹۔ پروفیسر ممتاز چٹھہ،جلال و جمال،لاہور،ابلاغ پبلی کیشنز،۲۰۰۳ء،ص:۲۲۹،۲۳۰

۷۰۔ ایضاً،ص:۲۸۴

باب دوم

ممتاز مفتی اور مستنصر حسین تارڑ کا فن سفر نامہ نگاری

ممتاز مفتی۔احوال

ممتاز مفتی اردو ادب کی بہت قد آور شخصیت ہیں۔ان کے لکھنے کا اسلوب ایسا ہے کہ قاری کو ان کی تحریر میں نہ صرف فن کے جوہر دکھائی دیتے ہیں بلکہ وہ جس صنف میں بھی کام کریں اس صنف کو ایک نئی معنویت اور گہرائی عطا کر دیتے ہیں۔ممتاز مفتی نے بہت سی اصنافِ ادب میں کام کیا۔جس طرح ہر عظیم فن کار اپنے فن کی تکنیک اور ہیئت کو خود وضع کرتا ہے۔ممتاز مفتی نے بھی ایسا ہی کیا۔ان کے فن سفر نامہ نگاری پر بحث کرنے سے قبل ان کے بارے میں جاننا ضروری ہے۔

ممتاز مفتی ہندوستان کے شہر بٹالہ کے محلّہ مفتیاں میں پیدا ہوئے ۔وہ 11 ستمبر 1905ء کی ایک خوشگوار صبح تھی۔جب مفتی محمد حسین کی پہلی بیوی صغرا بیگم کے ہاں پہلا بیٹا پیدا ہوا جب کہ پہلے ایک بیٹی موجود تھی۔اس نومولود بیٹے کا نام ممتاز حسین رکھا گیا۔ننھیال والوں نے اس کا نام مقبول حسین رکھا۔اس لیے گھر میں انہیں مقبول حسین کے حوالے سے ''بولی'' کہہ کر پکارا جانے لگا۔ان کی خودنوشت ''علی پور کا ایلی'' میں انہوں نے اپنا نام ''ایلی'' اسی مناسبت سے تجویز کیا۔ممتاز مفتی کے والد مفتی محمد حسین ایک رنگین مزاج آدمی تھے۔لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ لکھنے لکھانے کا شوق بھی رکھتے تھے۔

ان کے اسی شوق نے ممتاز مفتی میں بھی لکھنے کا شوق پیدا کر دیا۔ممتاز مفتی کے والد، مفتی محمد حسین اپنے کمرے میں بیٹھ کر ایک رجسٹر پر لکھا کرتے تھے۔ان کے کمرے میں تین تپائیاں دھری ہوتی تھیں۔جن میں سے ایک پر رجسٹر، دوسری پر ریڈیو اور تیسری پر امتحانی نلیاں وغیرہ ہوتیں۔

مفتی محمد حسین نے چار شادیاں کر رکھی تھیں۔مفتی صاحب سب سے پہلی بیوی کی اولاد تھے۔وہ اپنے والد کی عورتوں میں غیر معمولی دلچسپی سے بیزار تھے۔اور ان کی اس عادت کے شاکی تھے۔لیکن ساتھ ہی وہ اپنے والد کی طبیعت کی رنگینی، خوش مزاجی، اور بذلہ سنجی جیسے اوصاف سے متاثر بھی تھے۔

ممتاز مفتی کے ہاں نفسیات سے دلچسپی اور جنس کی طرف رجحان اسی وجہ سے ملتا ہے کہ ان کی شخصیت پر ان کے والد کی بڑی چھاپ تھی۔والد صاحب کے برعکس ان کی والدہ صغرا بیگم ایک دیندار، اعلیٰ اوصاف رکھنے والی، صوفیانہ مزاج کی خاتون تھیں۔انہوں نے بٹالہ میں لڑکیوں کا مدرسہ کھول رکھا تھا۔جہاں شہر کی لڑکیوں کے لیے تعلیم اور تربیت کا انتظام کرتی تھیں۔محکمہ تعلیم کے افسران جب اس مدرسہ کا معائنہ کرنے آئے تو انھیں حکومت کی امدادی فہرست میں شامل کر لیا گیا اور گرانٹ کا اجرا ہونے لگا۔وہ مدرسہ کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر لوئی

کونی کے طریقہ علاج کے مطابق ٹب باتھ کے ذریعے لوگوں کا علاج بھی کیا کرتیں۔

بقول ممتاز مفتی:

> جہاں کوئی بیمار پڑتا، اماں اپنا ٹب اور لوئی کونی کی کتاب اٹھائے پہنچ جاتی اور گھر گھر جا منتیں کرتیں کہ اسے مریض کو ٹب میں بٹھانے کی اجازت دی جائے۔ [۱]

بچپن:

ممتاز مفتی کے والدین نے تو ان کی زندگی پر اثرات مرتب کرنے ہی تھے۔ یہ تو ایک فطری عمل ہے۔ لیکن ان کے بچپن کے دوستوں نے بھی ان کی شخصیت کی تعمیر میں اہم کردار ادا کیا۔ ان کے دوست، ان کے ماموں زاد، بشارت علی، سخاوت علی، کرامت علی اور امانت علی تھے۔ محلے کے دوستوں میں چراغ الدین لنگا، مبارک احمد، ڈاکٹر محمد رفیع تھے۔ ان کے بچپن کے روز و شب محلے کی لڑکیوں کو تاڑنے، اور لبھانے میں گزرتے تھے۔ ''علی پور کا ایلی'' میں وہ لکھتے ہیں کہ اس مقصد کے لیے انھوں نے مخصوص الفاظ بنا رکھے تھے۔ ''اینکر اینڈی ماباؤں'' اور'' کھوری ڈکوری'' جیسے الفاظ انھوں نے بڑی خوبصورتی سے استعمال کیے اور ان کا ذکر بھی بڑی دلچسپی سے کیا۔ ممتاز مفتی کے بچپن کے دور کا معاشرہ دباؤ اور گھٹن کا شکار تھا۔ نانک چندی اینٹوں سے بنی ہوئی سڑکیں، تنگ بازار، گھومتی گھامتی گلیاں جہاں دن میں بھی اندھیرا رہا کرتا۔ جن کمروں میں سورج کی روشنی نہ جاتی وہاں جالے تنے ہوتے اور چھتوں سے چمگادڑیں لٹکتیں۔

تعلیم

مفتی صاحب کو تعلیم حاصل کرنے کی سہولیات حاصل تھیں لیکن وہ اپنے ابتدائی زمانہ میں ایک نالائق طالب علم کی حیثیت سے جانے جاتے تھے۔ والد صاحب چونکہ ہیڈ ماسٹر تھے۔ اس لیے انھیں کوئی فیل نہ کرتا۔

> تعلیم کا باقاعدہ آغاز 14 جون 1913ء کو ہال گیٹ برانچ امرتسر میں جماعت سوم میں داخلہ لے کر کیا۔ [۲]

اس کے بعد وہ مختلف سکولوں میں گئے۔ وہ مختلف پروگراموں میں نظم وغیرہ بھی گایا کرتے۔ انھیں ڈراموں سے بڑا شغف تھا۔ وہ لڑکوں کے ساتھ مل کر ڈراموں کی پیش کش کرتے۔ اداکاری اور گلوکاری کیا کرتے۔ مدرسے میں حاضری کم ہونے کی وجہ سے ممتاز مفتی نے ایف۔ اے کا امتحان پانچ برس میں پاس کیا۔ بعد میں انھوں نے جب دل میں پیدا ہونے والے شوق اور جذبے کے تحت پڑھنا شروع کیا تو ہندو سبھا کالج امرتسر سے 1926ء میں ایف۔ اے کا امتحان پاس کر ہی لیا۔ جسمانی طور پر کمزور اس انسان کو آغازِ جوانی میں اپنے ایک دوست مفتی فضل حق کی بیوی، انور سلطان سے محبت ہوگئی۔ اس شوخ و شنگ لڑکی سے محبت نے ان کی زندگی پر بڑے گہرے اثرات مرتب

کیے۔اپنے کالج کے دور میں ایک لڑکی سے محبت میں ناکامی کے سولہ سال بعد ممتاز مفتی ،انتقام، ذلت اور کرب کے جذبوں سے مجبور ہو کر اسی انور سلطان نامی عورت کو اس کے چھ بچوں سمیت بھگا کر لے گئے۔

1929ء میں اسلامیہ کالج لاہور سے فلسفہ اور اقتصادیات مضامین میں تھرڈ کلاس ڈویژن میں بی،اے پاس کرلیا۔بی۔اے کے بعد شارٹ ہینڈ اور ٹائپنگ کا ڈپلومہ حاصل کیا۔کمشنر راولپنڈی کے سٹینو کی حیثیت سے کام کیا۔اس کے بعد سنٹرل ٹریننگ کالج سے ایس۔اے۔وی کا امتحان پاس کرنے کے بعد تدریس کا پیشہ اختیار کیا۔

ممتاز مفتی بطور مصنف

1934ء میں انھوں نے ایک نفسیاتی مضمون ''الجھاؤ'' لکھا۔1945ء تک ان کے دو افسانوی مجموعے شائع ہو چکے تھے۔وہ محکمانہ طور پر ممتاز حسین کے نام سے پہچانے جاتے تھے۔لیکن انھوں نے اپنا قلمی نام ''ممتاز مفتی'' رکھا۔1946ء میں محکمہ تعلیم کو خیر باد کہہ کر آل انڈیا ریڈیو میں سٹاف آرٹسٹ کے طور پر ملازمت شروع کر دی۔انہی دنوں انکے دوستوں احمد بشیر اور اشفاق احمد کے تعاون سے اقبال بیگم نامی خاتون سے ان کی شادی ہوگئی۔1947ء میں اپنے اہل خانہ کو اپنے آبائی محلے میں چھوڑ کر بمبئی چلے گئے۔1948ء میں حکومتِ پنجاب کے ہفتہ وار رسالے ''استقلال'' میں سب ایڈیٹر کی نوکری مل گئی۔اسی طرح مختلف جگہوں پر کام کرتے کرتے 1951ء میں فیڈرل پبلک سروس کمیشن کے ذریعے منتخب ہو کر آزاد کشمیر پبلسٹی ڈائریکٹوریٹ میں اسسٹنٹ انفارمیشن آفیسر بن گئے اور راولپنڈی میں مستقل رہائش اختیار کر لی۔اپنے ابتدائی دور میں مذہب اور تصوف سے بے نیازی کی وجہ پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> میرے دل میں پشتوں کا ایمان موجزن تھا۔ذہن الحاد کی ایک ناؤ تھی جو ایمان کے ڈونگے پانیوں میں ڈول رہی تھی۔ ۳۳

ادبی حیات

ممتاز مفتی کی ادبی زندگی ایک نفسیاتی مضمون سے شروع ہوتی ہے۔اس کا نام تھا 'الجھاؤ''۔یہ سکول میگزین میں چھپا۔مشہور ادبی جریدے ادبی دنیا کے ایڈیٹر منصور احمد ممتاز نے ممتاز مفتی کو لکھا اور کہا کہ ان کے سالنامے کے لیے کہانی لکھ دیں۔یہی واقعہ ان کی ادبی زندگی کا نقطۂ آغاز ثابت ہوا۔اس جریدے میں ان کا پہلا باقاعدہ افسانہ ''جھکی جھکی آنکھیں'' 1936ء میں تعریفی نوٹ کے ساتھ شائع ہو گیا۔اس کے بعد تو پھر جیسے لکھنے لکھانے کے ایک طویل دور کا آغاز ہو گیا۔ممتاز مفتی کی زندگی میں ان کے افسانوں کے آٹھ مجموعے، ایک ناول، ایک ڈرامہ، دو سفرنامے، چار شخصی خاکوں کے مجموعے اور دو مجموعے ان کے مضامین کے شائع ہوئے۔ان کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادے عکسی مفتی نے اپنی نگرانی میں ایک رپورتاژ شائع کروائی جس کا نام 'تلاش' تھا۔ایک مجموعہ 'گڈی کی کہانی' کے نام سے شائع ہوا جو افسانوں کا مجموعہ تھا۔

ممتاز مفتی کی ادبی حیات کو دو واضح حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا دور 1936ء سے لے کر 1965ء تک ہے۔اور دوسرا 1965ء کے بعد کا۔ان کے چوتھے اور پانچویں افسانوی مجموعوں میں ان کے فکر میں نمایاں تغیر دیکھا جاسکتا ہے۔اس تغیر کے اثرات علی پور کا ایلی میں بھی نظر آنا شروع ہو گئے تھے۔جو کہ 1961ء میں شائع ہوا۔ان کی غیر افسانوی تحریروں میں بہت نمایاں اور بڑا نام ان کے سفر نامے لبیک کا ہے۔جو کہ حج کا سفر نامہ ہے۔یہ ایک انقلابی کتاب تھی۔

ممتاز مفتی بطور افسانہ نگار:

ممتاز مفتی کا نام بیسویں صدی کے بڑے افسانہ نگاروں میں شامل ہے۔ان کہی ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔جواس دور کی تحاریر ہیں۔جب برصغیر اقتصادی بدحالی اور انتشار کا شکار تھا۔اس مجموعے میں ان کے افسانے ''آپا''،''جھکی جھکی آنکھیں''،''اندھیرا''،''خلط ملط''،''یہ دیوی''،''ماتھے کا تل''،''غسلِ آفتابی''، ''مورا'' جیسے کامیاب افسانے شامل ہیں۔ان افسانوں کے واقعات اور کردار زیادہ تر ممتاز مفتی کی ذاتی زندگی سے کشید کیے گیے ہیں۔

ان کا دوسرا افسانوی مجموعہ گہما گہمی 1944ء میں چھپا۔اس مجموعے کی کہانیوں کا تعلق بھی معاشرے سے ہے۔میاں بیوی کے رشتے کی نزاکتوں اور ظاہری بے چینی اور باطنی اضطراب سے متعلق ہے۔''الصدف''،''شرابی کا راز''،اور''ڈاکٹر کا استعمال'' جیسے افسانے اس مجموعے میں شامل ہیں۔ان افسانوں میں کرداروں کی داخلی کیفیات، گہرے اور الجھے ہوئے پیچیدہ احساسات کا بیان ہے۔مفتی صاحب ایسے خوبصورت انداز میں اپنے کرداروں سے کام لیتے ہیں کہ قاری ان کرداروں کی نفسیاتی جزئیات تک رسائی حاصل کر لیتا ہے۔ایک جگہ انھوں نے کمال طریقہ سے اپنے نفسیاتی ہتھیار کو استعمال کیا ہے۔لکھتے ہیں۔

> یہ دماغ ایک پھوڑا ہے۔ایسا پھوڑا جس کا منہ نہیں بنا۔جو بہہ نہیں سکتا۔میرے اللہ۔اس نے اپنی پیشانی پر ہاتھ مار کر کہا۔اپنے شانوں پر ایک گم پھوڑا اٹھائے پھرنا۔جو بہہ نہ سکے۔۔۔۔ کتنا دکھ ہے۔جیسے کسی آہنی پنجے نے مٹھی میں دبا رکھا ہو۔خدا جانے کیا ہے۔جس طرح وہ زرد سی بیل جو درختوں پر چھا جاتی ہے۔اور انھیں پھلنے پھولنے نہیں دیتی۔تم کہنا چاہو مگر کہہ نہ سکو اور ان کہی بات اندر ہی گھٹ گھٹ کہ پھرکتی رہے۔مگر تم کہنے والے لوگ اس حالت کو کیا سمجھو تمہارا پھوڑا بہتا ہے۔تمہارے خیالات چلتے ہیں۔مگر یہاں اس نے اپنے سر کی طرف اشارہ کیا۔اک بھنور سا بنا ہے۔جو انھیں بہنے نہیں دیتا۔پھر تم کہتے ہو پینا چھوڑ دو،اس نے ایک تمسخر آمیز قہقہ لگایا۔پھر گلاس کی طرف دیکھا اور اسے اٹھا کر غٹا غٹ پی گیا۔ [۴]

چپ کے عنوان سے مکتبۂ اردو، لاہور سے شائع ہونے والا یہ مجموعہ ان کا تیسرا افسانوی مجموعہ تھا۔ یہ افسانے مفتی صاحب نے اپنی زندگی کے مشکل ترین دور میں لکھے۔ افسانے ''نیلی''، ''باجی''، ''پریم نگر''، ''پاگل''، ''دروازہ''، ''چپ''، ''شائستہ''، ''پل''، ''تین خدا''، اور ''سہارا'' اس کتاب میں شامل ہیں۔

اسمارائیں بھی ممتاز مفتی کے اعلیٰ افسانوں کا مجموعہ ہے۔1952ء میں شائع ہوا۔ اس کتاب کے افسانے بھی جنس، محبت، جذباتیت اور خوابناکی کے ماحول پر مشتمل ہیں۔

گڑیا گھر ان کا پانچواں افسانوی مجموعہ ہے۔ اس میں شامل افسانے ''گڑیا گھر''، ''چارگوٹ''، ''کھونٹ والا بابا''، ''دودھیا سویرا''، ''جادوگرنی''، ''عطیہ''، ''سکارلٹ روڈ'' اور ''نیلی رگ'' جیسے افسانے ممتاز مفتی کی چابکدستی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

روغنی پتلے چھٹا افسانوی مجموعہ دیو مالائی کہانیوں پر مشتمل ہے۔ اس مجموعہ کا بہترین افسانہ ''ان پورنی'' ہے۔ ''سندرتا کا راکشس''، ''اپسرا حویلی''، ''بش اور بشری'' اور حلوائی کی دکان جیسے افسانے اس مجموعے کا حصہ ہیں۔

سمے کا بندھن 1987ء میں فیروز سنز لاہور نے شائع کیا۔ اس میں شامل کہانی ''سمے کا بندھن'' مفتی صاحب کی شاہکار کہانیوں میں سے ایک ہے۔ ''ساری بات'' اور ''چٹ کپڑی'' بھی اس افسانوی مجموعے میں شامل ہیں۔

کہی نہ جائے 1992ء میں شائع ہوا۔ اس میں ''معروف فارانی''، ''کہانی کی تلاش''، ''چوہا''، ''بھورسے''، ''بلیک پارٹ'' اور ''افسر'' جیسے افسانے اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ ممتاز مفتی، کے فکروفن میں ایک غیر معمولی صلاحیت مترشح تھی۔ وہ فرد کے جنسی رجحانات میلانات پر ضرور قلم اٹھاتے۔ انسانی نفسیات میں پیچیدگیوں پر بات کرتے اور بیسویں صدی کی تہذیبی فضا کو قاری کے سمجھنے کے لیے کھول کر بیان کرتے۔

عورت ان کا پسندیدہ موضوع ہے۔ وہ دو قسم کی عورتوں کے بارے میں قاری کو بتاتے ہیں۔ ایک شرمیلی، گھٹی گھٹی، اور مشرقی سی۔ اور دوسری جرات مند، بیباک، شوخ و چنچل۔

خودنوشت

علی پور کا ایلی 1961ء میں پہلی بار ایک ناول کی حیثیت سے شائع ہوا۔ بعد میں ممتاز مفتی نے اسے اپنی سوانح قرار دے ڈالا۔ اس میں انھوں نے اپنے بچپن کے تجربات، مشاہدات، ذہنی و جذباتی رجحانات کا بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ اس کہانی کے کردار اردو ادب میں زندہ و جاوید ہوگئے۔ اس کتاب میں اسلوب کی رنگینی، جذبات کی شدت اور کہانی کی تکنیک سے بھرپور استفادہ کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر سہیل بخاری لکھتے ہیں۔''اگر آپ نے ابھی تک ''علی پور کا ایلی'' نہیں پڑھا تو سمجھ لیجئے کہ آپ نے کچھ بھی نہیں پڑھا۔''۵

مفتی صاحب کی خودنوشت کا دوسرا حصہ الکھ نگری کے عنوان سے 1992ء میں شائع ہوا۔اس میں زیادہ تر قدرت اللہ شہاب کے افکار و خیالات مصنف کے ذہن پر غالب ہیں۔ اس میں ممتاز مفتی کے سائیں اللہ بخش کے حلقہ ارادت میں آنے اور بالآخر قدرت اللہ شہاب کے ساتھ مل کر ان کے رنگ میں رنگ جانے کے واقعات ملتے ہیں۔انھوں نے کتاب خالصتاً خودنوشت کے انداز میں تحریر کی ہے۔جس سے کتاب کا ادبی مقام'' علی پور کا ایلی'' سے بہر حال کم رہتا ہے۔دوسرے یہ کہ یہ کتاب ایک خاص مقصد کے تحت لکھی گئی۔جو ممتاز مفتی کے ایک خاص نقطۂ نظر کی وضاحت اور اس کا جواز پیش کرنا ہے۔

ممتاز مفتی بطور سفر نامہ نگار:

تاریخ نے ثابت کیا کہ ممتاز مفتی جتنے مشاق افسانہ نگار تھے۔ جتنے چابکدست سوانح نگار تھے۔اور جتنے منجھے ہوئے خاکہ نگار تھے۔اس سے کہیں زیادہ ذہین سفر نامہ نگار تھے۔ان کی اس خوبی کا عقدہ اس وقت کھلا جب انھوں نے سیارہ ڈائجسٹ کے لیے اپنے حج کے سفر کے احوال قسط وار لکھنا شروع کیے۔

سفر نامہ چونکہ حقیقت نگاری ہوتا ہے۔اور حقیقت نگاری کے صرف دو ہی رخ تھے۔ یا تو جنسی اور نفسیاتی حقیقت نگاری ہوا کرتی یا پھر مادی اور جدلیاتی حقیقت نگاری۔ممتاز مفتی اپنے پہلے دور میں منٹو، عصمت چغتائی اور حسن عسکری کی طرح حقیقت پسند مصنف تھے۔وہ بدنی واردات اور مادی وسائل پر لکھنا ہی حقیقت نگاری سمجھتے تھے۔لیکن 1975ء میں ممتاز مفتی کے سفرِ حج کے سفرنامے لبیک نے نہ صرف حقیقت نگاری کو نئے اسلوب سے آشنا کر دیا۔ بلکہ ممتاز مفتی کی اس جرات پر ایک تہلکہ سا مچ گیا۔وہ اس سے پہلے جنسی موضوعات پر لکھنے والے ایک لکھاری کے طور پر جانے جاتے تھے۔لبیک کی اشاعت نے یہ تاثر توڑا اور ان کی مقبولیت بہت بلند درجوں میں داخل ہوگئی۔ یہ ان کی سب سے زیادہ تہلکہ مچا دینے والی اور ان کے لیے رجحان آمیز کتاب ثابت ہوئی۔ یہ حج کے روایتی سفر ناموں سے بالکل ہٹ کر ایک کتاب تھی۔جو ان کی سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب بن گئی۔انھوں نے اس کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے اس کے حقوق عام کر دیے۔انھیں روحانی مقبولیت کا شرف حاصل ہوگیا۔لہٰذا وہ اس کی رائلٹی کھانے سے دست بردار ہوگئے۔ ۶

لبیک مختلف آراء

1968ء میں مفتی صاحب نے حج کی سعادت حاصل کی۔اس سفر میں ان کے ہمراہ قدرت اللہ شہاب تھے۔ حج کے سفر کے تقریباً چھے برس بعد 1975ء میں اس سفر کی داستان انھوں نے شائع کروائی۔ یہ ایک رپورتاژ کی شکل میں تھی۔ یہ قسط وار شکل میں سیارہ ڈائجسٹ میں چھپتی رہی۔اس کے بعد اس کو التحریر، لاہور نے شائع کیا۔ یہ ان کی

زندگی کا ایک اہم سنگِ میل ثابت ہوئی۔ ان کے اس سفر نامے نے جہاں ان کو شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیا وہیں ان کے بہت سے معترضین بھی پیدا ہو گئے۔ علم، ادب اور مذہب سے متعلقہ لوگ انھیں مردود قرار دینے لگے۔ کفر کے فتوے بھی لگائے گئے۔ لیکن یہ بات طے تھی کہ ممتاز مفتی کا نام ادب کی دنیا میں نمایاں ہو گیا۔ معترضین کے اعتراضات یہ تھے کہ انھوں نے خانہ کعبہ کی بے ادبی کی ہے۔ اور مسلمانوں کے مذہبی عقیدوں کا تمسخر اڑایا ہے۔ ''ایک اخبار نے ان کو روس کا ایجنٹ تک لکھ دیا۔'' ۷

ممتاز مفتی نے اس خبر کی تفصیل بتاتے ہوئے ایک جگہ لکھا۔

> پھر اخباروں میں ایک خبر چھپی کہ ماسکو میں ایک ہائی لیول کانفرس ہوئی جس میں ممتاز مفتی کی تصنیف لبیک کو سراہا گیا۔ اور کمیونسٹ رائٹرز کو ترغیب دی گئی کہ ایسی کتابیں لکھو جو لوگوں کو مذہب سے بیزار کریں۔ ۸

اس قدر شدید مخالفت کے باوجود ممتاز مفتی کو اردو ادب کا بڑا نام تسلیم کیا گیا۔ اس کی وجہ یہ کہ ایک تو یہ کتاب بیک وقت اتنے لوگوں پر اتنا گہرا تاثر چھوڑ گئی۔ دوسری یہ کہ جہاں اس سفر نامے کے مخالفین اور مفتی صاحب کو کافر قرار دینے لوگ موجود تھے۔ وہیں ان کے اس سفر نامے سے روحانی سرور حاصل کرنے والوں کا بھی ایک گروہ موجود تھا۔ مفتی صاحب کے ایک پرانے دوست احمد بشیر نے کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا۔

> میں نے سیارہ ڈائجسٹ میں اس کی کوئی قسط نہ پڑھی۔ مگر جب ممتاز مفتی پر گالیاں پڑنے لگیں اور بات روز ناموں تک پہنچی تو مجھ میں دلچسپی پیدا ہوئی۔ میں نے سوچا میرا یار باز نہیں آیا، دین ہی اپنی لاعلمی اور جہالت کی بنا پر کچھ فرمایا گیا ہوگا۔ اب مولویوں کے منہ کون آئے، خصوصاً جب کوئی ان کی اقلیم میں جوتوں سمیت گھس آئے۔ ۹

احمد بشیر کی یہ بات بالکل درست ہے۔ لیکن جب سیارہ ڈائجسٹ کے ایڈیٹر قاسم محمود کو ہزاروں کی تعداد میں ملنے والے، پسندیدگی سے بھرے ہوئے خطوط ملے تو بات بالکل الٹ ثابت ہوئی۔ وہ خطوط کچھ اس طرح کے تھے۔

> پڑھتا رہا، روتا رہا، کتنے ہی صاحب دلوں کا اس روداد سے یہاں گھر بیٹھے بیٹھے حج ہو گیا۔
>
> خورشید حسن، کراچی
>
> اس رپورتاژ کو پڑھ کر مجھے ایسا لگا۔ جیسے ابھی ابھی اللہ میاں سے تعارف ہوا ہے۔
>
> ناظم پانی پتی صاحب ۱۰

لبیک کا یہ پہلو نہایت حیرت انگیز اور خوشگوار تھا۔ جو نہ صرف اہلِ ذوق حضرات کے لیے باعثِ حیرانی تھا بلکہ خود ممتاز مفتی کے لیے بھی۔ مولانا کوثر نیازی نے اس کتاب کے فلیپ کے لیے رائے بھجوائی جو اس

طرح تھی۔

> دیارِ حبیب کے سفر نامے جتنے بھی چھپے میں نے سب پڑھے ہیں۔اس لیے کہ ذکرِ حبیب کم نہیں وصلِ حبیب سے۔مگر ممتاز مفتی کے سفر نامے میں جو مجذوبانہ اور عاشقانہ رنگ تھا،اس کی بات ہی دوسری تھی۔اس تحریر پر ممکن ہے کچھ لوگ بگڑیں اور غضبناک ہوں ،مگر میں تو اسے ممتاز مفتی کے لیے ذریعۂ بخشش اور پروانۂ نجات سمجھتا ہوں۔ [۱۱]

ممتاز مفتی کے انتقال کے بعد ان کی نثر کا تجزیہ کرنے والوں میں ایک نام مسعود قریشی کا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> لبیک سفرناموں کا نقطۂ عروج ہے ۔جیسے کوئی مسلمان حج پر از خود نہیں جا سکتا جب تک بلاوا نہ ہو،اسی طرح لبیک جیسا سفر نامہ نہیں لکھا جا سکتا۔ جب تک تائیدِ ایزدی اور رسالت کی نگاہ شاملِ حال نہ ہو۔لبیک نے جو مقبولیت حاصل کی وہ بھی خداداد بات ہے۔کئی ایڈیشن چھپے اور جلد ہی مفتی کو احساس ہوا کہ یہ تحریر اس کی ذاتی ملکیت نہیں بلکہ اس سے لکھوائی گئی ہے،ایک امانت ہے۔چنانچہ مفتی نے لبیک کو کاپی رائٹ کی پابندیوں سے آزاد کر دیا کہ جس کا جی چاہے چھاپے،جتنی چاہے چھاپے۔ [۱۲]

لبیک عام قارئین کی نظر میں:

لبیک کو جہاں علم و ادب کے ماہرین نے ،نقاد نے اور ادباء نے پرکھا۔اس پر رائے زنی کی،اس کی خوبیاں اور خامیاں بیان کیں۔اس میں موجود فنی محاسن اور نقائص پر بحث کی ۔وہیں کچھ ایسے لوگوں نے بھی اسے پڑھا جو صرف قاری ہوتے ہیں۔وہ ہر اچھی تحریر کی توصیف کرتے ہیں اور بری تحریر پر اپنی رائے دیتے ہیں۔ایک ادیب رائے دیتے وقت مصنف کے ساتھ اپنے ذاتی تعلقات کو بھی ملحوظ رکھتا ہے۔اس طرح اس کی رائے میں جانبداری نظر آ جاتی ہے۔لیکن ایک عام قاری بے لاگ تبصرہ کرتا ہے۔ممتاز مفتی کا فنِ سفر نامہ نگاری اس وقت کھل کر ہمارے سامنے آتا ہے۔ جب ہم اس کو عام قاری کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

خاص کر وہ لوگ جو ممتاز مفتی کو پہلے سے جانتے تھے۔ جو یہ سمجھتے تھے کہ مفتی صاحب ایک دنیادار انسان ہیں ۔جو عمر کا ایک حصہ محبوبہ کی گلیوں میں گشت کرتے ہوئے گزار چکے ہیں۔ان لوگوں کو مفتی صاحب کی قلبی واردات ہضم نہ ہو سکی۔لیکن وہ ادیب اور نقاد جنہوں نے مفتی صاحب کو اسی روپ میں دیکھا ان کی رائے کچھ اور تھی۔اختر جمال لکھتے ہیں:

> یہ ایک عام حاجی کا سفر نامہ نہیں بلکہ یہ ایک صاحبِ دل کا روحانی سفر ہے۔نفسی واردات۔ایک

> کے بعد ایک ، پردے دل اور نظر سے اٹھتے جاتے ہیں۔اور یہ لمبا سفر اور اسکی ہر منزل ایک حجاب اٹھنے کی منزل ہے۔اس لیے اس سفر نامے کے سب کردار علامتیں بن جاتے ہیں۔۔۔۔کالا کوٹھا روحانی سفر کی آخری منزل اور علامت ہے۔لیکن شرط یہ ہے کہ دیدۂ دل وا کرے کوئی۔مفتی صاحب نے ظاہر کی آنکھ سے تماشہ کر کے نہیں بلکہ دیدۂ دل وا کر کے یہ سفر نامے لکھا ہے۔ ۱۳؎

ممتاز مفتی نے فن سفر نامہ نگاری کو ایک نئی جہت سے روشناس کروادیا۔انھوں نے اپنے سفرِ حج کے دوران پیش آنے والے روحانی عقیدت والے واقعات کو بھی ایسے انداز میں پیش کیا جیسے کسی لوسٹوری میں محبوب کے وصال کی کیفیات کو بیان کیا جاتا ہے۔ان کا یہ اسلوب کئی ادیبوں اور قارئین کو ایسے متاثر کر گیا جیسے کسی بہت بڑی قوت نے ان کو باطن سے ہلا دیا ہو۔ان کے سفر کے دوران ملنے والے کردار کہانی سے باہر نکل کر قاری کے سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

کرنل ڈاکٹر ابدال بیلا نے اپنی کتاب لو سٹوری میں لکھا۔

> کالج کے دنوں میں لبیک میرے ہاتھ لگ گئی۔پڑھی تو چڑھ گئی،ہوش اڑا دیئے۔نہ کالج جانے کی سدھ رہی نہ پتہ چلا کب دن گزرا کب رات آگئی۔ممتاز مفتی کا محبوب لبیک کے صفحوں سے نکل کر میری گردن پر بیٹھا تھا۔اس نے مجھے انڈے کی طرح پھینٹ دیا۔آملیٹ بنادیا۔بند بند ہلا دیا۔نچوڑ دیا۔پورا راستہ آنسو گرتے گئے۔زندگی بھر روکے ہوئے دریا کا بند ٹوٹ گیا...لبیک نہ سفر نامہ ہے۔اور نہ رپورتاژ۔یہ لوسٹوری ہے۔محبت کی کہانی۔ ۱۴؎

ممتاز مفتی کے سفرنامہ نگاری کے اسلوب میں ایک خاص بات یہ ہے کہ انھوں نے عام سفرناموں کی طرح اپنے پلے سے کوئی باتیں گھڑ کر نہیں لکھیں۔اور نہ ہی کسی عام بات کو مبالغہ کی آمیزش سے بہت بڑی یا خاص بات بنا کر رکھ دیا ہو۔وہ حقیقت کو ایسے بیان کرتے ہیں جیسے بے خودی کے عالم میں کوئی شخص دل کی باتیں بتاتا جاتا ہے۔ممتاز شاہین مظہر کہتے ہیں:

> لبیک میں مفتی کے تجربات اور اس کے دل کی کیفیات ہمیں ایک عام حاجی سے الگ محسوس ہوتی ہیں۔اور یہ کتاب بھی حج پر لکھے جانے والے دوسرے سفرناموں سے مختلف ہے۔کسی جگہ بھی یہ محسوس نہیں ہوتا کہ مفتی جان بوجھ کر کوئی بات گھڑ کر ہمیں سنا رہا ہے۔بلکہ یوں لگتا ہے ، جیسے کوئی بے خود اور بے حال آدمی جذبے اور سرشاری میں ڈوبا ہوا اپنی آپ بیتی سنا رہا ہے۔ ۱۵؎

لبیک نے لوگوں کی زندگیاں تبدیل کر دیں۔اور یہ تبدیلیاں نتائج آمیز تھیں۔یہ ایسے لوگ تھے جو ممتاز

صاحب کو صرف لبیک کے حوالے سے جانتے تھے۔لیکن ممتاز صاحب کے اس سفرنامہ میں ان کی سابقہ سوچ اور اسلوب کو ایک طرف رکھ کر دیکھا جوئے تو اس سفرنامہ میں ان کا فن نقطۂ عروج کو پہنچا ہوا ہے۔

اس سفرنامہ کا جائزہ اس انداز سے لینے کی ضرورت ہے کہ مفتی صاحب کے فن میں ایسی کونسی بات ہے۔ایسی کونسی یکتائی ہے۔جس نے انھیں اردو ادب کا بڑا سفرنامہ نگار بنا دیا۔

ممتاز مفتی بطور منفرد سفرنامہ نگار:

ممتاز مفتی ایک منفرد سفرنامہ نگار ثابت ہوئے تو کن وجوہات سے۔اس بات کو پرکھنے کے لیے ہمیں ایک اور انداز سے جائزہ لینا ہوگا۔ عام نظر سے دیکھیں تو یہ ایک حج کے سفر کی عام داستان لگتی ہے۔اس داستانِ سفر میں انھوں نے روحوں سے ملاقاتوں کا ذکر کیا ہے۔مجذوبوں اور فقیروں کی پیشین گوئیوں کی بات کی ہے۔لیکن اس طرح کے واقعات برصغیر کی عام کہانیوں اور حقیقت میں بھی دکھائی دیے جاتے ہیں۔اور ایسے واقعات سے پڑھنے والوں پر رقت بھی طاری نہیں ہوتی۔کسی چیز کا مافوق الفطرت ہونا قارئین پر اتنا گہرا تاثر نہیں چھوڑتا۔

جتنا کہ اس واقعہ کو بیان کرنے کا اسلوب اپنا تاثر پیدا کرتا ہے۔اور یہی اسلوب مفتی صاحب کے ہاں پایا جاتا ہے۔وہ ایک منفرد اسلوب سے حج کے واقعات کو بیان کرتے ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ ادبی حلقوں کے مطابق مفتی صاحب نے اس میں قدرت اللہ شہاب کو اللہ کا برگزیدہ بندہ اور صوفی کے طور پر متعارف کروایا ہے۔جبکہ وہ ایک بیوروکریٹ تھے۔لیکن یہ بات بھی تمام قارئین کے لیے اتنی اہمیت کی حامل نہیں،ان کے لیے قدرت اللہ شہاب کا امیج معنی نہیں رکھتا۔تو پھر کیا بات ہے کہ ان کی یہ سفر کی داستان اپنے پڑھنے والے کے دلوں پر گہرے نقوش چھوڑ گئی۔ اس میں بہت سی باتیں ہیں۔پہلی بات تو یہ ہے کہ مفتی صاحب نے حج کے سفر پر جانے والوں کے دلوں میں جو ہلکے ہلکے شکوک وشبہات ابھرتے ہیں،اور جنہیں تقدیس کے حصار میں لپیٹ دیا جاتا ہے،ان کو کھل کر بیان کیا ہے۔انھوں نے لگی لپٹی بات نہیں کی بلکہ صاف اور واضح بات کی۔انھوں نے نہ صرف ان شکوک ،شبہات کا ذکر ڈنکے کی چوٹ پر کیا بلکہ ان کا کوئی نہ کوئی حل بھی نکالا۔ پڑھنے والے اسے درست قرار دیں یا غلط۔لیکن وہ یہ ضرور سوچیں گے کہ ان حقیقتوں کو تسلیم کرنے کا ایک انداز یہ بھی ہے جو مفتی صاحب نے بیان کیا۔

دوسری فنی خوبی اس سفرنامہ میں یہ ہے کہ مفتی صاحب نے اپنا ذاتی نقطۂ نظر ایسی مہارت سے بیان کر دیا کہ قاری یہ سمجھتا ہے کہ یہ نتیجہ اس نے خود غوروخوض کرنے کے بعد نکالا ہے۔اور یہی اس سفرنامہ کی بہت بڑی خوبی ہے۔مفتی صاحب کا فنِ سفرنامہ نگاری اس زاویہ سے پرکھا جائے تو اپنے عروج پر نظر آتا ہے۔یہ ان کی تجربہ کاری،معاملہ فہمی اور تحریر پر کمال گرفت کی بدولت ہے۔

بین الاقوامی شہرت یافتہ مصنفہ باربرا میٹکاف مفتی صاحب کو اسلامی طنز نگار قرار دیتی ہے۔

> مفتی دقیانوسی انداز میں خدا کی بات نہیں کرتا۔ نہ اس نے اپنی غیر معمولی کامیابیوں، پارسائی اور ماہیت قلب کی باتیں کی ہیں۔۔وہ ایک متشکک ہے جو ایک نجومی کی بات پر ڈول جاتا ہے۔ایک ایسا زائر جو زائرین کی پرواز کو جہاز کے اغوا کا واہمہ سمجھتا ہے،ایک غیر مذہبی فرد ہے۔جس کو قریب قریب خدا کا دیدار حاصل ہوتا ہے۔ایسا سفرنامہ لکھنا، جس کا مقصد احتساب کے بغیر اپنے متضاد تجربات واحساسات پیش کرتا ہو،مغرب زدہ عالمی تجربے میں شامل ہونے کے مترادف ہے۔جو جدید ادب کی ایک صنف ہے۔اس کے ساتھ ہی مکہ معظّمہ جانا مسلمان ہونے کا برملا اعلان بھی ہے۔ ۱۶

ممتاز مفتی نے سفر نامہ نگاری کے فن کو محض واقعات بیان کردینے کی ایک صنف نہیں رہنے دیا بلکہ انھوں نے انتہائی لطیف پیرائے میں جا کر ایسے ایسے خیالات کو اجاگر کردیا ہے۔جو کہ ایک فلسفی ذہن میں مذہب اسلام کی روایات اور اقدار کے متعلق پیدا ہو سکتے ہیں۔انھوں نے خود کو ایک ایسا مسلمان ظاہر کرتے ہوئے بہت سے سوالات اٹھائے، جو ابھی مذہب کے اوپر مکمل طور عمل پیرا نھیں۔لیکن پکا مسلمان ضرور ہے۔انھوں نے وہ سوالات روحانی تجربات کے پیرائے میں اٹھائے اور پھر ان سوالوں کا جواب تلاش کرنے کی دعوت بھی دی۔

وہ سوالات کیا ہیں۔جو مفتی صاحب نے اٹھائے ہیں۔اس کے لیے ہمیں لبیک کا بغور مطالعہ کرنا ہوگا۔وہ لکھتے ہیں۔''کالے پتھروں سے بنا ہوا ایک بے ڈھب کوٹھا جس پر سیاہ غلاف چڑھا تھا''۔ ۱۷

یعنی خانہ خدا پر نظر پڑتے ہی ان کے ذہن میں سب سے پہلا خیال یہ آیا کہ یہ ایک کالے پتھروں سے بنا ایک کوٹھا ہے جس پر سیاہ رنگ کا غلاف چڑھا ہوا ہے۔یہ ایک ایسا اچھوتا اور انوکھا خیال ہے جو مفتی صاحب نے اپنی زبان سے کہا لیکن یہ خیال بہت سے کم ذہن، ان پڑھ اور اسلام سے ناآشنا لوگوں کے ذہن میں بھی آیا ہوگا۔اسی طرح ایک جگہ لکھتے ہیں۔

> جب سجدے کا وقت آیا تو میں گھبرا گیا۔پچھلی صف کا نمازی میری تہہ شدہ ٹانگوں کے اندر زبردستی اپنا سر گھسیڑ رہا تھا۔اگلی صف اس قدر قریب تھی کہ سر زمین پر ٹیکنے کی گنجائش نہ تھی۔سجدہ ادا کرنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔یہ کیا مصیبت ہے۔میرے ذہن میں آزردگی کی ایک لہر ابھری،اور میری روح پر مسلط ومحیط ہوگئی۔ ۱۸

یعنی یہ خیال بھی ایک عام آدمی کے ذہن میں ضرور آتا ہوگا کہ ایسی جگہ پر اتنے رش میں نماز پڑھنا کتنا مشکل ہے۔لیکن ادب کا ایک ایسا حصار اس کے گرد کھینچا ہوتا ہے کہ وہ اس جگہ کے بارے میں ایسی بات کہہ نہیں سکتا بلکہ سوچ بھی نہیں سکتا۔لیکن مفتی صاحب کے قلم نے، ایسی باتیں ایسے خیالات اور ایسے سوالات جا بجا

اٹھائے ہیں۔جن کے بارے میں کوئی کٹر مسلمان سوچنے سے بھی گریز کرتا ہے۔انسانی نفس ایک ایسا باریک جال آدمی کے گرداگرد بُن لیتا ہے۔ جو اسے اپنا شکار بنا لیتا ہے۔اور انسان کو اس جال میں ہونے کا احساس بھی نہیں ہوتا۔مفتی صاحب نے ایسے جال کی تاروں پر انگلی رکھی۔ان کی نشان دہی کی۔روز مرہ کے تجربات کو بیان کرتے ہوئے وہ اس میں بڑی چالاکی سے اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے چلے جاتے ہیں۔

ان کے نقطۂ نظر کے بارے میں ذوالفقار احمد تابش ایک جگہ لکھتے ہیں:

> یہ کتاب باہر سے اندر کی جانب سفر کی روداد ہے۔یہ حاضر کے زوج غائب کی تصویر ہے۔یہ ظاہر کے ہمزاد باطن کی کہانی ہے۔۔یہ عشق اور سرمستی ،محبت اور وصال کی حکایت ہے۔۔۔ عالمِ موجود کے ساتھ ایک عالمِ مثال بھی ہے۔اور عالمِ مثال میں چیزیں عقل اور آنکھوں سے نہیں ،عشق اور وجدان سے دیکھی اور سمجھی جاتی ہیں۔یہ اس دنیا کی کہانی ہے۔جہاں دل اور دماغ کو حاضر ہونے کی اجازت نہیں۔جہاں عقل وخرد اور فکر و فلسفہ کے پر جلتے ہیں۔ہاں جن کے باطن میں محبت کی کوئی ہلکی سی چنگاری بھی ہے۔جو دل و دماغ کے آسیب سے کسی قدر بچے ہوئے ہیں۔جو محض علم کے اسیر نہیں ہیں۔ان کے لیے اس کتاب میں بہت کچھ ہے۔ [۱۹]

خلاصۂ کلام:

لبیک کے بارے میں بہت سے ادیبوں ،دانشوروں اور نقادوں کی رائے پڑھ کر یہ معلوم ہوتا ہے۔کہ ممتاز مفتی کا یہ سفر نامۂ حج محض ایک سفر نامہ نہیں بلکہ یہ ایک عقلیاتی ،نفسیاتی ،موضوعاتی اور عقل وجدان کا فن پارہ ہے۔دانشوروں نے کہا کہ انسانی سوچ کو سرسید کی تحریک نے جس گڑھے سے نکالنے کی کوشش کی تھی۔دوبارہ اسی گڑھے میں دھکیلنے کی تحریک ''لبیک'' میں موجود ہے۔پھر اسے مذہب کو پیروں ،فقیروں اور مذہبی ٹھیکیداروں کے حوالے کیا گیا ہے۔جب کہ انسانی سوچ اس سفر میں کافی آگے بڑھ چکی تھی۔اب پھر سے پیچھے چلی گئی ہے۔ترقی پسند ادیبوں نے خاص طور پر اس کی مخالفت کی۔نذیر احمد نے ایک جگہ لکھا:

> یہ بات تو قابلِ فہم ہے۔کہ افراد اپنے شعور یا اپنی بصیرت کی وسعت یا تنگدامنی کی بنا پر کم مرتبہ یا بلند مرتبہ ہوتے ہیں۔مگر ان کو پر اسرار محسوسات کے حوالے سے درجوں میں تقسیم کرنا اور زندگی کی پوری ڈگر کو ان کا مرہونِ منت قرار دینا کہاں تک صحت مند رویہ ہے،میری سمجھ میں نہیں آتا۔۔ مجھے خدشہ ہے کہ اس کی خواہشات اور ارادوں کے برعکس اس معاملے میں ممتاز مفتی کا اندازِ فکر ایسے اداروں کے لیے باعثِ تقویت ہے۔جن کا کردار ہمیشہ سے عوام کے لیے گمراہ کن رہا ہے۔سچ تو یہ ہے کہ آخری تجزیے میں اس اندازِ فکر کے ڈانڈے Priest

hood کے اس تصور سے جا ملتے ہیں، جو اسلام کی روح کے منافی ہے۔اور جس کے خلاف اسلامی مفکرین نے مسلسل جہاد کیا ہے۔ [۲۰]

مثبت اور منفی دونوں نقطۂ ہائے نظر کو مدِ نظر رکھتے ہوئے خلاصہ کلام یہ ہے کہ ممتاز مفتی ایک ایسے پکے اور سچے مسلمان ہیں۔جن کا دماغ اور دل مکمل طور پر دنیاداری میں لتھڑا ہوا ہے۔لیکن ان کی روح ابھی تک اپنے خالق سے جڑی ہوئی ہے۔اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے وہ خودلبیک کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں۔اس پیش لفظ کو انھوں نے ''معذرت'' کے عنوان سے تحریر کیا ہے:

> خیال تھا کہ سرسری طور پر دو تین قسطیں لکھ دوں گا۔ادھر ادھر کی فروعی باتیں کروں گا جن کا اللہ اور دین سے کوئی تعلق نہ ہو اور پھر ختم کر دوں گا۔لیکن جب رپورتاژ خانہ خدا کے حضور پہنچا تو میرے اللہ نے مجھے پکڑ لیا۔''اب ہمارے حضور پہنچ کر تو جاتا کہاں ہے۔پھر مجھے پتہ نہیں کیا ہوا، لکھتا گیا اور لکھتا ہی چلا گیا۔ [۲۱]

درج بالا سطور سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مفتی صاحب ادھر ادھر کی ایسی باتیں کرنے کے موڈ میں تھے۔جن کا اللہ اور دین سے کوئی تعلق نہ ہو۔اور پھر یہ بھی لکھتے ہیں کہ جب اس سفرنامہ وہ موڑ آ پہنچا کہ جب وہ خانہ کعبہ کے سامنے خدا کے حضور میں پہنچے تو پھر ان کو اللہ تعالی کی طرف سے اشارہ اور حکم ہو گیا کہ اب تم اس سفرنامہ کو یہیں پر نہیں چھوڑ سکتے۔لہٰذا لکھتے گئے۔

ممتاز مفتی ایک ایسے شخص تھے۔جو دنیا داری کے جھمیلوں میں اس قدر رچے بسے تھے۔کہ شاید خدا کے وجود سے بھی انکاری تھے۔ان کے ذہنی ارتقا کی مختلف مدراج طے ہوتی رہیں۔وہ خدا کی ذات کو مشکک نگاہوں سے بھی دیکھا کرتے۔اور پھر اعتقاد کی آخری حدوں کو بھی چھونے لگے۔''معذرت'' نامی دیباچہ میں فرماتے ہیں۔

> میرے اللہ مجھ پر ہمیشہ سے کرم فرمائی کرتے رہے ہیں۔ان دنوں بھی جب میں ان کے وجود سے منکر تھا۔ان دنوں بھی جب میں انھیں شکوک و شبہات کی نظر سے دیکھتا تھا، ان دنوں بھی جب میں سمجھتا تھا کہ اگر خدا کا وجود نہ ہوتا تو بھی ہم اپنی آسائش کے لیے ایک خدا تخلیق کر لیتے، اور اب بھی جب میں محسوس کرتا ہوں کہ وہ میرے لیے جیتے ہیں۔میری فکر میں جاگ رہے ہیں۔مجھے تکلیف نہ ہو۔ [۲۲]

انھوں نے خدا کو ایک انوکھے روپ میں دنیا کے سامنے پیش کیا۔انھوں نے حرم شریف کو حج کے دنوں میں صرف اللہ کا گھر نہیں بلکہ اللہ اور بندوں کا گھر قرار دیا۔انھوں نے اللہ کے نام پر لوٹنے والوں پر سرزنش کی ہے۔ان بندوں پر فقرے کسے ہیں جو اللہ کے نام حرم میں تو چلے آئے لیکن ان کے دھیان کہیں اور ہیں۔جسم

خانہ کعبہ کے پاس ہیں اور دل دنیاداری میں کہیں کھوئے پڑے ہیں۔خالص عقیدہ لوگوں اور توہم پرست مسلمانوں کے فرق کو واضح کیا ہے۔توحید پرستی اور بت پرستی جیسے نازک مسائل پر کھل کر اظہارِ خیال کیا۔ زائرین کی شکایات، انتظامیہ کی سہولیات اور ارکانِ حج کی تفصیلات بیان کی ہیں۔ارکانِ حج کو جمناسٹک کہا ہے ، پہاڑوں کے درمیان دوڑ، بال کٹوانے کا تردد اور منیٰ کو روانہ ہونے کو تردد اور شیطانوں کو کنکریاں مارنے کو ایک مشکل امر قرار دیا ہے۔

ممتاز مفتی کے اپنے الفاظ میں وہ خدا تعالیٰ سے لاڈ کرر ہے تھے، لکھتے ہیں:

> جب آقا اس قدر مہربان ہو تو بندہ محبت سے سرشار ہو کر لاڈ کرنے لگتا ہے۔اس رپورتاژ میں، میں نے بھی جگہ جگہ لاڈ کیے ہیں۔اور اگر ان کی وجہ سے کسی کی دل آزاری ہوئی تو میں معافی کا خواستگار ہوں۔۔اس رپورتاژ کا مقصد کسی کی دل آزاری نہیں اور نہ ہی دینی مسائل پر بحث کرنا ہے نہ دینی مسائل پر کوئی نیا نظریہ پیش کرنا ہے۔یہ رپورتاژ تو ایک انجان، جاہل مگر مخلص زائر کی آپ بیتی ہے۔ ۲۳

ہند یاترا ۔ تعارف

ممتاز مفتی کے فن سفرنامہ نگاری کے بیش بہا پہلو،ان کی تصنیف لبیک میں سامنے آئے۔لیکن مفتی صاحب کے دوسرے سفرنامہ ہندیاترا میں ان کی تحریر میں موجود انشائیے اور رپورتاژ کے مشترکہ پہلو بھی کھل کر سامنے آتے ہیں۔لبیک میں ان کا انداز مذہبی، کیفیاتی اور منظر نگاری کی کیفیات کے گرد گھومتا ہے۔جبکہ ہندیاترا میں ان کا قلم افسانہ نگاری، داستان گوئی اور خاکہ نویسی کی صفات لیے ہوئے ہے۔ان کا سفرنامہ نگاری کا فن اردو ادب میں اپنی ایک الگ شناخت قائم کیے ہوئے ہے۔جب کبھی اردو ادب پر تحقیق ہوگی اور اردو ادب میں سفرناموں اور سفرنامہ نگاروں کا تذکرہ ہوگا تو ممتاز مفتی کا نام نمایاں حیثیت میں لیا جائے گا۔یہ سفرنامہ 1982ء میں مفتی صاحب کے بھارت کے سفر کے حالات پر مشتمل ہے۔وہ حضرت امیر خسرو کے عرس کی تقریبات میں شرکت کرنے کے لیے ہندوستان گئے تھے۔جب کہ وہ خود ایک جگہ لکھتے ہیں کہ ان کا مقصد عرس کی تقریبات نہ تھیں بلکہ ہندوستان کے مختلف شہروں سے ہومیوپیتھی کی کتابوں کی تلاش تھا۔

1987ء میں اظہار سنز، لاہور نے اس سفرنامے کو شائع کیا۔یہ کتاب تین سو پچیس صفحات پر مشتمل ہے۔کتاب کا انتساب حضرت امیر خسرو کے نام کیا گیا ہے۔کتاب بہت اعلیٰ کاغذ اور مضبوط جلد میں چھپی ہوئی ہے۔اورفنِ طباعت کا بہترین شاہکار ہے۔نئی دلی اور پرانی دلی کے گلی کوچوں کی سیر کے احوال سے بھرپور یہ سفرنامہ اردو ادب کے اہم سفرناموں میں شمار ہوتا ہے۔اور مفتی صاحب کے فنِ سفرنامہ نگاری کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

وجہِ تصنیف

اس سفرنامہ کی تصنیف کی وجہ بظاہر تو امیر خسرو کے عرس میں شرکت ہے۔جبکہ مفتی صاحب لکھتے ہیں کہ ان کا اس سفر سے مقصد یہ تھا کہ وہ ہندوستان سے ہومیو پیتھی کی کتابیں حاصل کریں۔معروف ہومیو ڈاکٹر اشفاق حسین اس سفر میں ان کے ساتھ تھے۔خود ممتاز مفتی کا ہومیو پیتھی سے لگاؤ بھی اس سفر کا محرک بنا۔ان کے خیال میں ہندوستانی ڈاکٹروں کی لکھی ہوئی کتابیں پاکستانی لوگوں کی مزاجی کیفیات سے نسبتاً قریب ہوتی ہیں۔اس لیے وہ مغربی مصنفوں کی بجائے ہندوستانی مصنفوں کی کتابیں خریدنا چاہتے تھے۔ [۲۴]

اس سفر نامے میں مفتی صاحب کے قلم نے بہت سے رنگ بکھیرے ہیں۔اس میں ان کا انداز سفرنامے کا بھی ہے۔انشائیے کا بھی،روز نامے کا بھی،رپورتاژ کا بھی،سوانح حیات کا بھی ہے۔انھوں ان تمام اندازِ تحریر کو ساتھ لے کر چلتے چلتے اپنے اندازِ فکر کو بھی بیان کیا ہے۔ان کے خیال میں یہ ایک یادوں کی برات کا اداسی آمیز تجربہ ہے۔ان کے اعتقادات ہیں۔مشاہدات ہیں اور تجربات ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ افسانوں میں وہ جو باتیں کردار گھڑ گھڑ کر ان کے منہ سے نکلواتے ہیں۔وہ اس سفرنامہ میں بر ملا کہہ دیتے ہیں۔انھیں فرضی واقعات نہیں بنانا پڑتے۔جو کچھ ان کے دل و دماغ میں آتا ہے وہ کھل کر کہہ دیتے ہیں۔ہندیاترا میں ان کے واقعات کے ساتھ ساتھ ان کا فکری نظام بھی سامنے آتا ہے۔جسے وہ قاری پر مسلط نہیں کرتے بلکہ قاری کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

ہندیاترا۔موضوعات

موضوعات کے اعتبار سے ہندیاترا،گوناگوں پہلو سمیٹے ہوئے ہے۔اس میں ان کے پاس ڈھیروں موضوعات ہیں۔ان کا ایک موضوع تو دلی کے گلی کوچوں کے احوال ہیں۔ایک جگہ پر انھوں نے عرس کی تقریبات کی تفصیل بیان کی ہے۔ان کا ایک اہم موضوع اس سفرنامہ میں امرتسر شہر کی طوائفیں ہیں۔انھوں نے ان طوائفوں پر کمال انداز میں لکھا ہے۔وہ کہتے ہیں کہ امرتسر کی طوائفیں ایسی طاقتور ہستی کے طور جانی جاتی ہیں کہ ان کی ساڑھی کے پلو سے کئی شریف زادوں اور نوابوں کی بیویاں بندھی نظر آتی ہیں۔وہ ان میں اپنی اس چھوٹی عمر کی محبوبہ کا روپ ڈھونڈتے ہیں۔جو ان کی سوانح عمری ''علی پور کا ایلی'' میں مختلف ناموں سے جلوہ گر ہوتی رہتی ہے۔ممتاز مفتی کا ایک اور اہم موضوع اس سفرنامے میں ایک خالص جذبہ ہے۔جسے ''پاکستانیت'' کہا جاتا ہے۔انھوں نے جنس پر،معاشرت پر تصوف پر اور نفسیات پر بات کی لیکن ان کا مرکزِ قلم ایک نقطہ رہا اور وہ یہی جذبہ پاکستانیت ہے۔اس موضوع کی فضا پورے سفرنامے پر چھائی ہوئی ہے۔ان کا سفر ہر جگہ اور ہر موڑ پر اس جذبے کو لیے ہوئے چلتا ہے۔انھوں نے 1947ء میں بھارت کے شہر بٹالہ سے ہجرت کی۔اور پاکستان آئے تھے۔اپنی زندگی کے ابتدائی بیالیس سال وہ وہاں کے مختلف شہروں میں گزار چکے تھے۔ان شہروں سے ان

کی جذباتی وابستگی لازماً ہوناتھی۔لیکن اس سفرنامہ میں انھوں نے اس جذباتی کیفیت میں بہہ جانے سے خودکو بچایا۔اور ہرجگہ پر اپنے ''پاکستانی'' وجودکو قائم ودائم رکھا۔

دوسری وجہ تصنیف:

مفتی صاحب کے اس سفرنامے کی تخلیق کی ایک وجہ جو پہلے بیان کی جاچکی ہے۔یعنی ہومیو پیتھی کتابوں کی تلاش اور عرسِ امیرخسرو کی روداد تھی۔لیکن اس کتاب کوتحریر کرنے کی دوسری اہم وجہ جذبہ پاکستانیت تھا۔ ۲۵؎

انھوں نے صدیوں تک ساتھ ساتھ رہنے والی دو بڑی قوموں ہندو اور مسلمان پر بہت کچھ لکھا ہے۔ انکے تاریخی پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ان کے ثقافتی ورثہ پر بحث کی،ان کے سیاسی ماحول پر بات کی،جغرافیائی اشتراکات اور امتیازات پرلکھا ہے۔مفتی صاحب کے قلم نے ان دوقوموں کی نفسیاتی شناخت اور انفرادی و اجتماعی ردِعمل کا تجزیہ کیاہے۔ انھوں نے مسلمانوں اور ہندوؤں کے مزاج میں دور موجود رجحانات پر بحث کی۔ماضی میں ان دونوں قوموں کے کیاحالات تھے۔ان کی جغرافیائی کیفیت کیاتھی،آب وہوا کے لحاظ سے ان دونوں قوموں کے مزاج پر کیااثرات پڑے۔غذائی اجزااوراشیائے خوردونوش نے ان کے نسلی اور وراثتی اندازکو کیسے متاثر کیا۔مذہب ان کے روزمرہ کے مسائل پر کیسے اثر انداز ہوتا ہے۔ان کی عادات اور اطوار کیسے ایک مخصوص سانچے میں ڈھل جاتے ہیں۔ان دونوں قوموں کو ساتھ رہنے میں کون کون سے منفی واقعات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔اور کونسے فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ دونوں قوموں نے ایک دوسرے سے کیا حاصل کیا۔ایک قوم کی عادات دوسری قوم میں منتقل ہوئیں یانہیں۔ان دونوں نے اپنا اپناتشخص کیسے قائم رکھا،ان سب موضوعات پرمفتی صاحب نے ترتیب سے اورتفصیل سے لکھا۔

ہندوقوم کے بارے میں:

ممتازمفتی نے ہندوقوم کے بارے میں علیحدہ سے اورمسلمانوں کے بارے میں الگ سے بھی تفصیلی بحث کی۔ہندوقوم کےمتعلق ان کا خیال ہے کہ یہ ایک عظیم قوم ہے۔سادہ مزاج ہے،عاجزی اور انکساری سے پیش آتی ہے۔ ان کے لہجے میں ایک تحمل ہوتا ہے۔مٹھاس ہے ۔اورایک سب سے بڑی خوبی اس قوم کی یہ ہے۔کہ اس میں اپنا لینے کی قوت موجود ہے۔یہ دنیا کے بڑے بڑے مذاہب کو اپنے اندر سمو لینے والی قوم ہے۔اس ضمن میں مفتی صاحب بدھ مت مذہب کی مثال دیتے ہیں کہ اس مذہب کی طاقت نے سارے ایشیا کو ہلا کررکھ دیا تھا۔اس نے سارے فرق ختم کردیے تھے۔انسان کو انسانیت کومرتبہ بخشا۔لیکن کیاہوا کہ ہندو مذہب نے اس مذہب کو اپنے اندر جذب کرلیا اور بدھ مت کی علیحدہ پہچان نہ رہی ایک اور مذہب جین مت بھی ہندو قوم کی اپنا لینے والی عادت سے ہندومت میں جذب ہوگیا،اس کی علیحدہ پہچان بھی ختم ہوگئی۔

اس معاملے میں مثالیں دیتے ہوئے ممتاز مفتی سکھ مذہب کی مثال دیتے ہیں۔اس مذہب کی علیحدہ پہچان آج تک قائم ہے۔یہ ہندوؤں میں گم نہیں ہوا۔ان کی اس الگ پہچان کی وجہ ان کے مذہب کی پانچ خصوصیات ہیں ۔ان خصوصیات سے سکھ مذہب جڑا ہوا ہے۔اور اپنی الگ سے شناخت رکھتا ہے۔یہ پانچ خصوصیات کچھ، کڑا، کرپان، کیس اور کنگھا ہیں۔ ہندو مذہب خود کو طاقت ور بنانے کے لیے دوسرے مذہب کو اپنے اندر سمو لیتا ہے۔تا کہ دوسرے کی پہچان ہی ختم ہو جائے ۔ ہندو قوم کو مسلمانوں سے یہی تو شکایت ہے کہ وہ ان کے مذہب کے اندر خود کو گم کیوں نہیں کرتے۔

اپنائیت کا دار

ہندیاترا میں ممتاز مفتی اپنے سفر نامے میں ہندوستان میں پیش آنے والے واقعات کا جائزہ اس تناظر میں بھی لیتے ہیں کہ جب مسلمان ہندوستان میں اپنے ادبی دورے پر جاتے ہیں۔تو ان پر اپنائیت کا ایک وار کیا جاتا ہے۔ اپنائیت کا وار یہی ہے کہ وہاں جانے والے مسلمانوں کے آگے ہر ہندو جھکتا ہے۔ان کے آگے ہاتھ باندھ کر یہ کہتا ہے۔''مہاراج ۔ہم تو ایک ہیں ۔یہ بارڈر کی دیوار، یہ تقسیم کا جھگڑا تو جھوٹا ہے۔''
یعنی ہندو اپنے اس رویے پر آج بھی قائم ہیں کہ دوسرے مذاہب کو خود میں مدغم کیا جائے۔ ہندو قوم کے ان میلانات پر ممتاز مفتی کا قلم ایسی روانی سے چلتا ہے۔کہ یہ سفر نامہ ہندیاترا محض ایک سفر نامہ نہیں رہ جاتا بلکہ ایک فکر انگیز اور عمل انگیز قسم کا فلسفیانہ انشائیہ بن جاتا ہے۔

تصوف ۔ایک بڑا موضوع

ہندیاترا میں بیان کیے جانے والے مختلف موضوعات میں سے ایک بہت اہم ، بلکہ اس کتاب کا دوسرا بڑا موضوع تصوف ہی ہے۔مفتی صاحب نے اس موضوع پر کافی بحث کی۔مسلمانوں کے اولیاء کرام اور صوفیائے عظام کا تعارف کروایا۔انھوں نے ہندوستان میں موجود صوفیائے کرام کی معروف لڑی کے بارے میں لکھا۔انھوں نے اس لڑی کے پانچ جید علما کرام کے بارے میں تفصیلاً لکھا۔اس لحاظ سے یہ سفر نامہ ایک معلوماتی مضامین کا ایسا مجموعہ ہے۔جس میں مختلف النوع موضوعات کا اظہار ملتا ہے۔

اولیائے کرام کا تعارف

پانچ اولیائے کرام ،جن کا تعارف ممتاز مفتی نے کروایا ان میں سے لاہور کے معروف اور جید صوفی علی بن عثمان ہجویری المعروف داتا گنج بخش ہیں۔دوسرے نمبر پر انھوں نے خواجہ غریب نواز کے بارے میں لکھا، تیسرا خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کا تذکرہ کیا۔چوتھا تذکرہ پاکپتن کے بابا فریدالدین گنج شکر کا ہے۔جبکہ پانچویں بزرگ حضرت نظام الدین اولیا ہیں۔صوفیائے کرام کے بارے میں ممتاز مفتی رائے زن ہیں کہ ان کا

درجہ اس قدر بلند ہے کہ ان کا مقام صرف نبی کریم ﷺ جانتے ہیں۔ کیونکہ ان اولیا کرام کو فیض کا جو نور ملتا ہے۔یا جو روحانیت کی شعاعیں ان تک پہنچتی ہیں اس کا منبع صرف حضور نبی کریم کی ذاتِ بابرکات ہے۔

ممتاز مفتی کے لہجے میں جو احترام اور عقیدت حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کا ذکر کرتے ہوئے نظر آتی ہے۔ وہ قابلِ غور ہے۔اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ یہ بزرگ قدرت اللہ شہاب کے روحانی رہنما تھے۔ انھوں نے ''نائنٹی'' کے روپ میں قدرت اللہ شہاب کی رہنمائی کی۔قدرت اللہ شہاب کے ایک اور عقیدت مند صدیق راعی نے بھی اس بات کا اظہار کیا کہ حضرت قطب الدین ''نائنٹی'' کے نام سے کئی سال تک شہاب صاحب کی تربیت کرتے رہے۔مفتی صاحب کے لہجے میں اس بزرگ کے بارے میں جو عقیدت و احترام ملتا ہے۔اس سے یہ بھی لگتا ہے۔کہ مفتی صاحب نے ہندوستان کا سفر اس بزرگ کے دربار پر حاضری دینے کی نیت سے کیا ہو۔اور ہومیو پیتھی کی کتابوں کا حصول محض ایک بہانہ ہو۔ممتاز مفتی کی عقیدتوں کی ایک جھلک ان کے سفر نامہ ہندیاترا کے صفحات میں ملتی ہے۔ایک جگہ فرماتے ہیں۔

> پتہ نہیں قطب صاحب کے مزار کو میں اتنی اہمیت کیوں دے رہا تھا۔میرا جی چاہ رہا تھا کہ رک جاؤں۔خود کو کسی ڈھنکی میں ڈال دوں۔جہاں میری روح کا بند بند دھنکا جائے۔میرے قلب کا کثیف لوگڑ رواں رواں ہو کر لطیف ہو جائے، میرے دل، روح اور ذہن کی آلائشیں صاف ہو جائیں۔ ۲۶؎

یہ اور اسی طرح کی کیفیات جا بجا ملتی ہیں۔ یہ ممتاز مفتی کی حضرت قطب الدین سے خاص نسبت اور انس کا نتیجہ ہے۔ دوسرے بزرگوں کے مزارات پر حاضری کے تجربے بھی اس سفر نامہ کا حصہ ہیں۔

ان صوفیائے کرام کی کرامتوں کا ذکر کرتے ہوئے ممتاز مفتی ان بزرگوں کی سب سے بڑی کرامت اور معجزہ ان کے کردار کو قرار دیتے ہیں۔ وہ اس کردار کو ''طلسمِ اعظم'' سے تعبیر کرتے ہیں۔وہ کہتے ہیں کہ یہی طلسمِ اعظم تھا جو عوام کو دیوانہ بنالیتا تھا۔اس ضمن میں ڈاکٹر نجیبہ عارف نے اپنی کتاب ممتاز مفتی، شخصیت اور فن میں لکھا ہے۔

> محبت اور رواداری ہی ان کا ہتھیار تھا۔برصغیر میں اسلام انہی دو تلواروں کے زور سے پھیلا۔ان کے دربار حقیقی دربار تھے۔جہاں بادشاہ اور منگتے ایک ہی صف میں کھڑے ہوتے تھے۔اور انسانی مساوات کا وہ مظاہرہ دیکھنے کو ملتا تھا جو دورِ حاضر کی بڑی بڑی جمہوریتوں میں بھی نایاب ہے۔ ۲۷؎

ممتاز مفتی کا فنِ سفر نامہ نگاری ان کے دو سفر ناموں لبیک اور ہندیاترا میں کھل کر سامنے آجاتا ہے۔یہ دو مختلف انتہاؤں کے سفر نامے ہیں۔جن میں ممتاز مفتی کی پوری شخصیت ان کے سفر نامہ نگاری کے فن

میں سامنے آجاتی ہے۔ ہندیاترا میں بزرگانِ دین کی برصغیر میں خدمات اور ان کی شخصیات پر بات کرتے ہوئے ممتاز مفتی کے لہجے میں عقیدت کی جھلک دکھائی پڑتی ہے۔ یہ عقیدت، تصوف کی بات کرتے ہوئے درجۂ انتہا کو پہنچ جاتی ہے۔ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کے مزار پر حاضری کی کیفیت بیان کرتے ہوئے ان کے قلم کی زور بیانی دیکھئے کہ وہ کیسے کیفیات کو الفاظ کا روپ دیتے ہیں۔ کہتے ہیں۔

> کچھ دیر کے لیے، کچھ لمحات کے لیے، جتنی دیر میں حضرت کے سامنے کھڑا ہوں، یااللہ مجھے کچھ دیر کے لیے پاکیزگی عطا کر دے، کہ میں حضرت کے روبرو کھڑے ہونے کے لائق بن جاؤں۔ ۲۸

ذاتی نقطۂ نظر

مذہب اور تصوف کی بات کرتے کرتے ممتاز مفتی اپنا نقطۂ نظر بیان کرنے سے نہیں چوکتے۔ مذہب اور تصوف کے علاوہ بھی ان کے ہاں مختلف موضوعات اور ان موضوعات پر ان کے نقطۂ نظر جابجا ملتے ہیں۔ انھوں نے اس سفرنامے میں ہومیوپیتھی طریقہ علاج پر گفتگو کی۔ اور اس طریقہ علاج کی کرامتیں بتانے کی کوشش کی۔ اس کے علاوہ بیویوں کی فرمائشوں کا رونا رویا ہے۔ مانوسیت کے جھمیلوں پر قلم اٹھایا ہے۔ گیت سنگیت پر بھی مفتی صاحب نے اپنے ذاتی نقطۂ ہائے نظر بیان کیے ہیں۔ لمسِ محبوب کے دلفریب مضامین تحریر کیے ہیں۔ اہلِ زبان کیسے اٹھتے بیٹھتے ہیں۔ کیسے بولتے ہیں۔ یہ سب لکھا ہے۔ ہندوستانی مسلمان جس خوف اور بے چینی سے اپنے شب و روز گزارتے ہیں اس بارے میں لکھا ہے۔ مفتی صاحب نے دعا مانگنے کا سلیقہ، مانگنے کا طریقہ اور زندگی کے ایسے ایسے مسائل پر بات اس انداز سے کی ہے۔ کہ روز مرہ کے عام مسائل ان کے جملوں کی رنگینی میں لپٹ کر ایک نئے زاویے سے پر لطف بن کر ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ اور ہم انھیں دلچسپی سے جاننا شروع کر دیتے ہیں۔ اس سفرنامہ میں جگہ جگہ کہانیاں، واقعات اور مشاہدات بکھرے پڑے ہیں۔ عام سی بات کو خاص بنا دینا۔ ممتاز مفتی کا وصف ہے۔

ڈاکٹر رشید امجد نے ہندیاترا کو شائع کیا تو اس کے آغاز میں اپنا نقطۂ نظر دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> ممتاز مفتی کے اس سفرنامے میں کئی چھوٹی چھوٹی کہانیاں اور افسانے جگہ جگہ بکھرے ہوئے ہیں۔ ان میں بظاہر معمول کیا تیں ہیں۔ لیکن مفتی نے انھیں غیر معمولی بنا دیا ہے۔ اس وجہ سے یہ ایک معمول کا سفرنامہ نہیں بلکہ دائرہ در دائرہ ایک پیچیدہ سفر ہے۔ جو خارج سے باطن اور باطن سے خارج میں آکر ایک تاریخی روپ اختیار کر لیتا ہے۔ اس سفرنامے میں انھوں نے کسی ازم کا نعرہ نہیں لگایا لیکن پورے سفر میں ان کی پہچان ایک مسلمان کے حوالے سے ہوئی۔ ان کے سارے حوالے مسلم فکر اور روحانیت کی کوکھ سے پھوٹتے ہیں۔ ۲۹

حاصلِ کلام

مندرجہ بالا حوالوں اور حواشی سے یہ بات اظہر من الشّمس ہے کہ ممتاز مفتی فنِ سفر نامہ نگاری میں یکتائے روزگار شخصیت ہیں۔ان کے قلم نے افسانوں، کہانیوں، سوانح عمری کے ساتھ ساتھ سفر نامے میں بھی اپنے بھر پور فن کا مظاہرہ کیا ہے۔ان کے سفر نامے عام انداز سے، عام ڈگر سے ہٹ کر ہوتے ہیں۔وہ بات کو ایسے بے ساختہ، اور بے تکلف انداز میں کرتے ہیں۔کہ ان کا ہر ہر جملہ اپنا لطف اور تاثر چھوڑتا ہے۔وہ واقعات کو ایک مربوط کڑی میں پروئے ہوئے چلتے ہیں اور ہر ہر واقعہ پر اپنے ذاتی نقطۂ نگاہ کی چھاپ لگاتے جاتے ہیں۔قاری ان کی تحریر کے سحر میں کھو جاتا ہے۔لبیک اور ہند یاترا کے غائر مطالعہ سے ہمیں اس حقیقت کا ادراک ہو جاتا ہے۔کہ سفر نامہ لکھنا باقاعدہ ایک فن ہے۔اس فن میں بہت کم لوگ طاق ہوتے ہیں۔ لیکن اس فن کے ماہر ادیبوں میں ایک نمایاں اور اہم نام ممتاز مفتی کا ہے۔ممتاز مفتی بطور سفر نامہ نگار ہمیں اس افق کے درخشندہ ستارے دکھائی دیتے ہیں۔جس کی جھل مل روشنی میں آنے والے سفر نامہ نگار اپنے فن کی جزئیات کو درست کرتے ہیں۔اور ان سے رہنمائی لیتے ہیں۔ممتاز مفتی ایک افسانہ نگار اور کہانی نویس کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ان کے افسانے اردو ادب کا گراں قدر سرمایہ ہیں۔وہ ان میں اپنے نظریات، ذاتی تجربات، اور مشاہدات قلم بند کرتے ہیں۔خودنوشت لکھنے پر آئے تو بھی انہوں نے کمال کیا۔دو حصوں میں اپنی خودنوشت کو مکمل کر کے انھوں نے کہیں بھی اکتاہٹ اور بوریت کا احساس اجاگر نہیں ہونے دیا۔یہ دونوں کتب خاصے کی چیز ہیں، پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ان کا سفر نامہ حج ان کی زندگی کی اہم ترین تصنیف ہے۔ان کی اس تصنیف سے قبل ان پر جنسی لکھاری کی چھاپ تھی جو بعد میں بھی رہی۔ان کی شخصیت لوگوں کی نظروں میں ایسی نہ تھی کہ وہ ایک مقدس سفر کی داستان ایسے جذباتی انداز میں لکھ سکتے ہیں۔لہٰذا ان پر مشکوک نگاہ رکھنے والوں نے اسلامی طنز نگار اور روس کا ایجنٹ کہا۔اور اس کے برعکس انھیں مذہبی مصنف اور خدا سے ملاقات کرانے والا بھی کہا گیا۔بہت سے لوگوں نے ممتاز مفتی کی اس تصنیف کو عقلیاتی، موضوعاتی اور وجدان سے بھر پور قرار دیا۔وہ اپنی تحریروں میں اشیاء کا تعارف ایک نئی طرح سے کرواتے ہیں۔ایک نئے زاویئے سے منظر دکھاتے ہیں اور علیحدہ انداز سے بات کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔

ہندوستان کے مختلف شہروں اور پیر باباؤں کے مزاروں کے مناظر، لفظی تصویریں بنا کر اپنے قاری کو دکھاتے ہیں۔طوائفوں کے رسوم و رواج اور طرزِ معاشرت کو دلچسپی سے قلم بند کرتے ہیں۔لیکن جہاں بھی جاتے ہیں اپنے اندر موجود پاکستانی کو زندہ رکھتے ہیں۔وطن کی محبت سے زیادہ وہ مذہب کی محبت کو مقدم جانتے ہیں۔ تصوف ان کی تحاریر میں جا بجا دکھائی دیتا ہے۔وہ اپنے ذاتی خیالات اور نقطۂ نظر کو بیان کرنے سے ذرا بھی نہیں چُوکتے۔محبوب کے لمس کہ خواہشیں ہوں یا ہجر و فراق کی آہیں، وصل کے قیمتی لمحات ہوں یا پھر محبوب کے دیدار

کی لذت سے بہرہ ورہونے کی ساعتیں ہوں، اچھی طرح لکھتے ہیں۔بے لاگ لکھتے ہیں اور بے خوف لکھتے ہیں۔ان کی تحریروں میں ایک خاص قسم کی رومانوی اور اداسی کی فضا برقرار رہتی ہے۔عورتوں کے ہر روپ کو خاص دلچسپی سے بیان کرتے ہیں۔اپنے ایک خاص اسلوب کے حامل ہیں۔اور اس اسلوب پر کاربند دکھائی دیتے ہیں۔

مستنصر حسین تارڑ۔احوال

مستنصر حسین تارڑ ''جوکالیاں'' گاؤں ضلع منڈی بہاؤالدین میں یکم مارچ 1939ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد رحمت تارڑ نے اپنے علاقہ میں ایک بیج سٹور کھولا۔جو بعد میں ایک زرعی میدان میں بہت بڑا بزنس بن گیا۔اس وقت مستنصر حسین تارڑ نوجوان تھے۔ابتدائی تعلیم انھوں نے رنگ محل مشن ہائی سکول سے اور ماڈل ہائی سکول سے حاصل کی۔اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے انھوں نے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ دورانِ تعلیم آپ نے زیادہ وقت فلمیں دیکھنے اور دوستوں کے ساتھ گھومنے پھرنے میں گزارا۔کتابیں پڑھنے کا شوق بھی ساتھ ساتھ جاری رہا۔1958ء میں مستنصر حسین تارڑ نے روس کے شہر ماسکو میں منعقد ہونے والے ورلڈ یوتھ فیسٹیول میں شرکت کی۔اور اس سفر کی داستان ایک کتابی صورت میں لکھی۔اس کتاب کا نام انھوں نے'' فاختہ'' رکھا۔اس میں ماسکو کے سفر کے واقعات کو دلچسپ پیرائے میں بیان کیا گیا۔اور یوں وہ بطور سفر نامہ نگار،اعلیٰ خوبیوں کے حامل مصنف بننے کی راہ پر گامزن ہو گئے۔اس کے بعد انھوں نے لکھا، بہت لکھا اور خوب لکھا۔ڈرامے، ناول اور سفرنامے ہر صنف میں لکھا۔

تصانیف:

مستنصر حسین تارڑ نے پچاس سے زائد کتب لکھیں جن میں ناول اور افسانوں کا ایک مجموعہ شامل ہے۔ان کی پہلی کتاب نکلے تیری تلاش میں 1970ء میں شائع ہوئی۔جس کا انتساب اُنھوں نے اپنے چھوٹے بھائی مبشر حسین تارڑ کے نام کیا۔یہ کتاب ایک سفرنامہ ہے جو یورپ کے سترہ ممالک کے سفر کے حالات و واقعات کی صورت میں موجود ہے۔یہ سفرنامہ اتنا مقبول ہوا کہ اردو میں سفرنامہ کی روایت پیدا ہوگئی جو آج تک قائم ہے۔انھوں نے تقریباً چالیس سفرنامے لکھے۔مستنصر حسین کی تصانیف میں بہت سی کتب شامل ہیں۔جن میں ناول، ڈرامے اور سفرنامے شامل ہیں۔

۱۔ اندلس میں اجنبی	۲۔ بہائو
۳۔ بے عزتی خراب	۴۔ برفیلی بلندیاں
۵۔ کارواں سرائے	۶۔ چِک چُک

۷۔ چترال داستان
۸۔ دیس ہوا پردیس
۹۔ دیو سائی
۱۰۔ ڈاکیا اورجولاہا
۱۱۔ گدھے ہمارے بھائی ہیں
۱۲۔ غارِ حرا میں ایک رات
۱۳۔ گزارہ نہیں ہوتا
۱۴۔ جپسی
۱۵۔ ہزاروں میں شکوے
۱۶۔ ہزاروں راستے
۱۷۔ ہنزہ داستان
۱۸۔ کیے ٹو کہانی
۱۹۔ کالاش
۲۰۔ خانہ بدوش
۲۱۔ مورت
۲۲۔ ماسکو کی سفید راتیں
۲۳۔ منہ ول کعبے شریف
۲۴۔ نانگا پربت
۲۵۔ نیپال نگری
۲۶۔ نکلے تیری تلاش میں
۲۷۔ پکھیرو (پنجابی)
۲۸۔ پرندے
۲۹۔ پرواز
۳۰۔ خس و خاشاک زمانے
۳۱۔ الاسکا
۳۲۔ آسٹریلیا آوارگی
۳۷۔ کہانیاں
۳۸۔ راکاپوشی نگر
۳۹۔ امریکہ کے سو رنگ
۴۰۔ اور سندھ بہتا رہا
۴۱۔ لاہور آوارگی
۴۲۔ پیار کا پہلا شہر
۴۳۔ سیاہ آنکھ میں تصویر
۴۴۔ تارڑنامہ

مستنصر حسین تارڑ اعلیٰ پائے کے ناول نگار اور سفرنامہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ بہت اچھے ڈرامہ نگار بھی ہیں۔ان کے تحریر کردہ ڈرامے پاکستان ٹیلی وژن پر پیش کیے گئے۔جو لازوال ڈرامے ثابت ہوئے۔

ان کے معروف ڈرامے یہ ہیں۔

۱۔ ہزاروں راستے
۲۔ پرندہ
۳۔ شہپر
۴۔ سورج کے ساتھ ساتھ
۵۔ کیلاش
۶۔ فریب

۷۔ ایک حقیقت ایک افسانہ

اعزازات:

انھیں 1992ء میں حکومت کی جانب سے ادب میں تمغۂ حسنِ کارکردگی سے بھی نوازا گیا۔وہ بیک وقت مصنف، اداکار، کالم نگار، ریڈیو میزبان ،کوہ پیا اور سفرنامہ نگار ہیں۔مستنصر حسین تارڑ نے پی ٹی وی پر اداکاری بھی کی۔اور بہت سے ڈراموں میں کام کیا۔ان کا انداز بے حد مقبول ہوا۔اور ان کے مکالمے لوگوں کا تکیہ کلام بن گئے۔

پی ٹی وی نے جب صبح کی نشریات کا آغاز کیا تو سب سے پہلے میزبان ہونے کا شرف مستنصر حسین تارڑ کو ہی ملا۔انھوں نے سات سال تک صبح کی نشریات کے میزبان کی حیثیت سے کام کیا۔اخبارِ جہاں کے لیے کارواں سرائے کے عنوان سے کالم لکھتے ہیں۔یہ سلسلہ عرصہ 30 سال سے جاری ہے۔ان کا سفرنامہ لندن سے ماسکو تک 1959ء میں ہفت روزہ قندیل میں شائع ہوا۔کتابی شکل میں ان کا سفرنامہ نکلے تیری تلاش میں 1971ء منظرِ عام پر آیا۔ان کے سفرناموں کی تعداد 30 ہے اور ناولوں کی تعداد 12 ہے۔ان کے سفرنامے نانگا پربت کو سال کی بہترین کتاب کا ایوارڈ دیا گیا اور صدرِ پاکستان کی جانب سے ''اکیڈمی آف لیٹرز ایوارڈ'' دیا گیا۔ان کے ناول راکھ کو جنوب مشرقی ایشیا کا نمائندہ ناول قرار دیا گیا۔گزشتہ صدی کے دس بڑے ناولوں پر بھارت میں ایک تحقیق کی گئی۔جس کے مطابق مستنصر جی کا ناول بہاؤ ان دس ناولوں میں شامل ہے۔

پکھیرو پنجابی زبان کا پہلا جدید ناول ہے جو بھارت کی گورونانک یونیورسٹی کے نصاب میں شامل ہے۔ان کی معروف کتب نکلے تری تلاش میں،فاختہ، اورپیار کا پہلا شہر دنیا کی کئی زبانوں میں ترجمہ ہو چکے ہیں۔اپنے سفرناموں میں مستنصر حسین تارڑ نے پاکستان کے حسین سیاحتی مقامات کو ایسے خوبصورت انداز میں پیش کیا جو مقامی سیاحت میں فروغ کا باعث بنا۔شمالی علاقہ جات میں ایک جھیل کو ''تارڑ جھیل'' کے نام سے منسوب کیا گیا ہے۔کے ٹو کہانی ایک ایسا سفرنامہ ہے جس نے فروخت کے ریکارڈ قائم کیے۔اس سفرنامہ کی تقریب رونمائی ایک ہوائی جہاز میں اس وقت کی گئی جب وہ عین کے ٹو پہاڑی کے اوپر محو پرواز تھا۔تارڑ صاحب کو پرائڈ آف پرفارمنس ایوارڈ، لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ، اور ماسکو اسٹیٹ یونیورسٹی کی جانب سے گولڈ میڈل برائے تحقیق وتصنیف دیا گیا۔مستنصر صاحب کے سفرناموں اور ناولوں میں نسوانی کرداروں کی بھرمار ہے،ان کا ان کرداروں کی جانب جھکاؤ اور قلبی وابستگی کے قصے بھی موجود ہیں۔

مستنصر حسین تارڑ نے ایک ہی شادی کی ،جو نہایت کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔ ان کے ایک بیٹے ''سلجوق'' اقوام متحدہ میں سفارت کار کی حیثیت سے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔دوسرے بیٹے ''سمیر'' محکمہ

کسٹم میں ڈپٹی کلکٹر ہیں۔ بیٹی قراۃ العین ڈاکٹر ہیں۔

مستنصر حسین تارڑ۔بحثیت سفر نامہ نگار

ڈرامہ نگار، اداکار، ناول نگار، اور کالم نگار ہونے کے ساتھ ساتھ مستنصر حسین تارڑ کی پہچان ایک سفر نامہ نگارطور پر ہے۔1958ء میں انھوں نے روس کا سفر کیا۔جس کی روداد انھوں نےہفت روزہ قندیل میں قسط وار چھپوائی۔جس کا عنوان تھا،ماسکو سے تاشقند تک اس کے بعد انھوں نے سیارہ ڈائجسٹ میں اپنا سفر نامہ نکلے تری تلاش میں شائع کروایا۔اس سفر نامہ نے اتنی مقبولیت حاصل کی کہ مستنصر حسین تارڑ مقبول ہوگئے۔ ان کی شہرت بحثیت سفر نامہ نگار آسمان کی بلندیوں کو چھونے لگی۔ یہ سفرنامہ کتابی شکل میں بھی شائع ہوا۔یہ جدید سفرنامہ نگاری کا نقطۂ آغاز تھا۔مستنصر حسین تارڑ کے سفرناموں کی تعداد 30 سے زائد ہے۔12 ناول اور دیگر اصناف اس کے علاوہ ہیں۔سفر نامہ نگاری میں مستنصر حسین تارڑ ید طولیٰ رکھتے ہیں۔وہ پڑھنے والوں کو حیرت کدوں سے روشناس کرواتے ہیں۔آنکھ سے اوجھل منظر کو سامنے لاتے ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ وہ سفر نامہ نگاری کے فن کو جدت بخشتے اور ادبی اسلوب عطا کرتے ہیں۔وہ اپنے قاری کو انگلی پکڑ کر ساتھ لے کر چل پڑتے ہیں۔اسے نگر نگر کی سیر کراتے ہیں۔محیر العقول اور ماورائے عقل مناظر کو آنکھ کے پردے پر جماتے ہیں۔ان کے بہت سے سفرناموں کو''بہترین'' کتاب کے اعزاز سے نوازا گیا۔

نکلے تیری تلاش میں:

نکلے تیری تلاش میں مستنصر حسین تارڑ کا وہ سفر نامہ ہے جو ان کی پہچان بنا۔اس سفرنامے میں ان کی روایتی منظر نگاری، سنسنی، سسپنس، ڈرامائی انداز اور تحریر پر گرفت نظر آتی ہے۔ان کا اپنا ایک اسلوب ہے۔وہ بات سے بات نکالنے کے عادی ہیں۔بات کو کہیں سے کہیں پہنچانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔مبالغہ کو مصلحت کا جامہ پہنانا جانتے ہیں۔ان کی یہ خوبیاں ان کے پہلے باقاعدہ سفرنامے نکلے تیری تلاش میں میں بھی موجود ہیں۔اور بعد کے آنے والے سفرناموں میں بھی یہ خوبیاں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ اپنے اکثر سفرناموں کی طرح اس سفرنامہ میں بھی انھوں نے خود کے لیے''میں'' کا صیغہ استعمال کیا ہے۔کہانی ایک دلچسپ موڑ سے شروع کی ہے۔اور احسن طریقے سے اسے آگے بڑھایا ہے۔ یہ سفرنامہ کتابی شکل میں نہایت خوبصورت گیٹ اپ میں موجود ہے۔سنگِ میل پبلی کیشنز نے اسے پہلی مرتبہ 1971ء میں شائع کیا۔سرورق پر سیڑھیوں کی ایک تصویر ہے۔جس کے پہلے زینے پر ایک نوجوان موجود ہے۔جبکہ آخری زینے پر ایک نوجوان لڑکی کی تصویر موجود ہے۔دائیں جانب ایک انگریز عورت کی تصویر ہے جبکہ پس منظر میں یورپ اور ایشیا کے مختلف شہروں کی خوبصورت عمارات کی تصاویر موجود ہیں۔

کتاب کو کھولیں تو پہلے ہی صفحہ پر وارث شاہ کا لکھا ہوا پنجابی زبان کا ایک شعر نظر آتا ہے۔

کونجاں وانگ مولیاں دیس چھڈے
اساں ذات صفات تے بھیس کہیا[۴۰]

یہ سفرنامہ اس وقت سے شروع ہوتا ہے۔ جب مستنصر صاحب یورپ میں چھ ماہ سیاحت کرنے کے بعد وطن واپس لوٹ رہے ہیں۔ ترکی سے روم کا سفر کر رہے ہیں۔ ان کے شیڈول میں یہ ہے کہ روم سے وہ ایران، ایران سے افغانستان اور اپنے دیس پاکستان پہنچیں گے۔ استنبول سے وہ ٹرین میں بیٹھ کر روم جا رہے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ ان کے پاس پیسے ختم ہو گئے تھے اور صرف لاہور تک کا کرایہ تھا۔ ان کے سامان کی تلاشی ریلوے کا گارڈ لیتا ہے اور کچھ سامان ضبط کر لیتا ہے۔ اور اس پر کسٹم ڈال دیتا ہے۔ اس روداد کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ وہ ٹرین کی کھڑکی سے نظر آنے والا منظر اور ٹرین میں چڑھنے اترنے والے لوگوں کے بارے میں تفصیلاً بتاتے چلے جاتے ہیں۔ شہروں کے ماحول کی معلومات بھی دیتے ہیں۔ پرانی سرخ چھتیں، تنگ گلیاں، انار کے باغات، پیچھے سرسبز پہاڑ، جنگلوں میں شہد اور پس منظر میں نیلگوں بحیرۂ اسود بہت خوبصورت نظر آتے ہیں۔

منظر نگاری

مستنصر حسین تارڑ کے سفرناموں میں منظر نگاری کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھے ہوئے منظر کو ایسی چابکدستی سے بیان کرتے ہیں کہ پڑھنے والے کی آنکھوں کے سامنے بھی وہی منظر ابھر آتا ہے۔ اسے ایسا لگتا ہے جیسے وہ سفرنامہ نہیں پڑھ رہا بلکہ کوئی دستاویزی فلم دیکھ رہا ہو۔ جس میں منظر اور منظر کے بارے میں معلومات، دکھائی اور بتائی جا رہی ہیں۔ ارضِ روم میں جب وہ شیفتہ مدرسے میں پہنچتے ہیں تو وہاں کا منظر یوں بیان کرتے ہیں:

> ساری عمارت خاموشی کے ایک تالاب کی مانند تھی۔ دیوار کی شکستہ اینٹوں میں سے پانی رِس رِس کر میرے قدموں تلے جمع ہو رہا تھا۔ میرے کانوں سے بنسری کی لے اور ڈھول کی تھاپ ٹکرائی۔ دھیمی اور سحر انگیز دھن، سلا دینے والی دھن، درویشوں کے ناچ کی دھن، لمبے چغے اور تربوش پہنے ہوئے درویش، درویشوں کا روحانی ناچ۔ ایک متحرک دائرہ اور وی آنا کے والز کے قدم۔ ایک دو تین اور گھوم جاؤ۔ لے تیز ہو چلی تھی۔ مجھ پر وجد طاری تھا۔ میں کون ہوں۔ میں بھی تو درویش ہوں۔ میں پاس تو کچھ بھی نہیں۔ ارضِ روم مولانا روم، دما دم مست قلندر، علی دا پہلا نمبر۔ لیکن سہون شریف میں تو اتنی سردی نہیں ہوتی۔ [۴۱]

ایران اور افغانستان اور پھر درۂ خیبر سے ہوتے ہوئے جب مستنصر حسین تارڑ اپنے گھر پہنچ جاتے ہیں تو کچھ دن انھیں رہٹ کے تازہ دم بیل کی طرح ایک چکر میں گھومنا اچھا لگا۔ گلے کی گھنٹی کی آواز نے مسحور کیے رکھا۔ لیکن جلد ہی مال روڈ پر پھرتے ہوئے اور شام کو ٹیلی وژن کے سامنے بیٹھ کر جماہیاں لیتے ہوئے

اکتانے لگے۔انھوں نے پھر سے گھٹن اور سکوت سے فرار ہونے کا فیصلہ کر لیا۔لوہے کے زنگ آلود صندوق میں سے پرانا خیمہ،تھیلا،کھانا پکانے کی اشیاء اور یورپ کے نقشے نکال لیے۔

تاریخی معلومات:

مستنصر حسین تارڑ کے سفر ناموں میں ہمیں ایک اور چیز جو بڑی واضح طور پر دکھائی دیتی ہے۔وہ ہے تاریخی معلومات وہ منظر بتاتے ہوئے ساتھ ساتھ اس کا تاریخی پس منظر بھی بتاتے جاتے ہیں۔یہ خصوصیت ان کے ہر سفر نامے میں ہے اور تقریباً ہر باب میں بھرپور طریقے سے نظر آتی ہے۔کابل میں قیام کے دوران افغانستان کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> سلطان محمود کی وفات کے بعد اس کا فرزند مسعود تخت نشین ہوا۔نئے سلطان کی تخت نشینی کے ساتھ ہی ترک قبیلوں نے بغاوت کا علم بلند کر دیا۔مسعود نے ان سے جنگ کی لیکن اس کی فوج کے ترک اپنے بھائیوں سے جا ملے۔مسعود کو شکست ہوئی۔اور غزنی کی شاہانہ عظمت زندقان کے میدان میں دفن ہو گئی۔غزنی کے جاہ و جلال کے دن پورے ہو چکے تھے۔1150ء میں افغان علاؤالدین غوری نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔مردوں کو تہ تیغ کر کے عورتوں اور بچوں کو غلام بنا لیا گیا۔سلطان محمود کے تعمیر کردہ محلات اور عمارات کو بالکل تباہ کر دیا گیا۔اور شہر کو آگ لگا دی گئی۔غزنی سات دن تک جلتا رہا۔اور مہینوں سلگتا رہا۔یوں اس شہر کی بے مثال خوبصورتی اور عظمت تاریخ کے صفحوں پر منتقل ہو گئی۔ ۳۲

درج بالا اقتباس سے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم کوئی سفر نامہ نہیں بلکہ کوئی تاریخ کی کوئی کتاب پڑھ رہے ہیں۔یوں لگتا ہے جیسے مستنصر حسین تارڑ جہاں بھی جاتے ہیں سب سے پہلے وہاں کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں۔یا پھر وہاں کے لوگوں سے تاریخ کے بارے میں پوچھتے رہتے ہیں۔تبھی تو ان کے ہر ہر واقعہ اور ہر مقام سے متعلق تاریخی معلومات جھلکتی ہیں۔کرنل محمد خان کہتے ہیں:

> مستنصر حسین تارڑ کے سفر نامے قدیم اور جدید سفر ناموں کا سنگھم ہیں۔ان میں پرانے سفر ناموں والی معلومات بھی ہیں اور ماڈرن سیاح کا چمکتا ہوا مشاہدہ بھی۔اس کا قاری بیک وقت ماضی اور حال میں سفر کرتا ہے۔ماضی کا نقشہ جمانے کے لیے مستنصر تاریخ کا سہارا لیتا ہے۔اور حال کو بیان کرنے کے لیے وہ اپنے مشاہدے پر اکتفا کرتا ہے۔پہلی صورت میں اختلاف رائے ممکن ہے۔کہ خود مورخین میں اختلاف ہے۔لیکن دوسری صورت میں نہیں کہ مستنصر کا مشاہدہ کھرا،خالص اور ناقابلِ تردید ہے۔ ۳۳

مستنصر حسین تارڑ کی تاریخی معلومات میں صرف عمارات اور شہروں کی ہی نہیں بلکہ لوگوں کی،قبیلوں

کی نسلوں کی اور انسانی رویوں کی تاریخ بھی ملتی ہے۔وہ کسی علاقے کے متعلق معلومات کو اکٹھا کرتے ہیں۔کتابوں سے ، اخبارات سے،رسالوں سے،مقامی لوگوں سے ،عمارات سے، جا بجا لگے اشتہارات سے اور اپنے ہم سفروں سے، وہ یہ سب معلومات اکٹھی کر کے اسے اپنی تحریر کا حصہ بناتے ہیں۔تحریر ان کے سفرنامے کا حصہ بنے یا ان کے کالم کا۔ ہر لحاظ سے پر مغز اور نتیجہ خیز ہوتی ہے۔وہ کسی قوم کے نفسیات کے متعلق بھی معلومات بہم پہنچاتے ہیں۔اپنے سفرنامہ نکلے تری تلاش میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ترک لوگ جانوروں سے بے پناہ محبت رکھتے ہیں۔یہاں تک کہ گھوڑا گاڑی کا کوچوان اپنے پاس چابک رکھنا بھی گناہِ کبیرہ سمجھتا ہے۔اسی طرح استنبول کی تمام مساجد کے باہر آپ کو کبوتروں کو غول کے غول ملیں گے۔چھوٹے بچے اور بوڑھی عورتیں کبوتروں کا دانا بیچ رہے ہوتے ہیں۔ ۳۴

نکلے تری تلاش میں کا مطالعہ کریں تو تاریخ جابجا بکھری ہوئی ملتی ہے۔ایسے لگتا ہے جیسے کسی تاریخی کتاب کا مطالعہ کررہے ہوں۔لیکن اندازِ تحریر ایسا ہے۔کہ ذرا بھی خشکی اور بوریت کا احساس نہیں ہوتا۔استنبول میں جس وقت مستنصر حسین تارڑ ''آیوپ'' مسجد پہنچے تو انھوں نے مسجد اور قسطنطنیہ کا مکمل تاریخی پس منظر قارئین تک پہنچا دیا۔لکھتے ہیں:

> مسلمانوں نے قسطنطنیہ ایک ہی حملے میں فتح نہیں کر لیا تھا بلکہ اس کے لیے انھیں سینکڑوں برس کی پیہم جدوجہد کرنی پڑی۔سب سے پہلی مہم امیر معاویہ کے عہد میں عبدالرحمٰن بن خالد بن ولید کی قیادت میں بھیجی گئی۔محاصرے کے دوران سیف اللہ کا بیٹا وفات پا گیا۔اور ابو سفیان کو قائد چن لیا گیا۔اس لشکر میں یزید بن معاویہ کے علاوہ حضرت ابو ایوب انصاری بھی شامل تھے۔محاصرہ چھ برس تک جاری رہا۔اس دوران حضرت ابو ایوب انصاری بھی رحلت فرما گئے۔اور ان کی وصیت کے مطابق انھیں استنبول کی فصیل کے پہلو میں دفن کیا گیا۔اس بہادر سپاہی کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے رومی جرنیل بھی جنازے میں شریک ہوئے۔مسلمانوں کو چونکہ رومیوں کی طاقت کا صحیح اندازہ نہ تھا،اس لیے یہ محاصرہ ناکام رہا۔ ۳۵

مندرجہ بالا اقتباس پڑھ کر کہیں سے بھی نہیں لگتا کہ یہ سفرنامہ کا اقتباس ہے بلکہ تاریخ کی کسی کتاب کا حصہ لگتا ہے۔

ڈرامائی انداز:

مستنصر حسین تارڑ کے سفرناموں کی ایک اور خوبی ان کا ڈرامائی انداز ہے۔وہ کسی واقعے کو ایسے الفاظ

میں پروتے ہیں کہ پڑھنے والوں کی آنکھوں کے سامنے نقشہ کھینچ جاتا ہے۔ڈرامائی انداز میں کہانی اور مواقع کی بنت بنتے ہیں۔اس طرح قاری کی دلچسپی بھی قائم رہتی ہے۔اور سفر کے احوال کی جزئیات تک ان کی رسائی بھی ہوجاتی ہے۔اندلس میں اجنبی میں ہسپانیہ کی سیاحت کے دوران انھیں بل فائٹنگ دیکھنے کا موقع ملا۔پہلے انھوں نے بل فائٹنگ کا پس منظر بیان کیا۔تفصیل سے بتایا کہ بل فائٹنگ ہسپانوی تہذیب وثقافت کا ایک ایسا جزو ہے جس کے بغیر ہسپانیہ کا کینوس بے رنگ ہوکر رہ جاتا ہے۔وہاں بل فائٹنگ کے بہت سے سکول ہیں۔جن میں ہزاروں کی تعداد میں نوجوانوں کو تعلیم دی جاتی ہے۔لیکن صرف چند نوجوان ہی کامیاب بل فائیٹر بن پاتے ہیں۔ایک اچھے بل فائیٹر کے لیے طاقتور ہونا بالکل ضروری نہیں۔تکنیک اور سائنس کی آمیزش کو بروئے کار لاکر وہ بُل کو اپنے بس میں کر لیتا ہے۔بعض اوقات بل فائیٹر ہلاک بھی ہوجاتا ہے۔مستنصر حسین تارڑ نے معلومات دیتے ہوئے بتایا کہ عظیم بل فائیٹر اکثر ٹی بی اور سفلس جیسے امراض کا شکار ہوتے ہیں۔ہسپانیہ کے طول وعرض میں بہت سے فارم ہیں۔جہاں اعلیٰ نسل کے بُل پالے جاتے ہیں۔جنہیں بل فائیٹنگ میں حصہ لینا ہوتا ہے۔

ہسپانوی قانون کے مطابق ایک بُل کو صرف ایک ہی مرتبہ فائٹ میں حصہ لینے کی اجازت تھی۔اگر وہ بل فائٹر کے ہاتھوں نہ مارا جائے تو اسے فارم میں لے جا کر ہلاک کر دیا جاتا ہے۔پھر جب بُل فائیٹر کے کھیل کا باقاعدہ آغاز ہوتا ہے۔تو مستنصر حسین تارڑ اس سارے واقعہ کو اپنے مخصوص ڈرامائی انداز میں یوں پیش کرتے ہیں۔

> بل فائٹ شاید ہسپانیہ کی وہ واحد تقریب ہے جس کا آغاز وقت مقررہ پر ہوتا ہے۔عین وقت پر پورا ہجوم بالکل خاموش ہوگیا۔اور سب کی نگاہیں سایہ دار حصہ میں واقع صدر کی کیبن، پر لگ گئیں۔صدر نے جو اس تقریب کا مختارِ کل ہوتا ہے۔اپنا معطر رومال فضا میں لہرا کر بل فائٹ کے شروع ہونے کا اعلان کیا اور اس کے ساتھ ہی بل رنگ میں بگل کی آواز گونجی اور شاہانہ لباس میں ملبوس دو گھڑ سوار سر پٹ دوڑاتے صدر کی کیبن کے عین نیچے آن رکے۔یہ گھڑ سوار ''ال کوسلز'' کہلاتے ہیں۔صدر کی کیبن کے نیچے پہنچ کر بل فائٹر اپنے ہیٹ اتار کر صدر کو کورنش بجالاتے ہیں اور پھر جلوس منتشر ہوجاتا ہے۔بل فائٹر رنگ کی گیلری کے پیچھے چلے جاتے ہیں۔اب بل رنگ میں داخل ہونے والے پہلے بل کے ساتھ لڑنے والا بل فائٹر اس کپڑے کا انتخاب کرتا ہے۔جسے لہرا کر بل سے کھیلا جاتا ہے۔یہ کپڑا ''کیپ'' کہلاتا ہے۔

مقامی زبان کے الفاظ کا استعمال:

مستنصر حسین تارڑ کا فن سفر نامہ نگاری بیان کرتے ہوئے ہمیں ان کے بہت سے محاسن کو جانچنے اور پرکھنے کا موقع ملتا ہے۔ان کی تحریر کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ جس علاقے،شہر یا ملک کی سیر کا واقعہ قلم بند کرتے ہیں ۔ وہاں کی مقامی زبان کے الفاظ کو بعینہ استعمال کرتے ہیں۔اور ان کا ترجمہ بھی بخوبی سمجھاتے ہیں۔ان کے اس اندازِ تحریر سے ان کی تحریر میں حقیقت جھلکتی نظر آتی ہے۔وہ مخصوص الفاظ جو اس علاقے کے لوگوں کی زبان سے ادا ہوتے ہیں۔انہی الفاظ کے ساتھ اپنی تحریر میں لاتے ہیں۔جسے بل فائٹنگ کے کھیل کے مخصوص الفاظ اور اصلاحات بتاتے ہیں۔پریڈکو ہسپانوی زبان میں ''پاسپوؤ'' گھڑ سواروں کو ''ال کوسلز'' چپڑاسیوں کو''باندریوز'' بل فائٹنگ کے کپڑے کا مخصوص انداز ''ویرونیکا''،مولیتا،براوَد،''اسائے تورو ساپے لاطین'' اور ''ہے تورو'' جیسے الفاظ مقامی زبان اور ان کے مفہوم اردو زبان میں مفہوم کے ساتھ ان کے مخصوص اسلوب کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔

''ہے تورو''۔۔۔''ہے تورو''تماشائی اپنے رومال ہیٹ اور پنکھے ہلا ہلا کر اسے اپنی جانب متوجہ کرنے کی کوشش کرر ہے تھے۔ ۳۷

اسی طرح جب وہ کھانا کھانے کے لیے ہوٹل میں پہنچے تو ان کے اور خوبصورت ویٹرس کے دوران جو مکالمہ ہوا وہ کچھ یوں تھا:

''کومیدا'' اس نے کولہوں پر ہاتھ رکھ کر ہسپانوی میں پوچھا ''ہاں ہاں کومیدا'' میں نے جواب دیا۔

''ہے انتونیو''

''کے استا سینوریتا''

''سالیدا''

''کے بابن''

''مچھی''

''ماچی''۔۔۔۔آپسکادو'' ۳۸

اسی طرح نکلے تری تلاش میں میں یورپ کے سفر کے دوران جب اٹلی کے شہر وینس میں پہنچتے ہیں تو وہاں کے مخصوص علاقائی الفاظ ان کے کرداروں کی زبان سے ادا ہوتے ہیں۔جیسے

''الا پوری ڈاچی روما''

''سیڈ''

''سان مثل''

''تری فوارے''

''ڈومسڈولا''

''گٹن مارگن ہرن''

''شیلے''۳۹؎

نسوانی کردار:

مستنصر حسین تارڑ کے سفر نامہ نگاری کے مخصوص اسلوب کی ایک اہم خصوصیت ان کے سفر کے دوران میں سامنے آنے والے نسوانی کردار ہیں۔ وہ ان کرداروں سے بخوبی کام لیتے ہیں۔ واقعہ میں جاذبیت ،دلکشی اور رعنائی کو قائم رکھتے ہیں۔ ان کے نسوانی کرداروں میں ایک اہم خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ مستنصر حسین تارڑ ان کی جانب ملتفت نہیں ہوتے بلکہ وہ نسوانی کردار ان کی جانب جھکے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اندلس میں اجنبی میں ہسپانیہ میں قیام کے دوران بل فائٹنگ کے سٹیڈیم میں مستنصر حسین تارڑ کی تصاویر کھینچنے والی لڑکی محض اس لیے ان کی تصاویر کھینچ رہی تھی کہ وہ ایک خوبصورت آدمی ہیں۔ وہ ان سے محبت کی بل فائٹنگ کھیلنا چاہتی تھی۔ جس میں بل وہ ہوں اور فائٹر وہ لڑکی ۔بل ہمیشہ ہار جاتا ہے اور فائٹر جیت جاتا ہے۔ اسی طرح نکلے تری تلاش میں میں یورپ کے سفر سے واپسی پر بس میں ملنے والی جو خوبصورت لڑکیاں جن میں سے ایک اپنے چھوٹے سے سویٹر کو بار بار نیچے کھینچتی ہے تاکہ اس کا پیٹ دکھائی نہ دے۔ لیکن پھر بھی اس کا پیٹ دکھائی دے ہی جاتا ہے۔

ان سفرنامے میں ''برن'' شہر میں ان کی ملاقات ژیلیا سے ہوتی ہے۔ جو انھیں ''برن'' شہر کی سیر کروانے کے لیے ساتھ جاتی ہے۔ ان کا دوست فرٹز کہتا ہے۔ کہ اسے ایک بہت ضروری کام ہے۔ لہذا میں ژیلیا کی ڈیوٹی لگاتا ہوں کہ وہ تمھیں برن کی سیر کروائے ۔اس نے اپنی کوئی مجبوری بتائی جیسے مستنصر حسین تارڑ نے اپنے لیے نہایت خوشگوار قرار دیا۔

> دوسری صبح میں ابھی سو رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجنی شروع ہوگئی۔ ''ہیلو'' میں نے جمائی لے کر چونکے میں کہا، ''مستنصر بول رہا ہوں''
>
> ''گڈ لاڈ'' دوسری طرف سے ایک نسوانی آواز آئی ''تم ابھی تک سو رہے ہو فرٹز نے مجھ سے کہا تھا کہ تمھیں برن کی سیر کے لیے صبح سویرے ہی لے جاؤں۔ فوراً تیار ہو کر ڈیسک پر

آجاؤ۔میں انتظار کر رہی ہوں۔"

ژلیا کا لہجہ اتنا نپا تلا تھا جیسے کوئی کاروباری تار لکھوا رہی ہو۔میں بول کر نیچے گیا تو وہ ڈیسک کے ساتھ ٹیک لگائے اخبار پڑھ رہی تھی۔

"مجھے افسوس ہے کہ تمھیں انتظار کرنا پڑا" میں نے معذرت کی۔

"تقریباً ساڑھے بارہ منٹ" اس نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا اور مجھ سے بالکل مردوں کی طرح ہاتھ جھٹک کر مصافحہ کیا۔ [۴۰]

اسی طرح جب مستنصر حسین تارڑ قرطبہ کی مسجد میں سیاحت کے دوران ایک امریکی لڑکی سے ملتے ہیں تو فریفتہ ہو جاتے ہیں۔وہ ایک لبنانی لڑکی ہے اور لیڈی ڈاکٹر ہے۔جو ایک کیتھولک عیسائی ہے۔لیکن بہت خوبصورت بھی ہے۔مستنصر حسین تارڑ حیران ہوتے ہیں۔اور بے دھیانی میں سگریٹ نکال کر پینا چاہتے ہیں۔لیکن وہ لڑکی جس کا نام "ناژ الاسعد" ہے۔انھیں منع کر دیتی ہے۔اور کہتی ہے کہ مسجد میں سگریٹ نہیں پیتے۔جب وہ اس لڑکی کو اپنی تصاویر اتارنے کا کہتے ہیں تو وہ کہتی ہے:

یہ تصویر اتارنے کی درخواست تو محض میرے ساتھ فلرٹ کرنے بہانہ ہے۔مجھے خوب معلوم ہے کہ آپ میری رفاقت کے خواہش مند ہیں ۔۔۔۔۔ بھلا ادھر ادھر ہانکنے کی کیا ضرورت ہے،ایک بالغ انسان کو ان معاملوں میں صاف ہونا چاہیے" ادھر ادھر صرف ستون ہی ستون تھے۔کھمبے مفقود تھے۔ورنہ میں محاورے کی پیروی کرتے ہوئے انھیں ضرور نوچ ڈالتا۔ڈاکٹر صاحبہ تشخیص سو فیصد درست تھی۔[۴۱]

اپنے ان نسوانی کرداروں کی چاشنی سے مستنصر حسین تارڑ اپنے سفرناموں میں رنگ اور خوشبو بھرتے ہیں۔جو ان کا خالص اسلوب ہے۔

حسِ مزاح:

مستنصر حسین تارڑ کی حسِ مزاح بہت اچھی ہے۔وہ اس کا استعمال اپنے سفرناموں میں جابجا کرتے ہیں۔وہ اصل واقعہ میں اپنی باتوں سے مزاح کا پہلو نکال لیتے ہیں اور تحریر میں اپنے شگفتہ جملوں سے اپنی تحریر کو شگفتہ کر دیتے ہیں۔ان کا یہ مخصوص انداز ان کے فن سفرنامہ نگاری کا جزوِ لاینفک ہے۔جو انھیں ایک عظیم سفرنامہ نگاری بنا دیتا ہے۔قرطبہ کی مسجد میں لبنانی لڑکی سے ڈانٹ کھانے کے بعد ان کا رویہ،سوچ اور اندازِ تحریر دیکھئے:

ادھر صرف ستون ہی ستون تھے۔کھمبے مفقود تھے۔ورنہ میں محاورے کی پیروی کرتے ہوئے انھیں ضرور نوچ ڈالتا۔ڈاکٹر صاحبہ کی تشخیص سو فیصد درست تھی۔ایک طویل اور ناگوار وقفہ جو

میں نے چھت کی منقش شہتیروں کو گھورنے میں گزارا۔ میں یوں پتھرایا ہوا کھڑا رہا کہ اس بے حسی کے دوران اگر کوئی سیاح مسجد کے ستونوں کو شمار کرنے کا تردد کرتا تو کل تعداد میں ایک کا اضافہ اسے یقیناً حیرت زدہ کر دیتا۔ ۴۲

درج بالا اقتباس سے ان کی حسِ مزاح کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

نکلے تری تلاش میں میں جب مستنصر بازنطائن یعنی قسطنطنیہ یعنی استنبول پہنچے ہیں تو انھیں ایک ترک نوجوان یوسل ہوسٹل میں ٹھہرنے کا مشورہ دیتا ہے۔ یہ ایک اچھا، آرام دہ اور صاف ستھرا ہوسٹل تھا۔ ہوسٹل کے دروازے کے ساتھ نوٹس بورڈ پر ''ضرورت ہے'' اور ''برائے فروخت'' کے عنوانات کے تحت کچھ اشتہارات درج تھے۔ ان اشتہارات کی تفصیل مستنصر حسین تارڑ اپنے الفاظ میں بیان کرتے ہیں تو ابن انشا کے مضمون ''اشتہارات'' کی ضرورت نہیں ہے کے۔ کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔ مستنصر حسین تارڑ کی حسِ مزاح اور اندازِ تحریر درجۂ کمال تک پہنچی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

''ضرورت ہے'' کے عنوان کے تحت اشتہار کی تفصیل یوں بیان کرتے ہیں۔

ایک نوجوان فرانسیسی سیاح کو سکم اور بھوٹان کے سفر کے لیے ایک لڑکی کی (پندرہ سے پینتیس سال) انگریزی جانتی ہو اور معاشرے کے گھسے پٹے اخلاقی اقدار کی پابند نہ ہو، کار کے پٹرول کی قیمت بانٹنا ہوگی۔ باقی سب کچھ مفت

''برائے فروخت''

''بدھ کا ایک نادر مجسمہ جو نیپال کے ایک راہب خانے سے چُرایا گیا ہے۔ استنبول سے نیو یارک تک کا ہوائی ٹکٹ، لمبے بالوں کی ایک وگ، ڈالر چھپانے والی ایک کمری پیٹی۔۔''

یا پھر

''خواتین کے استعمال شدہ زیر جامہ ملبوسات، اشتہار دہندہ افریقہ جارہی ہے۔'' وغیرہ ۴۳

دیوسائی:

مستنصر حسین تارڑ کا سفرنامہ دیوسائی دنیا کے بلند ترین میدان ''دیوسائی'' کے سفر کی داستان ہے۔ ''دیوسائی'' سطح سمندر سے تیرہ ہزار فٹ سے لے کر سولہ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ اس جگہ جانے کے لیے راستے سکردو کی طرف سے اوپر چڑھتے اور استور کی جانب سے اترتے ہیں۔ گلتری کی وادی کی جانب سے بھی جاتے ہیں۔ اس خوبصورت میدان کے چاروں طرف چوٹیاں ہیں جو اٹھارہ ہزار فٹ کی بلندی تک چل جاتی ہیں۔ بر جی لا درے میں گھرا ہوا یہ میدان چھتیس کلو میٹر طویل اور چوبیس کلو میٹر چوڑا ہے۔ اس میدان کے

نشیب وفراز ٹیلوں، گھاٹیوں، ندیوں اور گھاس کے میدانوں سے بھرے ہوئے ہیں ۔بلی زبان میں ''دیوسائی'' کو ''بھیرسا'' کہتے ہیں ۔اس کا مطلب ہے'' پھولوں سے بھرا ہوا مقام''اس جگہ بھورے ہمالیائی ریچھ رہتے ہیں۔سنہری مارموٹ رہتے ہیں۔تبتی نسل کے بھیڑیے بھی یہاں پائے جاتے ہیں۔تبتی سرخ لومڑیاں بھی یہیں دم کے بغیر خرگوش بھی یہاں کے باسی ہیں۔ برفانی چیتے، ٹراوٹ مچھلیاں، ہمالیہ کے آئی بیکس، اور سنہری عقاب یہ سب'' دیوسائی'' کے مکین ہیں۔مستنصر حسین تارڑ لکھتے ہیں کہ جب گرمی سے لاہور میں تارکول کی سڑکیں پگھلنے لگتی ہیں۔تو شمالی علاقے کے مے خانے میں برفیں تنور میں رکھے ہوئے مکھن کی طرح پگھلتی ہیں۔

لاہور کی شکر دوپہر میں ان کی ذہن کے کینوس پر جو چیزیں پینٹ ہوتی ہیں۔ان کا ذکر مستنصر حسین تارڑ دیوسائی کے آغاز میں کرتے ہیں۔وہ ان علاقوں کے ناموں سے اچھی طرح واقف ہیں۔ان کو جغرافیہ انھیں ازبر ہے۔

> ٹرینگوٹاور کے دامن کی گھاس، سونج کی آبشار اور تیلوں کی دھول۔۔۔وادئ روپل کے سورنگ ۔۔۔ مانگو کسار کے شکاری جھونپڑے ۔۔۔بیامنتھا کے چائے کے باغ اور ریچھ ۔۔جھیل کرومبر پگھل رہی ہوگی اور اس پر خوش گاؤ کے قافلے چلنے سے جھجکتے ہوں گے۔پامیر کی گھاس بلند ہوتی ہوگی۔لاہور کی شکر دوپہروں میں بس یہی ٹھنڈک کی تصویریں ذہن کے کینوس پر خود بخود پینٹ ہوتی جاتی تھیں۔ ۴۴

مستنصر حسین تارڑ کا اسلوب ان کے سفرناموں نکلے تری تلاش میں اور اندلس میں اجنبی کی طرح دیوسائی میں بھی بجا طور پر ہمارے سامنے آتا ہے۔ہم ان کے دوسرے سفرناموں میں سے ان کے اسلوب کے مختلف پہلو ڈھونڈتے ہوئے نکلتے ہیں۔تو دیوسائی میں بھی ان کے مخصوص اسلوب کے حسن میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔مستنصر حسین تارڑ کے سفرناموں میں ایسی چابکدستی ہے۔اس جگہ اور اس کی خوبصورتیوں کا ذکر ملتا ہے۔کہ پڑھنے والے گھر سے نکل پڑتے ہیں۔انھوں نے ایک لڑکی کا واقعہ بھی قلمبند کیا جو راولپنڈی سے سکردو روڈ پر تنہا سفر کر رہی تھی۔بس سروس کے مالکان اس اپنے گھر لے گئے۔اس کی ایک رات بیٹی کی طرح عزت کی۔اسے مشابرم، جھیل صد پارہ، کچورا اور وادی شگر کی سیر کروائی۔بعد میں پتہ چلا کہ وہ لڑکی مستنصر حسین تارڑ کے سفرنامے پڑھ کر شمالی علاقوں کی سیر کو تنہا نکلی ہوئی تھی۔اس کے گھر والوں سے رابطہ کیا گیا تو وہ پشاور سے آکر اسے لے گئے۔مستنصر حسین تارڑ کہتے ہیں کہ میرے لیے یہ واقعہ تفاخر نہیں بلکہ شرمندگی کا باعث ہے۔اس لڑکی اپنے والدین سے کہا تھا کہ مجھے وہاں لے چلیں جہاں کیے ٹو کہانی ہے۔نانگا پربت ہے، ورنہ میں گھر سے بھاگ جاؤں گی۔

ایسے دیوانے لوگوں کو مستنصر حسین تارڑ نصیحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> میری ایک مؤدبانہ گزارش ہے کہ۔۔۔میرے سفرناموں کو زیادہ سنجیدگی سے نہ لیا کریں۔۔۔ یہ ایک دیوانے کی بڑ ہوتے ہیں۔۔۔دیوانگی جو کچھ دیکھتی ہے۔اس کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔میں اپنے فن میں بستیاں آباد کرتا ہوں۔ان کو وجود نہیں ہوتا پھر بھی۔۔۔آباد کرتا ہوں۔میرے دل میں کوہ نوردی کا عشقِ خالص ہے،وہ ایسی آبشاریں تخلیق کرتا ہے جن کا وجود نہیں ہوتا۔وہ ایسی ندیوں کو رواں کرتا ہے جن کا نام نہیں ہوتا۔میرے سفرناموں کو زیادہ سنجیدگی سے نہ لیا کریں۔ ۴۵

دیوسائی مقام کے بارے وہ لکھتے ہیں کہ عجیب واہیات مقام تھا،بالکل سامنے سکردو کے اوپر صد پارہ جھیل سے پرے جہاں پہنچنا اتنا آسان ہے کہ لوگ اپنے بال بچے سمیٹے پکنک کی ٹوکریاں اُٹھائے اوپر جاتے ہیں اور سیر سپاٹا کر کے شام تک لوٹ آتے ہیں۔

منظر نگاری:

منظر نگاری مستنصر حسین تارڑ کا خاص اسلوب ہے۔اور اس میں انھیں ملکہ حاصل ہے۔ایسے انداز میں منظر بیان کرتے ہیں کہ پڑھنے والوں کی آنکھوں کے سامنے اس کی شبیہہ ابھر آتی ہے۔۔۔لکھتے ہیں:

> ایک بھورے رنگ کا شاندار پرندہ اپنے پر پھیلائے۔جیسے کلو پیٹرا ہاتھ پھیلائے اپنے لبادہ پھیلاتی ہے۔دیوسائی سے اترنے والے تیز دھار نالے کی گھاٹی میں۔۔۔ہم سے نیچے اتنی آہستہ روی سے اڑان میں تھا،جیسے وہ تقریباً سکوت میں ہو۔ایک تصویر ہو جو ٹھہر ٹھہر کر حرکت میں آتی ہو۔ ۴۶

اپنی اسی منظر نگاری کی بدولت تارڑ بھی ایک نامور،سفرنامہ نگار کے طور پر مقبول ہیں۔یہ ان کے اسلوب کا اہم ترین عنصر ہے۔

رومان پرور فضا:

مستنصر حسین تارڑ چونکہ ایک رومانوی آدمی تھے۔اس لیے ان کے سفرناموں ایک رومان پرور فضا سی چھائی رہتی ہے۔ان کے جملوں سے رومان جھلکتا ہے۔دیوسائی کے سفر میں درۂ برجی لا کے قریب جب سیاحوں کو بارش اور اولوں سے مڈبھیڑ ہوئی تو انھوں نے اس مشکل کیفیت کو کیسے رومانوی الفاظ میں بیان کیا کہ داد دیئے بغیر رہا نہیں جاسکتا۔

> ہم پر اولے اس طرح گرتے تھے جیسے کسی سوہنی لاہورن کے صحن میں کنکروں کے گرد لپٹے ہوئے عاشقوں کے رقعے گرتے ہیں۔ ۴۷

ان کی رومان پرور فضا اس حد تک ان کے سفرناموں میں چھائی رہتی ہے کہانھوں نے اپنے دیوسائی اور برجی لاء درہ کے خطرناک سفرکو بھی لطیف پیرائے میں بیان کیا ہے۔ان کے خیال میں ان کا یہ خطرناک سفر محض ایک پھول، ایک ریچھ اور ایک بادل کے ٹکڑے کے لیے تھا۔وہ پُر خطر گھاٹیوں ،خوفناک غاروں ، ویران دروں اور فلک بوس چوٹیوں کے سفرکو ایک شاعر کی طرح بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔اپنے رومانوی فلسفے کو ساتھ ساتھ یوں بیان کرتے ہوئے چلتے ہیں۔

> کوئی ایک ستارہ آسمان کے سوا آ کی نظروں کے نیچے ایک گہرائی میں کیسے وجود میں آسکتا ہے۔کہاں سے آسکتا ہے۔لیکن وہ وہاں تھا۔ایک تاریک اور گہری وسعت میں اکیلا ٹمٹماتا ہوا۔دیوسائی کے شہر بے چراغ میں ٹمٹماتا ہوا۔وہ میری نظروں کی سطح سے کہیں نیچے دمکتا تھا۔ ۴۸

اس خطرناک اور دنیا کے بلند ترین میدان ''دیوسائی'' تک نیچے پہنچنے کی وجہ وہ شروع میں بھی یہی لکھتے ہیں۔اورآخر میں بھی یہی بیان کرتے ہیں کہ صرف ایک پھول،ایک ریچھ اور ایک بادل دیکھنے کے لیے وہ وہاں پہنچے۔اپنی اس وجہ کو بڑے شاعرانہ انداز میں لکھتے ہیں۔

> اس لیے کہ کہیں سے یہ صدا آئی تھی کہ۔۔۔
>
> میں دیوسائی کا ایک ریچھ ہوں
>
> میں دیوسائی کا ایک پھول ہوں
>
> میں دیوسائی کا ایک بادل ہوں
>
> اور میں خود۔۔۔دیوسائی ہوں۔دنیا کا بلند ترین اور وسیع ترین خواب ہوں۔
>
> کیا ایک ریچھ کے لیے۔۔۔ایک پھول کے لیے۔۔۔
>
> صرف ایک بادل کے لیے گھر سے نکل کر دربدر ہونا جائز ہے؟
>
> ہاں۔۔۔میں گواہی دیتا ہوں کہ۔۔۔جائز ہے۔۔۔
>
> نہ صرف جائز ہے بلکہ فرض ہے ۴۹

اندلس میں اجنبی کے دیباچہ میں کرنل محمد خاں نے مستنصر حسین تارڑ کے اسلوب کے بارے میں ایسی سکہ بند باتیں کہیں ہیں جو سوفیصد ان پر صادق آتی ہیں۔وہ فرماتے ہیں:

> مستنصر ان سیاحوں میں سے نہیں جو جمبو جیٹ میں بیٹھ کر مہینوں کی مسافت گھنٹوں میں طے کرتے ہیں یا ایک ''اے کلاس ہوٹل'' سے دوسرے ''اے کلاس ہوٹل'' میں شب بسری کو

سیاحت کا نام دیتے ہیں ۔مستنصر دھرتی کے ساتھ چلتا ہے۔لغوی معنوں میں بھی اور استعارۃً بھی۔وہ آپ کو قریہ قریہ،نگری نگری،کوچہ کوچہ پیدل چلتا یا مقامی بس یا ریل میں سفر کرتا دکھائی دیتا ہے۔اس کے مشاہدے میں آنے والے انسان ہیں ۔دھرتی پر چلنے والے عام انسان ۔ان میں بوڑھے بھی ہیں اور جوان بھی حسین بھی اور کریہہ بھی۔وہ ان میں سے کسی سے نفرت نہیں کرتا۔کسی کو اپنے طنز یا تضحیک کا نشانہ نہیں بناتا۔اس کا ظرف اتنا وسیع ہے کہ اسے دھرتی کے تمام باشندے ایک ہی برادری بکھرے ہوئے فرد لگتے ہیں۔ ۵۰

عوامی ماحول:

مستنصر حسین تارڑ کسی نہ کسی مقامی بس،مقامی ٹرین یا پیدل سفر کا تذکرہ ضرور کرتے ہیں۔ان کے اس تذکرے میں قارئین کو اس علاقے کا عوامی ماحول نظر آتا ہے۔وہاں کے لوگ کیسے ہیں۔ان کا تاریخی پس منظر، ان کا جدید انداز اور ان لوگوں کے عوامی رویے۔یہ سب مستنصر حسین تارڑ کا خاص موضوع ہے۔

اندلس میں اجنبی میں فلیمنگو کے مقام پر جب وہ ایک بس میں سوار ہو کر شہر سے نکلتے ہیں تو وہاں کا عوامی ماحول کیسے ہمارے سامنے آتا ہے۔اس کی مثال اس سفر نامہ کے صفحہ نمبر 285 پر ملتی ہے۔لکھتے ہیں:

> ساندیا'' ،''ساندیا'' بس میں سوار بچوں اور چند مسافروں نے تالیاں پیٹتے ہوئے شور مچا دیا۔ تربوزوں سے بھرا ہوا ٹرک ایک مرتبہ پھر بھونپو بجاتا بس کو کندھے مارتا ہوا آگے نکل گیا۔اشبیلیہ سے نکلتے ہی یہ تماشا شروع ہو گیا تھا۔تربوزوں والے ٹرک کے ڈرائیور نے تو غالباً پوتر مریم کی قسم کھا رکھی تھی کہ وہ اپنے کھٹارے کو ہر قیمت پر غرناطہ جانے والی بس کے آگے آگے چلائے گا۔ ۵۱

یہ سارا عوامی قسم کا ماحول پڑھتے ہوئے ہمیں اس بات کا احساس نہیں رہتا کہ قرطبہ اور غرناطہ جیسے ملکوں کی بات کر رہے ہیں۔ بلکہ یوں لگتا ہے جیسے لاہور کے کسی مضافاتی علاقے کی فضا بیان کی جا رہی ہے۔

جغرافیہ کا شعور:

مستنصر حسین تارڑ اسلوب کا ایک اہم پہلو ان کا جغرافیہ کا شعور ہے۔وہ خود بھی جغرافیہ کا اچھا شعور رکھتے ہیں۔اور اپنے قارئین کو بھی جغرافیہ سے روشناس کرواتے چلے جاتے ہیں ۔انھیں سفر سے پہلے نقشے لے کر چلنے کی عادت ہے۔نقشے پر وہ سرخ سرخ لکیریں کھینچ کر اپنے سفر کا آغاز ، درمیان اور اختتام کا تعین کرتے ہیں ۔ان کے اکثر سفر ناموں میں نقشے پر نشانات لگا کر اپنی منزل کا تعین کرنے کا ذکر ملتا ہے۔ان کے جغرافیہ سے بھر پور واقفیت ہے۔اور وہ اس واقفیت میں ہر لحظہ اضافہ کرتے رہنے کے عادی بھی ہیں ۔نکلے تری تلاش

میں کے سفروں کے دوران میں جس وقت وہ فرانس کے علاقوں سے واپسی کا سفر اختیار کرتے ہیں تو کیسے چند جملوں میں اپنا جغرافیہ کلیئر کرتے ہیں۔

> صبح سویرے ہسپانیہ کا پہلا شہر سان سباستیان آیا۔میڈرڈ کے بغیر سفر اندلس شروع ہوا۔قرطبہ، اشبیلیہ اور غرناطہ۔۔میرے نقشے پر کھینچی ہوئی سرخ لکیروں کا اختتام ہوا اور وطن واپسی کا آغاز۔ایک مرتبہ پھر فرانس اور سوئزرلینڈ سے گزرا ہوا اور پھر میں آسٹریلیا سے اورینٹ ایکسپریس پر سوار ہوکر میں استنبول پہنچ گیا۔استنبول اور وطن کی راہ میں ارضِ روم پڑتا تھا۔۵۲

درج بالا بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ ان کا جغرافیہ کس قدر پختہ ہے۔واپسی کے سفر پر ان کے جامع تحریری اقتباس ان کے جغرافیائی شعور کے زندہ ثبوت ہیں۔لکھتے ہیں:

> ارضِ روم سے بس چلی۔نوح کا پہاڑ آرارت دھند میں ڈوبا ہوا تھا۔وہ رات تبریز میں گزری۔ دوسری شب ہم تہران میں تھے۔تیسرے روز مشہد میں ایک مرتبہ پھر امام کے روضے کے سنہری گنبد نظر آئے۔چوتھی صبح ہرات کے باہر بیقارہ مدرسہ کے سربریدہ میناروں نے ہمارا استقبال کیا۔ہندوکش کا عظیم سلسلہ کوہ سامنے آیا تو ہمیں ارضِ روم سے روانہ ہوئے پورے پانچ دن ہو چکے تھے۔اور ہماری بس کابل کے بسوں کے اڈے میں داخل ہو رہی تھی۔ ۵۳

حاصل کلام:

درج بالا حوالوں سے اس بات کا بخوبی ادراک ہوجاتا ہے کہ مستنصر حسین تارڑ ایک ہمہ جہت فنکار ہیں۔اعلیٰ پائے کے مصنف ہیں اور اپنے اسلوب کے مبدی اور منتہی ہیں۔ان کی تحریروں کا ہر روپ دلکش ہے۔ لیکن سفرنامہ نگاری میں جو اسلوب، اسٹائل اور اپروچ ان کے حصے میں آیا ہے۔ بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔وہ اپنی طرز کے پہلے اور آخری سفرنامہ نگار ہیں۔وہ ''رسے تڑا'' کر وطن سے بھاگتے ہیں۔لیکن ان کے دل کے تار وطنِ عزیز سے جڑے ہوتے ہیں۔ظاہر کی آنکھ غرناطہ پر ہوتی ہے۔تو باطن کی آنکھ لاہور پر ہوتی ہے۔وہ ایک دلربا سی، نیم اداسی والی فضا میں سفر کرتے رہتے ہیں۔اس فضا میں دھند ہے۔رومانیت کی بھینی بھینی خوشبو ہے۔ریشمی سی اداسی ہے۔سفر برائے سفر ہے۔ دنیا کو فتح کرنے کی کوئی سوچ نہیں ہے۔ بلکہ صرف لوگوں میں محبتیں تقسیم کرنے کی ایک روداد ہے۔ وہ پرانے سفرناموں کی طرح جغرافیائی تاریخی کھنڈر نہیں دکھاتے بلکہ تہذیب میں لپٹی ہوئی جیتی جاگتی، زندہ سلامت تصویر کشی کرتے ہیں۔

ان کے سفرنامے نوجوان لڑکوں، لڑکیوں کو گھروں سے بھاگ کر سیاحت کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ لیکن ساتھ بات کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ ان کے شمالی علاقوں کے سفرنامے اس قدر زندہ، خوبصورت اور پُر اثر

ہیں کہ ان سفرناموں کی وجہ سے مقامی سیاحت کو بہت فروغ ملا۔ نہ صرف پاکستان سے بلکہ بیرون ممالک کے سیاح بھی جوق در جوق پاکستانی علاقوں کی سیاحت کے لیے نکل پڑے۔ وہ ایک کامیاب سفرنامہ نگار ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ ممتاز مفتی، باندی، مشمولہ اوکھے لوگ، یونیورسل بکس لاہور، 1986، ص204

۲۔ مفتی محمد حسین، تذکرۂ مفتیاں، فیروزسنز لاہور، 1992، ص68

۳۔ ممتاز مفتی، الکھ نگری، ص۱۱۳

۴۔ ممتاز مفتی، گہما گہمی، ص۱۴۱

۵۔ سہیل بخاری، ڈاکٹر، علی پور کاایلی۔ اردو کے چند معروف ناقدین اور قارئین کی آراء، مکتبہ میری لائبریری لاہور، سن وصفحہ نمبر ندارد

۶۔ نجیبہ عارف، ڈاکٹر، ممتاز مفتی شخصیت اور فن، اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۰۷، ص ۱۰۷

۷۔ ابنِ انشا، ممتاز مفتی حج کو چلے، مشمولہ ممتاز مفتی، ص۱۲، ۷۱۴

۸۔ ممتاز مفتی، ہونی ان ہونی، مشمولہ ممتاز مفتی، ص۵۴ ۷

۹۔ احمد بشیر، عیسیٰ اور گدھا، ص۷۳۶

۱۰۔ ابنِ انشا، ممتاز مفتی حج کو چلے، مشمولہ ممتاز مفتی، ص۷۱۳

۱۱۔ مولانا کوثر نیازی، فلیپ لبیک

۱۲۔ مسعود قریشی، بیسویں صدی کا نمائندہ ادیب، مشمولہ مہااوکھا، ص۱۳

۱۳۔ اختر جمال، میں حاضر ہوں، مشمولہ ممتاز مفتی، ص۷۳۰

۱۴۔ ڈاکٹر ابدال بیلا، لو سٹوری، مشمولہ ممتاز مفتی، ص۷۳۰

۱۵۔ ممتاز شاہین مظہر، مفتیریا، مشمولہ ممتاز مفتی، ص۷۴۸

۱۶۔ باربرا میٹکاف، ممتاز مفتی ایک اسلامی طنز نگار، مترجمہ مسعود قریشی مشمولہ مہااوکھا، ص۴

۱۷۔ ممتاز مفتی، لبیک، رُمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز ۲۰۱۴، ص ۶۳

۱۸۔ ایضاً ص۷۲

۱۹۔ ذوالفقار احمد تابش، تعارف لبیک، ص ۱۵

۲۰۔ نذیر احمد، تعارف لبیک، ص ۱۵

۲۱۔ ممتاز مفتی، لبیک، رُمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز ۲۰۱۴، ص ۹

۲۲۔ ایضاً،ص۱۰

۲۳۔ ایضاً

۲۴۔ نجیبہ عارف،ڈاکٹر،ممتاز مفتی شخصیت اور فن،اکادمی ادبیات پاکستان،۲۰۰۷،ص۱۱۶

۲۵۔ ایضاً

۲۶۔ ممتاز مفتی،ہند یاترا،ص۱۷۰

۲۷۔ نجیبہ عارف،ڈاکٹر،ممتاز مفتی شخصیت اور فن،اکادمی ادبیات پاکستان،۲۰۰۷،ص۱۱۹

۲۸۔ ممتاز مفتی،ہند یاترا،ص۱۷۰

۲۹۔ ڈاکٹر رشید امجد،ممتاز مفتی کی ہند یاترا،مشمولہ ہند یاترا،ص۱۴،۱۷

۳۰۔ مستنصر حسین تارڑ،نکلے تری تلاش میں،سنگِ میل پبلیکیشنز،۱۹۷۱،ص۸

۳۱۔ ایضاً،ص۲۲

۳۲۔ ایضاً،ص۳۰

۳۳۔ کرنل محمد خاں،دیباچہ،اندلس میں اجنبی،سنگِ میل پبلیکیشنز،۱۹۷۲،ص۱۱

۳۴۔ مستنصر حسین تارڑ،نکلے تری تلاش میں،سنگِ میل پبلیکیشنز،۱۹۷۱،ص۹۶

۳۵۔ ایضاً،ص۹۷،۹۸

۳۶۔ مستنصر حسین تارڑ،اندلس میں اجنبی،سنگِ میل پبلیکیشنز،۱۹۷۲،ص۴۶،۴۷

۳۷۔ ایضاً،ص۶۲

۳۸۔ مُستنصر حسین تارڑ،اندلس میں اجنبی،سنگِ میل پبلیکیشنز،۱۹۷۲،ص۶۶

۳۹۔ مستنصر حسین تارڑ،نکلے تری تلاش میں،سنگِ میل پبلیکیشنز،۱۹۷۱،ص۱۳۸،۱۴۱

۴۰۔ ایضاً،ص۱۵۱

۴۱۔ مستنصر حسین تارڑ،اندلس میں اجنبی،سنگِ میل پبلیکیشنز،۱۹۷۲،ص۲۲۰

۴۲۔ ایضاً

۴۳۔ مستنصر حسین تارڑ،نکلے تری تلاش میں،سنگِ میل پبلیکیشنز،۱۹۷۱،ص۸۲

۴۴۔ مستنصر حسین تارڑ،دیو سائی،سنگِ میل پبلیکیشنز،۱۹۸۲،ص۱۴

۴۵۔ ایضاً،ص ۲۷

۴۶۔ ایضاً،ص ۶۵

۴۷۔ ایضاً،ص ۹۲

۴۸۔ ایضاً،ص ۳۲۴

۴۹۔ ایضاً،ص ۳۲۷

۵۰۔ محمد خاں،کرنل،دیباچہ اندلس میں اجنبی،سنگِ میل پبلیکیشنز،ص ۱۱

۵۱۔ مستنصر حسین تارڑ،اندلس میں اجنبی،سنگِ میل پبلیکیشنز،۱۹۷۲،ص ۲۷۵

۵۲۔ مستنصر حسین تارڑ،نکلے تری تلاش میں،سنگِ میل پبلیکیشنز،۱۹۷۱،ص ۳۶۵

۵۳۔ ایضاً،ص ۳۶۸

باب سوم

لبیک اور منہ ول کعبے شریف میں فکری و اسلوبیاتی اشتراکات

ابتدائیہ:

کسی اچھی یا بری چیز کی اچھائی یا برائی کو ماپنے کے لیے ہمارے پاس ایک مستند پیمانہ یہ ہوتا ہے کہ اس کا اس جیسی کسی دوسری چیز کے ساتھ موازنہ کرتے ہیں۔اگر کوئی انسان اچھا ہے تو ہمارا پیمانہ یہ ہوگا کہ یہ انسان فلاں انسان سے اچھا ہے۔کوئی ادب پارہ یا فن پارہ ہماری نظر سے گزرے تو ہم اس کا موازنہ کسی دوسرے ادیب کے فن پارے سے کرنے کی کوشش کریں گے۔یہ طریقہ ایک ایسا آئینہ ہے جس میں ہمیں اس فن پارے کے بہت سے محاسن اور خوبیاں نظر آئیں گے۔کوئی سے دو فن پاروں کے مابین موازنہ کرنے سے ،دونوں کی خوبیوں اور خامیوں کا اندازہ بطریقِ احسن ہو جاتا ہے۔لیکن موازنہ کرتے وقت ہمیں اس کے مختلف پہلوؤں کا خیال رکھنا چاہیے۔

مختلف پہلوؤں سے مراد یہ ہے کہ ہم ان فن پاروں کا تجزیہ اس کے اسلوب کے حوالے سے کررہے ہیں۔اس فن پارے میں موجود فکری نکات پر غور کررہے ہیں۔موضوعاتی اعتبار سے اس پر بات ہورہی یا پھر عصری نقطۂ نگاہ سے اس پر تحقیق کررہے ہیں۔

اسلوب کیا ہے:

اسلوب کیا ہے؟ اس کے بارے میں سمجھنے کے لیے ہمیں بہت عمیق مطالعہ اور تحقیق درکار ہے۔ اسلوب کی بہت سی تعریفات کی گئیں۔مختلف تحقیق نگاروں نے اس کے مختلف پہلوؤں پر اوراس کی ہیئت پر روشنی ڈالی۔اس کے مختلف پہلو بیان کیے۔اس سلسلے میں سید عابد علی عابد کی کتاب اسلوب ایک نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔اس میں انھوں نے پروفیسر مرے کی زوال پذیری پر بحث کرنے کے بعد کلمہ اسٹائل کے معنی بتاتے ہوئے اسلوب کی اچھی طرح وضاحت کی ہے۔لکھتے ہیں:

> اسلوب کی یہ تعریف کہ مصنف کی مکمل شخصیت کا دوسرا نام اسلوب ہے، بظاہر بہت معنی خیز معلوم ہوتی ہے اور فلا بیر اس کی تعریف بھی کرتا ہے، لیکن تجزیہ کرنے سے تسلی بخش معانی ہاتھ نہیں آتے۔ہیزی بیل سٹینڈ ہل کہتا ہے: ''اسلوب کے معنی یہ ہیں کہ فن کار کسی سلسلہ فکر کے اظہار کے وقت وہ تمام کوائف شامل کرے جو سلسلہ فکر کے کامل ابلاغ کے لیے ضروری ہیں۔ [۱]

ممتاز مفتی کا اسلوب:

ممتاز مفتی کے بارے میں ہم سابقہ باب ''ممتاز مفتی کا فن سفر نامہ نگاری'' میں تفصیل سے بحث ہو چکی ہے۔ممتاز مفتی بطور مصنف ہمیں ایک ایسے انداز میں ملتے ہیں۔جو ان کی ادبی زندگی کے تمام دور میں ان پر چھایا رہا۔ان کا اپنا ایک اسلوب ہے۔ان کی نثر بیانیہ انداز کی نثر ہے۔وہ پھیلاؤ کی طرف مائل رہتی ہے۔وہ رمز اور اشاروں کنائیوں میں بات کرنے کی بجائے ایک بات کو کئی کئی جملوں میں بیان کرتے ہیں۔ان کا پسندیدہ موضوع جنس ہے۔ان کی تحریروں کے معروف کردار عورتوں کے ہیں۔عورت ان کی تحریر کا مرکزی موضوع ہے۔ان کی تحریر میں مکالمہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔وہ مکالمہ سے کام لیتے ہوئے تحریر کو دلکش بناتے ہیں۔کہانی کی رفتار کو تیز کرتے ہیں۔اندازِ تحریر اس قدر دلکش ہوتا ہے کہ قاری پر طاری ہو جاتا ہے۔وہ اردو کے نامور ترین مصنفوں میں سے ایک ہیں۔تصوف ان کی تحریر کا ایک اہم موضوع ہے۔

ان کی تصانیف کا ایک اہم عنصر ان کا اسلوب ہے۔یہ اسلوب ان کے افسانوں ،سفر ناموں ،سوانح عمری اور شخصی خاکوں میں نمایاں ترین نظر آتا ہے۔یہی اسلوب ان کی خاص پہچان بنا۔وہ بات کو نئے پیرائے سے ،انوکھے زاویے سے اور منفرد انداز سے کرنے کے عادی ہیں۔

مستنصر حسین تارڑ کا اسلوب:

ٹی وی ڈراموں سے لے کر سفر نامہ نگاری تک مستنصر حسین تارڑ نے بطور مُصنف ایک نمایاں پہچان بنائی۔چار سوسے زائد ٹی وی ڈرامے ،اخبار جہاں میں مسلسل کالم اور مقالہ نویسی ان کی شخصیت کے پہلو ہیں۔بطور مصنف وہ ایک ایسا خوبصورت اندازِ تحریر رکھتے ہیں کہ قاری کو انگلی پکڑ کر اپنے ساتھ چل پڑتے ہیں۔ممتاز روسی مستشرق پروفیسر گالینا ڈشنکو کے بقول ہم روس کے رہنے والے پاکستان کو فیض احمد فیض کی شاعری اور مستنصر حسین تارڑ کی نثر کے حوالے سے جانتے ہیں۔

ان کے سفر نامے ایسا پُرکشش ہوتے ہیں کہ نوجوان اپنے گھروں سے نکل کر ان جگہوں کی سیر کے لیے بے تاب ہو جاتے ہیں۔جن کا ذکر مستنصر صاحب اپنے سفر ناموں میں کرتے ہیں۔ان کے ڈراموں اور ناولوں میں نسوانی کرداروں کی بھرمار ہے۔ان کی جانب ان کی قلبی وابستگی کے قصے بھی کم دلچسپی کا باعث نہیں ہوتے۔ان کے ناول راکھ کو سال کا بہترین ناول قرار دیا گیا۔بھارت میں ہونے والے ایک سروے کے مطابق گزشتہ صدی میں تخلیق کیے جانے والے دس بڑے ناولوں میں ایک مستنصر صاحب کا ناول بہاؤ ہے۔ان کا ناول پیار کا پہلا شہر گزشتہ تیس سال سے ''بیسٹ سیلر'' ہے۔اور اب تک اس کے پچاس سے زیادہ ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔

پنجابی زبان میں لکھا گیا ان کا ناول پکھیرو بھارت کی گورونانک یونیورسٹی کی نصاب میں شامل

ہے۔

فکری رویہ:

فکری رویہ سے مراد کسی فن پارے میں موجود اس سوچ کا ذکر ہے۔ جو اس فن پارے کی تخلیق کی وجہ بنا۔ وہ کونسا محرک تھا جس نے اس ادیب کو وہ فن پارہ تخلیق کرنے پر مجبور کیا۔ وہ فن پارہ نظم کی صورت میں ہو یا نثر کی صورت میں، سفرنامہ ہو یا مصوری، ناول ہو یا افسانہ ہو لیکن اس کے پس منظر میں جو بنیادی سوچ کار فرما ہوگی۔ وہی اس فن پارے کا فکری رویہ یا فکری اسلوب طے کرے گی۔

موضوعاتی رویہ:

کسی تخلیق کے فکری رویہ کے بعد اس کا موضوعاتی رویہ بھی اہم ہے۔ بنیادی فکر سے پھوٹنے والی اس روشنی سے جو منظر وجود میں آئیں گے وہ موضوعاتی رویہ کہلاتے ہیں۔ لکھنے والے نے اپنے بنیادی فکر کو لوگوں تک پہنچانے کے لیے کس موضوع کا انتخاب کیا۔ اپنی سوچ کو کس سانچے میں ڈھالا ہے۔ کونسے حالات و واقعات کا انتخاب کیا ہے۔ یہ سب موضوعاتی رویہ کہلائے گا۔

لبیک کا فکری رویہ:

ممتاز مفتی نے اپنے سفرنامۂ حج لبیک میں ایک مخصوص فکری و موضوعاتی رویہ رکھا ہے۔ یہ رویہ پورے سفرنامہ میں ان کی تحریر میں چلتا ہیں۔ یہ مخصوص رویہ ان کی اس سوچ کا غماز ہے۔ کہ انھوں نے حج مبارک کا سارا سفر ایک عام مسلمان کی حیثیت سے کیا۔ انھوں نے مذہب کی پاسداری اور اپنی پارسائی کے بلند بانگ دعوے نہیں کیے بلکہ انھوں نے دلوں کے چور پکڑے ہیں۔ مذہبی مقامات پر ایک کمزور ایمان والے مسلمان کے دلی جذبات کیا ہوتے ہیں۔ وہ کیا سوچتا ہے۔ کسی مقام کے متعلق اپنی کیا رائے قائم کرتا ہے۔ یہ سب کچھ انھوں نے لگے لپٹے انداز میں نہیں بلکہ سچے اور کھرے انداز میں بیان کیا ہے۔

انھوں نے دقیانوسی انداز میں نہیں بلکہ غیر معمولی طریقے سے اپنی ماہیت قلب کی بات کی ہے۔ ان کا فکری رویہ اس سفرنامے کی تحریر میں ایک متشکک مسلمان کا ہے۔ جو ایک نجومی کی بات پر یقین کر لیتا ہے اور اکثر مقامات پر ڈانواں ڈول ہو جاتا ہے۔ زائرین جب جہاز میں بیٹھ کر پرواز کرتے ہیں تو اسے یوں لگتا ہے جیسے جہاز اغوا ہو گیا ہو۔ وہ ایک غیر مذہبی فرد ہونے کے باوجود ایسی ایسی کیفیات سے گزرتے ہیں جیسے انھیں خدا کا دیدار حاصل ہو رہا ہو۔ انسانی نفس کی کارفرمائیاں بیان کی ہیں جو انسان کو اپنے مکروفریب میں جکڑ لیتا ہے۔ اس مکروفریب سے نکلنے کے طریقۂ کار کے بارے میں بھی ممتاز مفتی نے اس سفرنامے میں سیر حاصل بحث کی ہے۔

لبیک کا موضوعاتی رویہ:

لبیک کا فکری رویہ بھی ممتاز مفتی کے ایک خاص اسلوب میں ہے۔اور اس کا موضوعاتی رویہ بھی ایک مخصوص پیرائے میں ہے۔جس کی مثال بہت کم سفرناموں میں ملتی ہے۔وہ حج کے سفر کے دوران میں پیش آنے والے چھوٹے چھوٹے واقعات کو اپنا موضوع بناتے ہیں۔وہ خانہ کعبہ کو موضوع بناتے ہیں تو اسے کالے پتھروں سے بنا ہوا ایک بے ڈھب کالا کوٹھا کہتے ہیں۔اذان ہو رہی ہو تو خود کو سکھوں کی طرح اذان سننے سے روکتے ہیں۔اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے ہیں۔سجدے کی بات ہو تو اس چیز سے انھیں پریشانی ہوتی ہے کہ تنگ جگہ کی وجہ سے پچھلے نمازی کا سر ان کے پیروں میں گھسیڑ رہا ہے۔

طواف کا موضوع بیان کریں تو اسے دھکم پیل کا نام دیتے ہیں۔خداتعالیٰ کا ذکر ہو تو انھیں گڈریا کہہ دیتے ہیں۔قدرت اللہ شہاب جب انھیں فجر کے لیے جگاتے ہیں تو انھیں غصہ آجاتا ہے۔غرض یہ کہ اس طرح کے موضوعات کا انتخاب کرنا اور وہ بھی ایک سفرنامے میں، ممتاز مفتی کا ہی حوصلہ ہے۔لبیک کے موضوعاتی رویے پر، بہت سے لوگوں نے تعریفوں کے پُل باندھے جبکہ بہت سے لوگوں نے ممتاز مفتی کے اس رویے کو غیر مذہبی قرار دیا ہے۔ممتاز مفتی کو مردود، روس کا ایجنٹ اور بہت کچھ کہا ہے۔ [۲]

منہ ول کعبے شریف کا فکری رویہ:

مستنصر حسین تارڑ۔منہ ول کعبے شریف میں ایک مخصوص فکری رویہ برقرار رکھا ہے۔وہ ایک عام مسلمان کی طرح ہیں۔جو نہ تو اتنا مذہبی ہے، اسے حج کے ارکان اور مقدس مقامات کا کوئی علم ہے۔وہ سب لوگوں کے ساتھ ایک میکانکی انداز میں مختلف مقامات پر چلا جاتا ہے۔پہلی بار خانہ کعبہ کا مینار دیکھتے ہیں تو ان کو اس میں کشش نظر نہیں آتی۔وہ اسے مسجدِ قرطبہ کے مینار جیسا خوبصورت نہیں لگتا۔

حرمِ پاک میں داخل ہونے پر وہ وضو کرنے کو اتنا ضروری خیال نہیں سمجھتے۔اسے تردد سمجھتے ہیں۔مکہ مکرمہ کا نام پڑھ کر مکہ پہنچنے کا انتظار تو کرتے ہیں لیکن دل سے ہوک نہیں اٹھتی۔خانہ کعبہ پر پہلی نظر پڑتے ہی ان کے ذہن میں یہ خیال آتا ہے کہ یہ عمارت مکمل طور پر مکعب نہیں ہے۔اس پر ایک نظر ڈال کر وہ غافل ہو جاتے ہیں۔خانہ کعبہ کے اندر داخل ہوتے ہیں تو ایک عجیب کیفیت ان پر طاری ہو جاتی ہے۔اس طرح کے دیوانگی اور فرزانگی کے ملے جلے جذبات منہ ول کعبے شریف کا فکری رویہ ہیں۔اس سفرنامے کو مستنصر حسین تارڑ نے ایسے پیرائے تحریر کیا ہے کہ ایک عام مسلمان ہر اُس مقام سے آشنائی حاصل کر لیتا ہے۔جہاں حج میں جانا ہوتا ہے۔اور دلی جذبات میں بھی مستنصر صاحب بے باکانہ انداز رکھتے ہیں۔اس سفرنامے کا فکری رویہ ایک عام مسلمان کا ہے۔

منہ ول کعبے شریف کا موضوعاتی رویہ:

حج کے اس سفرنامے میں مستنصر حسین تارڑ نے ایک مخصوص موضوعاتی اسلوب کو برقرار رکھا ہے۔وہ جس موضوع پر بھی بات کرتے ہیں۔اس کے متعلق سیر حاصل بحث کرتے ہیں۔حج سے پہلے جدہ پہنچتے ہیں تو جدہ شہر کے متعلق بڑی تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔جدہ سے مکہ تک کے سفر کو، مکہ مکرمہ شہر کو جہاز کی کھڑکی میں سے دیکھنے کو، مکہ مکرمہ کے روڈ پر آنکھیں باہر کے منظر پر گاڑنے کا کمال چابکدستی سے بیان کرتے ہیں۔خانہ کعبہ تک پہنچنے سے پہلے ذہن میں گزرنے والے خیالات تک کو لکھتے ہیں۔بلھے شاہ کے خیالات بیان کرتے ہیں۔حجرِ اسود کے بوسہ کو رب تعالیٰ سے ہاتھ ملانے کے سترادف کہتے ہیں۔طواف کے دوران میں خود ایک گمشدہ بھیڑ کے برابر سمجھتے ہیں۔دیوار خانہ کعبہ کو چومتے ہیں تو یہ تصور ان کے ذہن میں ابھرتا ہے۔مجھ سے پہلے ہزاروں گیلے آہیں بھرتے ہونٹ یہاں رکھے جاچکے ہیں۔تو میں اسے چومنے کے اراوے میں بالکل نہیں تھا۔

اس طرح اس بات پر کہ خانہ کعبہ کی پہلی جھلک دیکھ کر وہ اشک بار نہیں ہوئے۔افسوس کا اظہار کرتے ہیں ۔غرض یہ کہ منہ ول کعبے شریف کا موضوعاتی رویہ شروع سے لے کر آخر تک مستنصر حسین تارڑ کے مخصوص رنگ میں ڈوبا ہوا رہتا ہے۔وہ اپنے سفر کے احوال بتاتے یا سناتے نہیں بلکہ دکھاتے ہیں۔

ممتاز مفتی اور مستنصر حسین تارڑ کے فکری اشتراکات:

ممتاز مفتی اور حسین تارڑ اپنے اپنے مقام پر اعلیٰ ترین فنکار ہیں۔ان دونوں مصنفین کے پائے کے لکھاری بہت کم کم پائے جاتے ہیں۔ان دونوں حضرات کی تحاریر میں بہت سے اشتراکات پائے جاتے ہیں۔ ممتاز مفتی کی طبیعت میں عورت کی طرف کشش بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔اور ان کے ناولوں میں نسوانی کردار جابجا ملتے ہیں۔ان نسوانی کرداروں میں کہیں تو عورت گھریلو مسائل کا شکار نظر آتی ہے اور کہیں اپنے پیار کی جانب جھکاؤ اس کی زندگی پر حاوی نظر آتا ہے۔اسی طرح مستنصر حسین تارڑ کے ناولوں میں بھی عورت اپنے گوناگوں مسائل میں الجھی ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے محبوب کی دسترس میں رہتی ہے۔اسے اپنے محبوب کی خوشی کا خیال اپنی خوشی سے زیادہ رہتا ہے۔

ممتاز مفتی کی تحریر اقتصادیات ، انسانی تہذیب، انسانی شخصیات کے تضادات اور تصوف میں گندھی ہوئی ہوتی ہے۔وہ انسان اور خدا کے تعلق کو بڑے اعلیٰ انداز میں بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔مستنصر حسین تارڑ کی تحریر میں بھی انسانی رویے، انسانی سوچ کے مختلف زاویے اور تصوف کا بیان ملتا ہے۔وہ بھی انسان کو خدا سے ایک قلبی تعلق قائم رکھنے کا درس دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔وہ نہ صرف خود اس ابدی تعلق پر کاربند رہتے ہیں بلکہ اپنے قاری کو بھی اسی کیفیت میں لے جانا چاہتے ہیں۔ان دونوں مصنفین میں بہت سے فنی محاسن مشترک ہیں۔

لبیک اور منہ ول کعبے شریف کا فکری ماخذ:

لبیک اور منہ ول کعبے شریف کا فکری ماخذ ایک ہے۔ وہ فکری ماخذ یہ ہے کہ ان دونوں حضرات نے اپنی طویل ادبی زندگی گزارنے کے بعد تقریباً ہر موضوع پر لکھ چکنے کے بعد جب حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی تو اس مقدس موضوع پر قلم اٹھایا۔ حج بیت اللہ سے متعلق ان دونوں ادیبوں کی ذاتی سوچ کیا تھی۔ حج پر جانے کے اسباب پیدا ہونے کے بیان سے لے کر ان مقامات کے متعلق ان دونوں ادیبوں کے ذہن میں اٹھنے والے سوالات یہ سب ان سفرناموں کا فکری ماخذ ہیں۔ ان دونوں سفرناموں کے اشتراکات پر بات کرتے ہوئے سب سے پہلا اشتراک جو ان دونوں کتابوں میں ہمیں نظر آتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ یہ سب دونوں سفرنامے حج کے ہیں۔ دونوں تحریروں کے مصنف کہنہ مشق مصنفین ہیں۔ خاص بات یہ کہ دونوں مصنفین کٹر مذہبی بھی نہیں ہیں۔ وہ عام مسلمان ہیں۔ جو مذہب سے نہ تو اتنی دلچسپی رکھتے ہیں۔ اور نہ اتنی معلومات، وہ بے دلی سے یہ سفرنامہ شروع کرتے ہیں۔ اور جیسے دوسرے مسلمانوں کے دل میں عقیدت کا زور ہوتا ہے۔ ویسا ان حضرات کے دلوں میں نہیں ہے۔ یہ ہر بات کو منطقی انداز میں سوچتے ہیں۔ اندھے عقیدت مند نہیں ہیں۔ خود بھی متشکک ہیں۔ اور دوسروں کو بھی ایسی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔

لبیک اور منہ ول کعبے شریف کا موضوعاتی اشتراک:

فکری اشتراکات کے ساتھ ساتھ مذکورہ دونوں کتب کا موضوعاتی رویہ بھی ایک جیسا ہے۔ دونوں سفرنامے حج کے ہیں۔ لبیک کو رُمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز نے اکتوبر 2014 میں شائع کیا۔ جب کہ منہ ول کعبے شریف کو سنگِ میل پبلی کیشنز نے 2017 میں شائع کیا۔ دونوں کتب خوبصورت کتابی شکل میں شائع شدہ ہیں۔ دونوں کے سرورق پر خانہ کعبہ کی تصاویر موجود ہیں۔ ممتاز مفتی کتاب لبیک کے سرورق پر خانہ کعبہ کی کیمرے سے کھینچی ہوئی تصویر موجود ہے۔ اور مستنصر حسین تارڑ کی کتاب منہ ول کعبے شریف کے سرورق پر مصور کے ہاتھ سے بنی ہوئی خانہ کعبہ کی تصویر موجود ہے۔

ان دونوں کتب کا سب سے بڑا موضوعاتی اشتراک تو یہ ہے کہ یہ حج کے سفرنامے ہیں لیکن دونوں مصنفین نے ذیلی موضوعات کے ضمن میں آنے والے جن موضوعات پر بات کی ہے وہ بھی کافی حد تک ملتے جلتے ہیں۔ حج پر جانے کے اسباب پیدا ہونے میں، حج پر ان کے ساتھ دو دو افراد کے موجود ہونے میں، مقدس مقامات پر حاضری کے وقت ان ادیبوں کے دلوں پر گزرنے والی کیفیات کے بیان میں، مقاماتِ حج کو دیکھ کر ان کی تاریخی اہمیت اجاگر ہونے میں، پرانے اور نئے زمانے کے رجحانات پر بات کرنے میں ان دونوں ادیبوں میں کافی اشتراکات نظر آتے ہیں۔

مذکورہ دونوں کتب کے فکری و موضوعاتی اشتراکات پر سیر حاصل بحث کرنے کے لیے ہمیں ایک جامع

مضمون درکار ہے۔اس مضمون میں ان کتب کے اشتراکات کوفرداً فرداً واضح کرنا ہوگا۔یہ وضاحت ان کے عمومی خیالات سے شروع ہوکر حج کے سفر سے واپسی تک کے تمام مدراج پر مشتمل ہوگی۔اس ضمن میں سب سے پہلے اس بات پر بحث ضروری ہے کہ ان دونوں ادیبوں کے عمومی اور مذہب کے بارے میں خصوصی نظریات کیا تھے۔کیسے وہ اس سفر کے لیے تیار ہوئے اور کیسے ان کے رفقاء کار نے ان پر اس سفر کے بارے میں اپنی آراء کا اظہار کیا۔کیسے وہ گھروں سے نکلے ،ذریعۂ سفر کونسا اختیار کیا۔کون ان کے ساتھ تھا۔کہاں پہنچے تو کیا ہوا۔مقامات مقدسہ پر کس کی قلبی کیفیت کیا تھی۔دیگر مقامات جو مذہبی نہ تھے لیکن حج کے سفر میں ان حضرات کا وہاں سے گزرنے کا اتفاق بھی ہوا،وہاں کے جغرافیائی حالات کو ان ادیبوں نے کیسے قاری تک پہنچایا۔اور ان کی قلبی کیفیات مختلف لوگوں سے ملتے وقت کیا تھیں۔ان سب چیزوں کا بغور جائزہ لینا اشد ضروری ہے۔اس سلسلے میں سب سے پہلے ہم جائزہ لیں گے ان دونوں ادیبوں کے مذہبی میلانات کا، وہ کیسے تھے۔ان کا رہن سہن کیسا تھا۔وہ ادیب بھی تھے۔وہ کیسے ادیب تھے۔وہ بطور مسلمان کیسے تھے،بطور انسان کیسے تھے،اور بطور ادیب کیسے تھے۔پہلے بات کرتے ہیں ممتاز مفتی کی۔

ممتاز مفتی ذہنی میلانات:

ممتاز مفتی ایک جنسی اور ایک نفسیاتی لکھاری کے طور پر جانے جاتے تھے۔لیکن جب انھوں نے حج کا سفرنامہ تحریر کرنا شروع کیا تو ان کے ذہنی میلانات ایک نئی جہت میں گامزن ہوگئے۔انھوں نے حج کے سفر کے دوران میں پیش آنے والے حالات و واقعات کو ایک نئے زاویہ سے دیکھا۔اور بیان کیا۔ڈاکٹر نجیبہ عارف لکھتی ہیں:

> علم ،ادب اور مذہب سے تعلق رکھنے والے ایک حلقے نے انھیں گردن زدنی اور مردود قرار دیا۔ان پر جو الزامات لگائے گئے ان کی نوعیت بھی خاصی دلچسپ تھی۔مثلاً ایک گروہ کا کہنا تھا کہ اس شخص نے اسلام اور شعائر اسلام کی توہین کی ہے۔اور خانہ خدا کی بے ادبی اور مسلمانوں کے مذہبی اعتقاد کی تضحیک کا مجرم ہے۔یہاں تک کہ ان پر کفر کے فتوے بھی صادر کر دیئے گئے۔ [۳]

جہاں یہ رائے ان کے بارے میں گردش کررہی تھی وہیں ان کے بارے میں کچھ لوگوں نے بڑی عقیدت کا اظہار بھی کیا اور انھیں ایک باشرع انسان سمجھا۔تصوف کا ایک بڑا نام قرار دیا۔بقول باربرا میٹکاف:

> ایسا سفرنامہ لکھنا جس کا مقصد احتساب کے بغیر اپنے متضاد تجربات و احساسات پیش کرنا ہو،مغرب زرد عالمی تجربے میں شامل ہونے کے مترادف ہے۔جو جدید ادب کی ایک صنف ہے۔اس کے ساتھ ہی مکہ معظمہ جانا مسلمان ہونے کا برملا اعلان بھی ہے۔ [۴]

مستنصر حسین تارڑ۔ ذہنی میلانات:

مستنصر حسین تارڑ، ایک خالص سفر نامہ نگار ہیں۔ان کو ناول، ڈرامہ اور کالم میں بھی وہی شہرت حاصل ہے۔لیکن ان کا پسندیدہ موضوع سفر نامہ نگاری ہے۔ان کی شخصیت کا ایک معتبر ترین حوالہ سفر نامہ نگاری ہی ہے۔کالم نگار فاروق اقدس لکھتے ہیں:

> انھوں نے اس دور کے نوجوانوں کو گھر سے بھاگ کر ان مقامات واقعات اور کرداروں کو دیکھنے کی ترغیب دی۔ان کا احسان یہ بھی ہے کہ انھوں نے اپنے سفرناموں میں وطنِ عزیز کے حسین مقامات کو ایسے پُرکشش انداز میں دریافت کیا کہ جو مقامی سیاحت کے فروغ کا باعث بنا۔ ۵

مستنصر حسین تارڑ کا ذہنی میلان ہی کوہ پیمائی اور پہاڑی علاقوں کی سیر کی طرف نہیں تھا بلکہ وہ خود عملی طور پر بھی، چہرے مہرے سے اور حرکات وسکنات سے ایک کوہ پیما ہیں۔ان میں پہاڑوں پر چڑھ جانے کا عزم ہے۔دلوں میں اتر جانے کا ہنر ہے۔اور آخری سانس تک لکھنے کی خواہش ہے۔

ان کے مذہبی میلان کی حقیقت اس بات سے مترشح ہے۔ان کے سسرال ممتاز صوفی بزرگ احمد علی لاہوری کے پیروکار تھے۔لکھتے ہیں۔

> نہ صرف چوہدری صاحب (مستنصر حسین تارڑ کے سسر) بلکہ ان کے اہلِ خانہ بھی مولونا احمد علی لاہوری کے پیروکار تھے۔بلکہ وہ مولانا کے خلیفہ اول تھے۔ ۶

آغاز سفر:

آغاز سفر کے متعلق پڑھا جائے تو دونوں مصنفین نے اپنے مخصوص انداز میں اس پر بات کی ہے۔ممتاز مفتی کا کہنا ہے۔

> ایک روز فوارہ چوک میں انھیں ایک دیوانہ فقیر مل گیا۔جوان کا راستہ روک کر خوشی سے چلا چلا کر انھیں کہنے لگا،''تو حج پر جائے گا سنا تونے'' ۷

مستنصر حسین تارڑ کی کہانی بھی کچھ اس سے ملتی جلتی ہے۔وہ کہتے ہیں کہ جن دنوں وہ پی ٹی وی پر صبح کی نشریات کی میزبانی کرتے تھے۔کسی اجنبی شخص نے ان کو لنچ کی دعوت دی۔اس نے بتایا کہ وہ دواؤں کی کمپنی میں کام کرتا ہے۔اس شخص کا کہنا تھا اس کی زندگی مختصر ہے۔اور اس نے اپنی زندگی کا حساب کتاب لگایا۔اور جس چیز نے مجھے سب سے زیادہ خوشی دی ہے مستنصر صاحب وہ آپ کی تحریریں ہیں۔اس واقعہ کو بیان کرتے ہوئے مستنصر حسین تارڑ لکھتے ہیں۔وہ شخص کہنے لگا۔

تو میں نے بہت سوچا کہ اس خوشی کے لیے جو آپ نے مجھے عطا کی ہے اس کا شکریہ کیسے ادا کروں۔ شاید ایسے۔ یہ کہہ کر اس نے جیب میں سے ایک چیک نکال کر میری طرف بڑھایا جس پر اڑتیس ہزار روپے کی رقم درج تھی۔ میری خواہش ہے کہ آپ اس رقم سے حج کریں۔ [8]

ایسے ہی بہت سے اشتراکات دونوں سفرناموں میں موجود ہیں۔ ان سفرناموں کا بغور مطالعہ کرنے سے کئی اور مقامات پر بھی اشتراکات نظر آئے۔

مناسک حج سے لاعلمی اور مشورے:

ممتاز مفتی کے حج پر جانے اسباب پیدا ہونے پر انھیں اس بات کا ادراک ہوا کہ ان کو تو خبر ہی نہیں تھی کہ مناسکِ حج کیا ہیں۔ وہ تو ایک غیر مذہبی آدمی تھے۔ انھوں نے دوستوں سے مناسکِ حج کے بارے میں پوچھنا شروع کر دیا۔ اور جو دوست بھی ملتا جس نے حج کیا ہوتا۔ اس سے مشورے بھی لینے شروع کر دیے۔ انھوں نے بک سنٹر سے ایک کتاب بھی خریدی جس پر ''حج بیت اللہ'' لکھا ہوا تھا۔ اس میں ہر موقع پر پڑھی جانے والی آیات درج تھیں۔ پھر وہ قدرت اللہ شہاب کے پاس پہنچ گئے۔ اور ان سے حج کے متعلق سوال کرنا شروع کر دیئے۔ لکھتے ہیں کہ قدرت اللہ شہاب کہتے ہیں۔

''مکہ شریف میں اللہ اور عبد ہوتے ہیں۔ مدینے شریف میں رسول اللہ ﷺ اور امتی ہوتے ہیں۔''

''وہاں بزرگ نہیں جاتے کیا''

''جاتے ہیں''

''تو پھر''

''مسجد میں داخل ہونے سے پہلے سب کو جوتوں کے ساتھ ساتھ مرتبے اور بزرگی کے عمامے بھی اتار دینے پڑتے ہیں۔ اور کوئی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ واپسی پر اس کا عمامہ اسے مل بھی جائے گا''

''پھر تو مرتبے والے بزرگ فکر مند رہتے ہوں گے عام بندے مزے میں ہوں گے۔ اس فکر سے آزاد'' [9]

کچھ ایسی ہی صورتحال سے مستنصر حسین تارڑ بھی دو چار ہوئے انھوں نے بھی دوستوں سے مشورے کیے۔ خاطر خواہ جواب نہ ملا تو اپنی بیوی سے مشورہ کیا۔ جو پچھلے ہی برس فریضۂ حج ادا کر کے آئی تھیں۔ ان سے

پوچھنے لگے۔

''میمونہ بیگم آپ چونکہ ایک تجربہ کار حاجن ہیں تو براہ کرم رہنمائی فرمائیے کہ یہ جو حج ہوتا ہے ،یہ کیسے کیا جاتا ہے۔''

''جب جاؤ گے تب سمجھ میں آجائے گا۔میرے بتانے سے تمھیں کچھ سمجھ نہیں آئے گا۔آج تک میرے بتانے سے کچھ سمجھ میں آیا ہے۔۔سمجھ ہوتو سمجھ میں آئے'' ۱۰

ممتاز مفتی کے سوالات میں فلسفۂ حج اور ارکانِ حج سے بغاوت کی جھلک نظر آتی ہے۔اس بغاوت کی وجہ ان کا ایک عام درجے کا مسلمان ہونا ہے۔وہ اتنے مذہبی نہ تھے۔اس بغاوت کی ایک وجہ لاعلمی بھی ہے۔لیکن جب انھیں کوئی حج کے بارے میں بتاتا ہے تو ان کے دل کے کسی گوشے سے ایک ہُوک سی اٹھتی ہے۔ یہ ہُوک عشق رسول کی ہے۔معرفت کی ہے اور اپنے گناہوں پر پچھتاوے کی ہے۔حج کے بارے میں تفصیل کا پتہ چلتا ہے تو انھیں اپنے وجود میں اس کی سرمستی اترتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

دفعتاً میں نے محسوس کیا جیسے اللہ اور اس کے رسولﷺ کا مجھ سے گہرا تعلق ہو۔میرے دل سے منہ زبانی مسلمان ہونے کا کانٹا نکل گیا۔میرے بند بند میں ایک نیا رشتہ ابھرا۔میں عبد ہوں میرا خالق مجھے بلا رہا ہے۔میں جاؤں گا ،ضرور جاؤں گا حج کرنے نہیں اپنے اللہ کو سلام کرنے کے لیے ،اپنے خالق کو شکریہ ادا کرنے کے لیے کہ اس نے مجھے بنایا۔ایسا بنایا کہ جیسا میں ہوں۔میں جاؤں گا ،اپنے اللہ کو منانے کے لیے جاؤں گا۔یہی عبدیت کی غایت ہے کہ بنانے والے کو منایا جائے ۱۱

کچھ ایسی ہی صورتحال مستنصر حسین تارڑ کے ہاں نظر آتی ہے۔وہ بھی لاعلمی،بغاوت اور بیزاری کا اظہار کرتے ہیں۔لیکن جیسے جیسے زائرین سے مشورے کرتے چلے جاتے ہیں۔ویسے ویسے ان کے قلب میں بھی ممتاز مفتی کی طرح ،معرفتِ الٰہی کی ،عشق نبی کی ،اور اپنی دین سے دوری پر شرمندگی کا عندیہ ملتا ہے تو ممتاز مفتی کی طرح ان کی کیفیات بھی سرمستی سے بھرپور ہیں۔کہتے ہیں۔

۔۔۔میں نے اپنے آپ کو نیوٹرل گیئر میں ڈال دیا تھا۔اپنے آپ کو برا انگیختہ نہیں کیا تھا۔جوش نہیں دلایا تھا۔اور نہ اشتعال دلایا تھا کہ سبحان اللہ میرے یہ نصیب کہ میں آج شہروں کی ماں کی جانب رواں دواں ہوں ۔جس کی جانب پوری حیات میں میرا منہ رہا۔ جہاں میرے نبیﷺ تولد ہوئے۔جہاں اللہ کا گھر ہے۔ادھر جاتا ہوں ۔۔سبحان اللہ ۔۔ نہیں میں نے قطعی طور پر اپنے آپ کو ہپنو ٹائز نہیں کیا۔کمپیوٹر کے ڈیٹا کی سُنی ان سُنی کر دی نیوٹرل گیئر میں رہا۔ ۱۲

سفر کی کیفیات:

عقیدے کی سرشاری کے باوجود مستنصر حسین تارڑ اور ممتاز مفتی دونوں نے ہی سفرنامے کی حیثیت کا قائم رکھتے ہوئے اپنے ان سفرناموں میں سفر کے واقعات اور جزئیات بیان کیے ہیں۔گھر سے حاجی کیمپ، وہاں سے احرام باندھ کر ائیر پورٹ، ہوائی جہاز میں سوار ہونے، دوسرے زائرین کی کیفیات، اور اپنی قلبی حالت، سارا کچھ بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔ممتاز مفتی نے زائرین کی مصروفیات اور ان کے حالات کو اس طرح بیان کیا۔

> زائرین کے ہاتھوں میں تسبیحیں تھیں جو دانہ دانہ رینگ رہی تھیں۔ ہونٹ ہل رہے تھے۔ طیارے کی فضا اداس تھی۔ زائرین جذبے سے بھیگے ہوئے تھے۔لیکن اس جذبے سے چھینٹے نہیں اڑ رہے تھے، غالباً اس لیے کہ جذبہ خالص خوشی کا نہ تھا۔ احترام، ادب اور تشکر نے خوشی کے پر کاٹ رکھے تھے یا شاید اس لیے کہ خوشی کا جذبہ والہانہ ادب کے منافی سمجھا جاتا ہے۔ طیارے میں تقدس بھری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ پتہ نہیں تقدس میں اداسی کیوں پیدا ہو جاتی ہے۔اور وہ اتنی بوجھل کیوں ہوتی ہے۔جوں جوں طیارہ اڑتا جارہا تھا توں توں تقدس گہرا ہوتا جاتا تھا۔اداسی دبیز ہوتی جارہی تھی، دل پر بے نام سا بوجھ بڑھتا جارہا تھا۔ زائرین کے چہروں پر کوئی ولولہ نہ تھا۔آنکھوں میں کوئی ستارہ نہیں چمک رہا تھا [۱۳]

اسی طرح جب مستنصر حسین تارڑ زائرین کا حال بیان کرتے ہیں تو مختصر انداز میں ان کی مصروفیات کے بارے میں بتاتے چلے جاتے ہیں۔ان کی عقیدت، ان کا جوش، مذہبی میلان اور تقدس کی فضاء لکھتے ہیں۔

> لاہور ائیر پورٹ کے انٹرنیشنل لاؤنج میں جب داخل ہوا اور اپنے چھوٹے بیٹے سمیر کی دراز قامتی کے سائے سائے داخل ہوا تو وہاں جدہ کی پرواز کے منتظر۔۔۔تلاوت کرتے۔۔۔ مونگ پھلیاں ٹھونگتے، سوفٹ ڈرنکس چڑھاتے۔۔۔چپس کڑکڑاتے۔۔۔ تسبیحیں پھرولتے اپنے موبائل فونوں پر کاروباری ہدایات دیتے یا مکمل طور پر آسودگی کے عالم میں صوفہ نشستوں میں خوابیدہ منہ کھولے لوگوں میں۔۔۔ایک اجنبی کی مانند داخل ہوا۔ وہ سب کے سب احرام میں لپٹے ہوئے تھے کہ یہ ایک حج فلائٹ تھی [۱۴]

ممتاز مفتی اور مستنصر حسین تارڑ کی ذاتی قلبی کیفیات:

ممتاز مفتی نے اپنی ذاتی قلبی کیفیات کو بیان کرتے ہوئے اس بات کا برملا اعلان کیا ہے کہ ان کے قلب میں ویسی کیفیات پیدا نہیں ہورہی تھیں۔جیسے کسی دوسرے زائرین کے چہرے سے عیاں ہورہی تھیں۔ لکھتے ہیں۔

کیوں کیوں ؟ آخر میرے قلب میں کیوں حرکت پیدا نہیں ہو رہی میرے دل میں تقدس بھرے جذبات کیوں نہیں ابھر رہے؟ کیا میرا ایمان خام ہے؟ کیا میرا قلب مردہ ہے؟ میرے دل میں کئی ایک سوال کیوں، کس لیے، کیسے، چیونٹیوں کی طرح رینگنے لگے۔ مجھے اپنے دل پر شکوک پیدا ہونے لگے۔۔۔میں نے ایک بار پھر اپنے ہمراہوں کا جائزہ لیا وہ سب اللہ کے کلام میں بھیگے ہوئے تھے۔ وہ سب سالک تھے۔صرف میں ایک مجذوب تھا۔ ۱۵

مستنصر حسین تارڑ نے اپنی قلبی کیفیات اور دوسرے کے مقابلے میں اپنی کمزوریوں کو یوں بیان کیا ہے کہ وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ کہیں دوسرے زائرین ان کے اس کچے جذبے کو محسوس نہ کرلیں اور ان سے باز پرس نہ کریں۔

مجبوراً مجھے۔۔اللھم لبیک۔۔کا ورد کرنا پڑا۔لیکن اس حاضری کی نوا میں میرا دل نہ تھا۔خود بخود رجحان نہ ہوتا تھا۔ بلکہ میں کچھ کچھ بے قوف محسوس کرر ہا تھا۔ میں سمیر کے کہنے پر پکارتو رہا تھا لیکن ہر لمحے مجھے یہ خدشہ رہتا تھا کہ یکدم کوچ کے سارے مسافر چپ ہو جائیں گے اور میری گھگھیائی ہوئی بے نیتی آواز اللھم لبیک لبیک۔۔ پکارتی کوچ میں تنہا، بے سُری در بدر ہوگی اور وہ سب میری اس حماقت پر مسکرانے لگیں گے ۱۶

جدہ کا بیان:

ممتاز مفتی سعودی عرب میں پہنچے تو پہلے جدہ میں قیام کیا۔اور مستنصر صاحب نے بھی جدہ میں۔بطور ایک مشاق سفرنامہ نگار ان دونوں ادیبوں نے وہاں کے جغرافیائی اور معاشرتی حالات کو بیان کیا۔ممتاز مفتی لکھتے ہیں۔

بازار میں لوگ اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔راہ گیر اپنی اپنی دھن میں چلے جارہے تھے۔ان کے چہروں پر مصروفیت کی مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ان کی آنکھوں میں خوابوں کے دیے روشن نہ تھے بلکہ ان پر حقائق پسندی کے پردے پڑے ہوئے تھے ۱۷

اسی طرح مستنصر بھی جدہ کے بازار میں گھومے پھرے اور تقریباً اس طرح کی کیفیات کا اظہار کیا۔

جدہ اتنا سخت گیر اور بنیاد پرست شہر بھی نہ تھا۔وہاں وہ سب کچھ تھا۔۔۔خوب چہل پہل تھی۔فٹ پاتھوں پر لوگ تھے۔موٹر سائیکلیں تھیں۔زیادہ تر غیر ملکی تھے۔جو اپنے ملکوں کی غربت سے فرار ہو کر سعودیوں کی غلامی میں چلے آئے تھے۔اور اپنی خوشی سے چلے آئے تھے ۱۸

خانہ کعبہ پر پہلی نظر:

خانہ کعبہ پر پہلی نظر پڑتے ہوئے ان دونوں عظیم ادیبوں کے نظریات اور قلبی کیفیات کیا تھیں۔ان میں بھی کافی اشتراک پایا گیا۔ یہ دونوں حضرات چونکہ ایک عام دنیا دار آدمی تھے اور خاص طور پر لکھاری تھے۔لہٰذا ان کی قلبی حالت عام لوگوں سے مختلف تھی۔ممتاز مفتی نے خانہ کعبہ میں اتنی خوبصورتی محسوس نہ کی۔ لیکن اسے دیکھ کر ان کی قلبی کیفیت عجیب وغریب ہوگئی۔

> کالے پتھروں بنا ہوا ایک بے ڈھب کوٹھا جس پر سیاہ غلاف چڑھا تھا۔۔۔میرے وجود کے فلیتے کو گویا چنگاری دکھادی گئی اور وہ زو،زوزوں سے راکٹ کی طرح فضا میں اُڑ گیا۔میرے بدن پر سرخ چیونٹے رینگنے لگے۔ان سرخ چیونٹوں کے سروں پر جلتے دیئے تھے۔ان دیوں کے شعلے گویا انگلیاں تھیں۔جو سب کوٹھے کی طرف اشارہ کر رہی تھیں۔میری نس نس میں سوڈے کی بوتلیں کھل گئیں اور ان سے بلبلے اٹھنے لگے۔پھر میرے قلب میں ایک دھماکہ ہوا میرے وجود کی دھجیاں اُڑ گئیں اور سارے حرم شریف میں بکھر گئیں۔وہ عظیم الشان مسجد معدوم ہوگئی زائرین کا بے پناہ ہجوم چیونٹیوں میں بدل گیا۔صرف کوٹھارہ گیا۔پھر وہ کوٹھا ابھرتا گیا۔ حتیٰ کہ ساری کائنات اس کی اوٹ میں آگئی۔نہ جانے میں کیا تھا،کیا کر رہا تھا۔ساری کائنات گویا فنا ہو چکی تھی۔ملبے کا ایک عظیم ڈھیر،اس ڈھیر پر اللہ میاں بیٹھے تھے [19]

مستنصر حسین تارڑ نے جب خانہ خدا کو پہلی مرتبہ دیکھا تو انھیں بھی اس میں کوئی خوبصورتی نظر نہ آئی اور ممتاز مفتی کی طرح ان کی قلبی کیفیت بھی لطافت اور سرشاری سے ہمکنار ہوگئی۔لکھتے ہیں۔

> بے شک اس سے اگلے لمحے مجھے غلاف کعبہ کا ایک حصہ نظر آگیا۔سیاہ غلاف سے ڈھکی مکعب نما عمارت جو مکمل مکعب نہیں ہے۔اونچائی چوڑائی میں کچھ فرق ہے۔انسانیت اس کے گرد گھیرا ڈالے اس کے گلے کا ہار ہو رہی تھی۔۔۔میں خانہ کعبہ پر ایک نظر ڈال کر اس سے غافل ہوگیا اس میں وہ بات نہ تھی۔جو اس کا گرداب ہونے والے سفید ذروں کے تحرک میں تھی۔ذروں کا یہ بہاؤ بہتے بہتے طواف کرتے کرتے یوں لگتا تھا جیسے اس سیاہ عمارت میں جذب ہو رہا ہے۔ابھی جذب ہوتا ہے اور ابھی اس میں سے پھوٹ کر بہنے لگتا ہے۔یہ رب کا گھر تھا لیکن اس کے گرد بہتے ذرے اس گھر سے کہیں اہم ہو رہے تھے۔گھڑیوں کی سوئیوں کی مخالف سمت میں رواں یہ آہستہ رونیند میں لے جانے والے سحر کا مدھم سیلاب رب کے گھر کو اہم بنا رہا تھا۔۔۔یہ سفید بہاؤ جیسے دھیرے دھیرے خانہ کعبہ کو تعمیر کر رہا تھا۔۔۔یہ نہ ہوتا تو پھر وہ کہاں ہوتا [20]

دعاؤں کا سلسلہ:

ممتاز مفتی کی طرح مستنصر حسین تارڑ نے بھی اس عظیم الشان مقام پر پہنچ کر برسوں سے دلوں میں دبی ہوئی دعاؤں کو زبان پر لانے کی جرأت کی۔ان سفرناموں میں دونوں مصنفین نے دعاؤں کا سلسلہ شروع سے آخر تک جاری رکھا۔لیکن جو دعائیں اور جس شدت سے، خشوع وخضوع سے دعائیں انھوں نے حرم پاک میں مانگیں ان سے ان کی قلبی انکساری، عاجزی اور رقت کا احساس ہوتا ہے۔ممتاز مفتی لکھتے ہیں۔

حیران کن بات یہ تھی کہ قدرت کا کھڑے ہونے کا انداز عجیب تھا۔اس میں عجز، ندامت، گناہ گاری اور توبہ کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے۔قدرت کو کھڑے دیکھ کر بار بار مجھے وہ پینٹنگ یاد آتی تھی جس میں عالم دعا میں "جاب" کے عجز، ندامت اور توبہ بھرے ہاتھ دکھائے گئے تھے۔ ۲۱

دعائیں ہر مسلمان کا اثاثہ ہوتی ہیں۔خصوصاً وہ دعائیں جو حرم پاک میں مانگی جائیں۔مستنصر صاحب کی دعائیں بھی خشوع وخضوع سے بھری پڑی ہیں۔

اے اللہ، بے شک یہ حرم آپ کا حرم ہے۔اور یہ شہر آپ کا شہر ہے۔اور آپ کا امن واقعی امن ہے۔اور بندہ آپ کا بندہ ہے، میں دور کے شہر سے حاضر ہوا ہوں۔بہت سے گناہوں اور برے اعمال کے ساتھ ۔۔۔میں آپ سے سوال کرتا ہوں اس شخص کا سوال جو بہت مجبور ہے۔اور آپ کے عذاب سے ڈرنے والا ہے۔اس بات کو سوال کہ آپ مجھے اپنی معافی سے اپنے حرم میں رکھیں ۔۔۔حساب کتاب نہ کریں ۔۔۔اپنی معافی سے اپنے حرم میں رکھیں ۲۲

طوافِ کعبہ:

طوافِ کعبہ کی کیفیات ممتاز مفتی نے کچھ رقم کی ہیں۔

۔۔۔اس وقت میرے نزدیک کسی کی کوئی حیثیت نہ تھی۔صرف میں تھا اور میرے اللہ تھے۔میں دیوانہ وار جوان ملا کے پیچھے پیچھے خانہ خدا کے پھیرے لینے لگا ۲۳

مستنصر حسین تارڑ اپنے طوافِ کعبہ کی حالت اس طرح بیان کرتے ہیں۔

جب اور کچھ باقی نہ رہا تو یقین کیجئے میں نے صدقِ دل سے رب کے گھر کے گرد گردش میں تھا۔منافقت سے کام لینا چاہتا تو بھی نہیں لے سکتا تھا۔۔۔میں یقیناً وہ نہ تھا، جو لاہور میں تھا کوئی اور تھا۔۔۔کون تھا۔۔۔پتہ نہیں کون تھا۔۔۔میں نہ تھا۔خانہ کعبہ کے گرد طواف

کرتے ہوئے آپ تنہا نہیں چلتے۔ ہمیشہ کے لیے گم ہو چکے۔۔۔خاک ہو چکے۔۔۔بچھڑے
ہوئے بھی آپ کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں ۲۴

بوسہ حجرِ اسود:

ممتاز مفتی نے حجرِ اسود کے بوسہ کے متعلق جو لکھا ہے اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے حجرِ اسود کو بوسہ نہیں دیا۔ بہت زیادہ رش کی وجہ سے یا اپنی ناتوانی کی وجہ سے، وجہ بھی تو ہو، لکھتے ہیں۔

> سنگِ اسود کے قریب زائرین دھکم پیل کر رہے تھے۔سنگ اسود کو بوسہ دینے کی خواہش ان پر بھوت بن کر سوار تھی۔ ہر کوئی دوسرے کو پیچھے کی طرف دھکیل رہا تھا۔ اپنا راستہ بنانے کے لیے یوں کندھے مار رہا تھا جیسے مطاف فٹ بال گراؤنڈ ہو۔''اوئے صاحب''میر صاحب نے آہ بھری، لو دیکھ لو دو دن میں بیسیوں بار طواف کر چکے ہیں۔ لیکن سنگِ اسود کو بوسہ دینے کی سعادت نصیب نہیں ہوتی۔ وہاں کوئی فٹ بالر ہی پہنچ سکتا ہے میر صاحب ۲۵

اسی طرح مستنصر حسین تارڑ کے بیان سے بھی ایسا ہی محسوس ہوتا ہے جیسے وہ بھی حجرِ اسود کو بوسہ نہ دے سکے۔طواف کے سات پھیرے مکمل ہونے کا بیان مکمل طور پر موجود ہے۔جس میں وہ لکھتے ہیں کہ ہر بار وہ طواف کا ایک پھیرا مکمل ہونے پر دونوں ہاتھ اٹھاتے۔اور حجرِ اسود کی طرف منہ کر کے''اللہ اکبر'' کہہ لیتے اور پھر اگلے پھیرے پر چل پڑتے۔ ان کی عقیدت کا یہ عالم تھا کہ خانہ کعبہ کی دیوار کو دیوانہ وار چوما۔لیکن بوسہ حجرِ اسود نصیب نہ ہوا۔ لکھتے ہیں۔

> ساتواں پھیرا مکمل ہوا۔اور اس سیاہ پٹی پر قدم رکھا جو حجرِ اسود تک چلی جاتی تھی تو ہم نے اس پتھر کو جسے میں چوم نہ سکا تھا، ہاتھ بلند کر کے الوداع کہا اور بہاؤ سے الگ ہو گئے۔۔۔میری زندگی کا پہلا طواف مکمل ہو گیا تھا ۲۶

عبادات:

طوافِ کعبہ سے فارغ ہو کر عبادات کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ممتاز مفتی نے قدرت اللہ کے کہنے پر میزابِ رحمت کے نیچے نماز ادا کرنے کا پروگرام بنایا۔ میزابِ رحمت خانہ کعبہ کی چھت پر لگا پرنالہ ہے جہاں سے بارش کا پانی گرتا ہے۔ اس کے نیچے ایک چھوٹی سی چار دیواری ہے۔ جہاں پچاس ساٹھ آدمیوں کے نماز پڑھنے کی جگہ ہے۔اسے''حطیم'' کہتے ہیں۔ممتاز مفتی اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ وہاں پہنچتے ہیں اور نوافل کی ادائیگی کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ۲۷

مستنصر حسین تارڑ لکھتے ہیں:

حجرِ اسود سے فارغ ہوکر مقامِ ابراہیمؑ کی قربت میں نفل ادا کرنے کے لیے کھڑے ہوگئے کہ
یہی دستور تھا ۲۸

عورتوں اور مردوں کی ایک جگہ موجودگی:

دورانِ حج عورتوں اور مردوں کی ایک ساتھ موجودگی بھی ایک عجیب وغریب منظر پیش کرتی ہے۔فکری اور موضوعاتی تناظر میں بات کریں تو طواف کعبہ، عبادات، کیفیات اور بوسہ حجرِ اسود کے موضوعات کی طرح یہ بھی ایک اہم موضوع ہے کہ جس پر ممتاز مفتی اور مستنصر حسین تارڑ، دونوں نے بات کی۔ممتاز مفتی کی تحریروں کا ایک اہم موضوع عورت ہوا کرتی تھی۔ان کے خیال میں ایک عورت ایک نشرگاہ ہے۔ایک ٹرانسمیٹر ہے۔ جو یہ پیغامات نشر کرتا رہتا ہے۔کہ میری طرف دیکھ، میں عورت ہوں اور یہ ٹرانسمیٹر خودکار طریقے سے چالو بھی ہوجاتا ہے۔لیکن ممتاز مفتی اس سفرِ حج کے دوران ایسی صورتحال کو دیکھتے ہیں جہاں عورتیں اور مرد اکٹھے ہیں۔لیکن وہ اس ساری سچویشن کو ایک نئے زاویے سے دیکھتے ہیں۔ وہ عقیدت اور خدا تعالیٰ کی حضوری میں اس قدر گم ہیں کہ انھیں یہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ حرم میں عورتیں بھی موجود ہیں۔انھیں کسی نے احساس دلایا کہ طواف میں عورتیں اور مرد گڈمڈ ہورہے ہیں۔ اگر درمیان میں ایک دیوار بنادی جاتی تو بہتر تھا لیکن ممتاز مفتی کہتے ہیں کہ میں ادھر اُدھر دیکھا تو مجھے کوئی عورت دکھائی نہ دی۔سوا لاکھ عورتیں اس وقت حج کرنے آئیں ہوئیں تھیں لیکن مجھے صرف زائرین نظر آرہے تھے، عورتیں نہیں۔''سوا لاکھ عورتیں تو حرم میں بیٹھی تھیں، ان سب کے ٹرانسمیٹر خراب ہوچکے تھے۔'' ۲۹

مستنصر حسین تارڑ بھی طواف کے موقع پر عورتوں کی موجودگی پر قلم اٹھاتے ہیں۔انھوں نے اس منظر کو مثبت انداز میں سوچتے ہوئے دیکھا کہ اس جگہ عورت مرد کے برابر ہے۔عورتوں کو حج کے دنوں میں کسی بھی جگہ پر عبادت کرنے کی اجازت ہے۔ وہ دیگر ممالک سے آئی ہوئی عورتوں کو بھڑکیلے لباسوں میں عبادت کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ وہ جھومتی جاتی ہیں اور وجد میں اپنے خالق سے باتیں کرتی جاتی ہیں۔ افریقی، ملائیشین، عرب اور یورپین عورتیں اپنی اپنی علاقائی زبانوں میں دعائیں کررہی تھیں۔مستنصر صاحب نے ان عورتوں کی وہاں موجودگی کو اس تناظر میں دیکھا کہ ایک ہی جگہ مردوں اور عورتوں کا عبادت کرنا خوشکن احساس ہے۔

لیکن ایک ہی صف میں خواتین کے برابر نفل ادا کرنے کا تجربہ مجھے بہت خوشگوار لگا۔مکمل
ہونے کا احساس ہوا ۳۰

منیٰ کا بیان:

منیٰ وہ مقام ہے جہاں ابلیس نے حضرت ابراہیم کا بہکانے کی کوشش کی تھی۔تین مرتبہ وہ ان کے راستے میں آیا۔ حضرت ابراہیمؑ حضرت اسماعیلؑ کی انگلی پکڑ کر اس راستے سے جارہے تھے۔ جہاں انھوں نے بیٹے کو قربان کرنا تھا۔ اللہ کی راہ میں، اس وقت ابلیس نے ان کو بہکانے کی کوشش کی۔کہ کیوں اپنے بیٹے کو

قربان کرر ہے ہیں۔ یہ کہاں کا انصاف ہے۔ جب وہ متزلزل نہ ہوئے تو ابلیس نے حضرت اسماعیل سے کہا کہ اپنی جان چھڑا کر بھاگ جاؤ۔لیکن وہ دونوں باپ بیٹا اللہ کی راہ سے نہ ہٹے۔انہی تینوں مقامات پر جہاں اس نے بہکانے کی کوشش کی تھی۔تین پتھر کے بت گڑے ہوئے ہیں۔جنہیں جمرۃ العقبیٰ ،جمرۃ الوسطیٰ اور جمرۃ اولیٰ کہا جاتا ہے۔ان کے بارے میں ممتاز مفتی لکھتے ہیں۔

> لوگ کہتے ہیں کہ ان مقامات کی نشاندہی کے لیے یہ پتھر گاڑے گئے ہیں ---اونہوں---یہ نشانات نہیں ، یہ تو شیطان کو پتھر بنادیا گیا ہے۔اور پتھر بن کر بھی اس کے اثرات جوں کے توں قائم ہیں ،انھوں نے اپنے اثرات سے اس شہر کو منیٰ بنادیا ہے۔وسوسوں کا شہر،الحاد کا شہر،تذبذب کا شہر،یہاں بڑے بڑے ڈول جاتے ہیں۔ بڑوں بڑوں کی منزل کھوٹی ہوجاتی ہے۔اندھوں کے ہاتھوں سے لاٹھیاں چھوٹ جاتی ہیں۔ ۴۱

مستنصر حسین تارڑ بھی منیٰ میں پہنچے، وہاں کا حال دیکھا۔اسے اپنے قلم کے ذریعے قارئین تک اس انداز میں پہنچایا۔

> دنیا بھر میں اپنی نوعیت کا یہ واحد شہر ہے۔جو سارا سال بھائیں بھائیں کرتا رہتا ہیں۔اجاڑ کھنڈر شہر ہے۔ایک ایسے شہر کی مانند جو کسی لق ودق صحرا کی ویرانیوں میں سونا دریافت ہونے پر یکدم سونے کے حصول کے لالچ میں وہاں ہجوم کرنے والوں کی آمد سے---ان کی موجودگی سے وجود میں آتا ہے۔اور پھر سونے کی کانوں میں جب آخری ڈلی ،آخری ذرہ برامد ہوجاتا ہے۔اور وہ کانیں بے کار ہوجاتی ہیں تو ان کے ساتھ ہی وہ بھراپرا شہر بھی بنجر ہوجاتا ہے ۴۲

وقوفِ عرفات:

وقوفِ عرفات کا منظر ممتاز مفتی کے ہاں بڑی تفصیل سے ملتا ہے۔لبیک میں انھوں نے باقی مناظر کی تفصیل کے ساتھ ساتھ وقوفِ عرفات کو بھی مفصل لکھا۔

> آپ کے سامنے ایک عظیم انبوہ ہے۔ ننگے کالے سروں اور سفید پیراہنوں کا انبوہ۔قطار در قطار انبوہ۔اس ویرانے میں اتنے عظیم انبوہ کو دیکھ کر آپ کے دل میں حیرت پیدا ہوتی ہے۔پھر آپ سوچتے ہیں کہ ان میں سے ہر فرد ہزاروں میل کا سفر کر کے دنیا کے کونے کونے سے وہاں پہنچا ہے۔اس خیال سے آپ کے دل پر ہیبت سی چھاجاتی ہے ۴۳

مستنصر حسین تارڑ نے بھی منیٰ کے بعد عرفات کے میدان میں پہنچنے کے واقعات کو بطریق احسن بیان

کیا ہے۔ وہاں لوگوں کا ہجوم، صحرا کی گرمی، لاکھوں لوگوں کی موجودگی ان کی صدائیں، دعائیں اور التجائیں سب بیان کی ہیں۔

> اگر چہ لبیک کی اجتماعی صدائیں، بے حد پُر اثر اور بدن کے مساموں اور لوں لوں میں سرایت کر کے اندرون تک اثر کر دل کے آس پاس پکارتی تھیں۔ حاوی ہوتی جاتی تھیں، لیکن ان مسلسل لاکھوں صداؤں میں ایک دہشت کا عنصر بھی تھا۔ ایک خوف، ایک ڈر بھی تھا۔ لاکھوں آوازوں کی گونج کانوں میں اترتی تھی تو بدن کانپنے لگتا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ یہ کیا ہے جو میں نہیں جانتا تھا جس کی مجھے خبر نہ تھی۔ اور یہ جو کچھ بھی ہے اسے جان لینے کے بعد میرے ساتھ کیا ہوگا ۳۴

کنکریاں مارنا:

جمروں کو کنکریاں مارنے کے منظر کو ممتاز مفتی نے جس انداز میں بیان کیا ہے ایسے لگتا ہے جیسے وہ ہمارے سامنے ہو اور ہمیں نظر آ رہا ہو۔ زائرین کا شور، ان کے تمسخر اور حقارت سے سوجے ہوئے چہرے، غصے سے ان کے سرخ ہوئے منہ، ایک عجیب منظر ہے۔ اس موقع پر کئی لوگ ان شیاطین کو گھونسے دکھاتے ہیں۔ کچھ لوگ ان پر تھوکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کچھ لوگ تو کنکریاں مارنے کے بعد اپنے جوتے اتار کر ان جمروں کو پیٹ رہے تھے۔ ممتاز مفتی نے بھی دور سے دوڑ کر آ کر جمرے کو پتھر مارا تو انھیں اپنے چہرے پر پتھر لگتے ہوئے محسوس ہوئے۔ اس موقع پر ممتاز مفتی نے ایک عجیب فکری صورتحال کا ذکر کیا ہے۔ کہتے ہیں۔

> جب میری ناک پر تیسرا پتھر لگا تو میں سوچنے لگا۔ کیا میں جمرہ کو پتھر مار رہا ہوں یا جمرہ مجھے پتھر مار رہا ہے۔ کیا وہ مجھے اس بات کا احساس دلا رہا تھا کہ وسوسے ڈالنے والا نافرمانی پر مائل کرنے والا، خود میرے ہی اندر موجود تھا ۳۵

مستنصر حسین تارڑ نے بھی ''منہ ول کعبے شریف'' میں شیطان کو کنکریاں مارنے کا منظر بیان کیا ہے۔ اس منظر میں انھوں نے اپنی دلی کیفیات کو بھی بیان کیا ہے۔ وہ پہلے تو اس عمل کو ایک مجنونانہ سا فعل قرار دیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ ہر سال جمرے کو لاکھوں کنکریاں پڑتی ہیں۔ اس حساب سے تو منیٰ کے میدان سے کنکریاں ختم ہو جانی چاہییں۔ پھر وہ سوچتے ہیں کہ شاید بڑا شیطان وہ کنکریاں واپس وہیں پھینک جاتا ہے اور انسانوں سے کہتا ہے کہ اس سال تو تم مجھے نہیں مار سکے اگلے برس پھر مقابلہ کر لینا۔ وہ خود جب کنکریاں مارنے کے لیے آگے بڑھے تو دیکھا کہ ہزاروں لاکھوں کنکریاں جمرے پر پڑ رہی ہیں اور وہ اس برسات میں نہایت اطمینان اور تحمل سے کھڑا ہے۔ اور کہہ رہا ہے کہ آج جوش میں تم مجھے مار رہے ہو لیکن اپنی اپنی دنیاؤں میں واپس جاؤ گے تو تمھارا جذبہ ٹھنڈا پڑ جائے گا اور پھر سے میرے راستے پر چلنے لگو گے لیکن پھر بھی مستنصر صاحب نے کنکری

پکڑی۔۔۔۔لکھتے ہیں۔

> نشانہ میرے سامنے تھا اور میں اولمپک کھیلوں میں شامل کسی نشانہ باز کی کی مانند حساب لگا رہا تھا کہ فاصلہ کتنا ہے۔ٹارگٹ کا حجم کیا ہے۔اور اس پر کتنی قوت سے کمان کو کتنا کھینچ کر تیر چلایا جا سکتا ہے۔مجھے یقین نہ آیا کہ یہ میں ہوں۔یہ میں جو اس عمل کو ایک قدرے مزاحیہ انداز میں لیتا تھا۔اسے دانش سے عاری ایک عمل سمجھتا تھا اور یہ میں ہی تھا جو دیوانگی میں نہیں بلکہ مکمل حواس میں۔۔جوش سے الگ ہوش میں۔انتہائی سنجیدگی کے ساتھ پہلی کنکری پھینکنے کے بعد نہایت غصیلی حالت میں کنکریاں برساتا چلا جاتا تھا ۳۶

مستنصر حسین تارڑ لکھتے ہیں کہ ہزاروں لوگوں کے مجمعے کے دباؤ سے پسلیاں دب جاتی تھیں پچھلے لوگوں کی کنکریاں سروں کے اوپر سے شائیں شائیں کر کے گزرتی جاتی تھیں۔ان میں سے کوئی کنکری مجھے بھی آ کر لگ جاتی تھی۔میں درد سے بلبلا اٹھتا تھا۔کچھ لوگ مجھے شیطان سمجھ رہے تھے۔اور یہ میری حصے کی کنکریاں تھیں جو مجھے لگ رہی تھیں۔

روضۂ رسول پر حاضری:

لبیک اور منہ ول کعبے شریف میں فکری اور موضوعاتی اشتراکات کی تلاش کرتے کرتے ہم مناسک حج سے لے کر روضۂ رسول پر حاضری تک پہنچتے ہیں۔بہت سے مقامات پر دونوں ادبا کا فکری اور موضوعاتی اسلوب ایک سا ہے۔مکہ میں مناسکِ حج ادا کرنے کے بعد روضہ رُسول پر حاضری دینا ایک مخصوص مکتبۂ فکر سے تعلق رکھنے کی غمازی کرتا ہے۔ہر حاجی مدینہ شریف نہیں جاتا۔لیکن ان دونوں ادیبوں کا فکری رویہ ا نہیں روضۂ رسول پاک پر حاضری دینے اور رسول اللہ سے اپنی عقیدت کے اظہار پر مائل دکھائی دیتا ہے۔لیکن اس عقیدت میں ندامت اور شرمندگی ہے۔اپنے آپ پر شرمساری ہے۔روضۂ رسول کی طرف جاتے ہوئے ان کے اندر ایسے کوئی جذبات پیدا نہ ہو رہے تھے۔جن سے ایمان کی پختگی ظاہر ہوتی ہو۔وہ لکھتے ہیں:

> چاہیے تو یہ تھا کہ جذبہ کی شدت سے میرا سینہ پھٹ جاتا جسم کی پھپھوندیاں اڑ کر سڑک پر بچھ جاتیں اور پھر صدیوں اس راہ پر جانے والوں کے قدم چومتا رہتا۔لیکن کچھ بھی نہیں ہو رہا تھا۔کچھ بھی نہیں،دل بند،قلب بند،خالی جیسے ساری کائنات کا خلا میرے سینے میں آ گھسا ہو ۔اس خلا کی وجہ سے میں شرمندگی محسوس کرنے لگا۔احساس شرمندگی بڑھتا گیا حتیٰ کہ وہ اس قدر بڑھ گیا کہ میں نے جھوٹ موٹ کا رونا شروع کر دیا کہ میں تو مدینہ منورہ حاضری دینے سے سرشار ہوں۔میں تو ہمیشہ سے حضور کا دلدادہ رہا ہوں۔ہمیشہ سے۔ ۳۷

مدینہ پہنچنے پر جیسا احساس ممتاز مفتی کے قلب و ذہن میں تھا ویسا ہی احساس مستنصر صاحب کے ہاں

بھی نظر آتا ہے۔وہ بھی ایک بے حسی کا شکار رہے۔قلب و ذہن میں کوئی ایسی انوکھی اور پر از عقیدت واردات نہ ہوئی۔بلکہ ایک سپاٹ جذبہ طاری رہا۔وہ مدینہ شریف میں موجود ''پاکستان ہاؤس'' کی چھٹی منزل پر کمرہ نمبر ۲۰۸ میں موجود تھے۔جہاں سے مسجد نبوی کا منظر نظر آتا تھا۔انھوں نے ریلنگ سے آگے جھک کر روضۂ رسول کو دیکھنا چاہا تو انھیں صرف مینار نظر آیا۔محمد علی ظہوری نے مسجد نبوی کے میناروں کے بارے میں ہی کہا تھا۔

جب مسجد نبوی کے مینار نظر آئے
اللہ کی رحمت کے آثار نظر آئے

اس مینار پر جب مستنصر حسین تارڑ کی نظر پڑی تو وہ اپنے جذبات یوں قلمبند کرتے ہیں۔

> تمہارے نصیب میں حیات میں پہلی بار نبی کی مسجد کا مینار تمہارے سامنے ہے۔۔۔رشک کرو اپنی بینائی پر۔۔صدقہ دوان دو آنکھوں کا جو اسے دیکھتی ہے۔شکر ادا کرو اس تندرستی کا جو نہیں یہاں تک لے آئی ہے۔اور قسمت کیسی خوش ہے تمہاری کہ تمہارے رسول ﷺ کے ہاتھوں کی تعمیر کردہ مسجد کا مینار تمہارے سامنے ہے۔لیکن یہ سعی لا حاصل تھی۔نہ کوئی اضطراب بدن میں تیرا۔۔نہ کوئی ہیجان لہو میں رواں ہوا۔اور نہ کوئی جوش لاوے کی مانند آگ ہوا۔۔۔کچھ بھی نہ ہوا۔۔میں جوں کا توں کھڑا رہا۔جیسے کسی بھی مسجد کے مینار کو تکتا ہوں۔[۳۸]

الوداعی جذبات:

مناسکِ حج ادا کر لینے،مدینہ منورہ میں روضۂ رسول پر حاضری دے لینے،دعائیں مانگ لینے اور چالیس نمازیں پوری کر لینے کے بعد جب حج مکمل ہو چکا تو واپسی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ممتاز مفتی کے بقول مکہ معظمہ سے وداع ہونے میں اور مدینہ منورہ سے وداع ہونے میں فرق ہے۔مدینہ شریف میں زائرین کے ٹولے آتے رہتے ہیں اور جاتے رہتے ہیں۔اس لیے وہاں مکہ جیسے عظیم الشان وداع کا منظر پیدا نہیں ہوتا۔وہ لکھتے ہیں:''جہاں تک اللہ والوں کا تعلق ہے۔ان کے وداع میں خوشی کا عنصر ہوتا ہے۔''[۳۹]

وہ کہتے ہیں کہ ایئر سروسوں کے دفتروں میں،سمندری جہازوں کے بکنگ آفسوں میں ہوائی اڈوں پر اور بندرگاہ پر لوگوں کے ٹھٹھ لگے ہیں۔سبھی لوگ دعائیں مانگ رہے ہیں کہ خدا ہمارے حج کو قبول فرمالے اور ہم جلد اپنے گھروں کو پہنچیں۔ممتاز مفتی اپنے کسی بھی موضوع پر بات کرتے ہوئے اپنے مخصوص فکری لہجے سے باہر نہیں نکلتے،لکھتے ہیں:

> میں ان سے جن کی سیٹ بک ہو چکی ہے،جن کا ایروپلین منتظر ہے۔میں وہ خوش قسمت فرد ہوں جو اس ''مصیبت'' سے چھٹکارا پا چکا ہے۔اور اپنے وطن کو عازم ہے۔[۴۰]

ممتاز مفتی کے فکری اور موضوعاتی پہلو کہیں نہ کہیں مستنصر حسین تارڑ سے ضرور جا ملتے ہیں۔ مستنصر بھی اپنے جذبات کا اظہار انہی کی طرح بانگِ دہل کرتے ہیں۔ الوداعی جذبات کو اپنے رنگ میں بیان کرتے ہیں۔

> طوافِ وداع کی ایک عجیب اداسی تھی۔ ایک دکھ تھا۔ بے شک وہ اس کا گھر تھا۔ ہم پل دو پل کے مہمان تھا۔ اس کے گھر کو اپنا گھر سمجھ لیا تھا۔ اور جانے کو جی نہ چاہتا تھا۔ ہمیں اس کے آس پاس رہنے کی عادت ہوگئی تھی۔ ''ہن وچھڑنا ہویا محال نی'' ۔[۴۱]

وطن واپسی پر لوگوں کے تاثرات:

ممتاز مفتی وطن واپسی پر خود کو ایک راج ہنس اور دوسرے لوگوں کو کالے کوّے سمجھنے لگے۔ وہ سب میں، میں کی رٹ لگاتے تھے۔ جبکہ ممتاز مفتی خود کو ایسا عظیم انسان سمجھ رہے تھے۔ جس کا مقام ان سب سے بالا ہے۔ جسے خانہ کعبہ کو دیکھنے کا اعزاز حاصل ہوا۔ سبز جالیوں کو تھامنے کو شرف ملا۔ خانہ کعبہ کی دیواروں کا لمس ہاتھوں میں محفوظ تھا۔ لیکن انھیں لوگوں کے رویے سے ایسا محسوس ہوا جیسے انھوں نے کوئی خاص کام سرانجام نہیں دیا۔ لوگ ان کی عظمت کو تسلیم کرنے سے انکاری تھے۔ ایسے جیسے وہ مکہ اور مدینہ کی بجائے چیچو کی ملیاں سے ہو کر آئے ہوں۔ چند بے تکلف دوستوں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ ''جتھوں دی کھوتی، اوتھے آن کھلوتی'' اپنی ان کیفیات کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> میرا خیال تھا کہ میری آمد کی خبر سن کر محلے والے آئیں گے۔ لیکن کوئی بھی نہ آیا۔ انھیں علم ہی نہ تھا کہ میں حج پر گیا ہوں۔ محلے والوں، گھر والوں اور دوستوں کی سرد مہری کی وجہ سے میرا دل بیٹھ گیا۔ اور وہ حاجی جسے میں بڑی امید اور امنگ سے اپنے ساتھ لایا تھا، عزیزوں کی سرد مہری کی وجہ سے سسک سسک کر دم توڑ گیا۔ اس کا یہ انجام دیکھ کر میں نے انتقاماً اس پرانے بوسیدہ غلیظ ممتاز مفتی کو نکالا اور آپ پر طاری کر لیا۔[۴۲]

مستنصر حسین تارڑ نے سعودیہ سے واپسی پر خود کو ایک ایسے جہاز میں سفر کرتے ہوئے دکھایا ہے۔ جس میں وہ خود کو اکیلا محسوس کرتے ہیں۔ باقی جہاز میں گداگر اپاہج اور فقیر تھے۔ وطن واپس پہنچے تو انھیں بھی ممتاز مفتی کی طرح لوگوں کی بے حسی کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کے دلی جذبات قلبی واردات، ایمانی عقیدت اور حاضری کی کیفیات لوگوں کو متاثر نہ کر سکیں۔ لیکن چند ایک دوستوں نے ان کی ایک مخصوص کیفیت کو قبول بھی کیا۔ وہ مخصوص کیفیت یہ تھی کہ انھوں نے سو رنگوں سے رنگا گوڑھے، گاڑھے عجیب رنگوں سے پینٹ کیا ہوا ایک بھنورا خانہ کعبہ کے غلاف کی سیاہی میں چپکا ہوا دیکھا تھا۔ اپنی اس کیفیت کو لوگوں سے شیئر کرنے سے متعلق وہ یوں رقم طراز ہیں۔

وہ بھنورا جو صرف میرے لیے وہاں براجمان تھا۔ جسے سمیر کے علاوہ اور کوئی نہ دیکھتا تھا۔ حج سے واپسی پر میں نے اپنے جاننے والوں کو اس منظر میں شریک کیا تو گویا ایک شک میں شریک کیا۔ انھوں نے کبھی خانہ کعبہ کے غلاف پر کسی جاندار شے کو براجمان نہیں دیکھا تھا۔ البتہ ایک دوست نے کچھ شک نہ کیا۔ ایمان لے آئے اور کہنے لگے، تم بار بار بیان کرتے ہو کہ حج کے دوران میرے ساتھ تو کوئی معجزہ نہیں ہوا۔ کوئی انہونی بات نہیں ہوئی ۔۔ تو یہ کیا ہے؟ معجزے اسی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ اس پر بھی غور کرو کہ وہاں سیاہ غلاف پر وہ تتلی صرف تمہارے لیے بٹھادی گئی تھی۔ یہ محض اتفاق نہ تھا۔ ۴۳

لبیک اور منہ ول کعبے شریف میں اسلوبیاتی اشتراکات

ہم نے مذکورہ دونوں سفرناموں میں فکری و موضوعاتی اشتراکات کا جائزہ لیا۔ اب ہمیں لبیک اور منہ ول کعبے شریف میں اسلوبیاتی اشتراکات کا جائزہ لینا ہے۔ اسلوبیاتی اشتراکات کا جائزہ لینے سے قبل اس بات کا سمجھنا ضروری ہے کہ اسلوب کیا ہے۔

کسی تحریر کے فکر و معانی اور ہیئت وصورت یا مافیہ و پیکر کے امتزاج سے پیدا ہونے والے مجموعی تاثر کو اسلوب کہا جاتا ہے۔ کچھ لوگوں کے نزدیک محض اندازِ نگارش اور طرز بیان اسلوب ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ پروفیسر مرے کے مطابق اسلوب کے مختلف معانی ہیں ۔ ان کے خیال میں اسلوب کی تعریفیں ناقص اور نامکمل ہیں ۔ اسلوب کی ایک تعریف یہ ہے کہ مصنف کی مکمل شخصیت کا دوسرا نام اسلوب ہے۔ یہ تعریف بظاہر کامل نظر آتی ہے لیکن اس کا تجزیہ کریں تو یہ بات سو فیصد درست ثابت نہیں ہوتی۔ ہنری بیل کہتا ہے۔

> اسلوب کا مطلب یہ ہے کہ فن کار کسی سلسلۂ فکر کے اظہار کے وقت وہ تمام کوائف شامل کرے ۔ جو سلسلۂ فکر کے کامل ابلاغ کے ضروری ہیں۔ ۴۴

سید عابد علی عابد لکھتے ہیں کہ:

> اسلوب سے مراد کسی لکھنے والے کی وہ انفرادی طرزِ نگارش ہے، جس کی بنا پر وہ دوسرے لکھنے والوں سے متمیز ہو جاتا ہے۔ اس انفرادیت میں بہت سے عناصر شامل ہوتے ہیں ۔ اور اگر آپ اس بات کی مشق کرتے رہیں کہ آیئے بوجھیں یہ شعر یا نثر کا یہ ٹکڑا کس نے لکھا ہے تو آپ بتدریج اتنے مشاق ہو جائیں گے کہ انیس اور دبیر، غالب اور ذوق ،میر حسن اور دیا شنکر نسیم، کے کلام میں امتیاز کر سکیں یا حالی سرسید اور غالب کے نثر پاروں میں انفرادیت دیکھ سکیں ۔ ۴۵

پروفیسر مرے کہتے ہیں کہ شیکسپیئر کے ہاں آہنگ اور ترنم کا ایک خاص اسلوب ہے۔استعارے کی بہتات ہے۔علامت بھی ہے۔ان باتوں میں اس دور کا کوئی ادیب شیکسپیئر کا ہم پلہ نہیں۔

یہ بات کہنا درست نہیں کہ فلاں ادیب میں حیرت انگیز اور عجیب وغریب انفرادیت ہے۔اس بات سے مراد محض اس ادیب کی تعریف وتوصیف ہے۔انفرادیت بے شک ہر ادیب کے لیے بہت مفید ہے۔لیکن اس کے دونوں طرح کے اثرات ہیں۔انفرادیت اچھی بھی ہوسکتی ہے اور بری بھی۔صرف اچھی انفرادیت اچھے اسلوب کو جنم دیتی ہے۔محض کچھ الفاظ کا استعمال اور مغلق تراکیب وضع کرنے کی قوت سے اسلوب کی خوبی پیدا نہیں ہوتی۔

معانی اور بیان کی خصوصیتیں،جن کا لکھنے میں دھیان رکھا جائے۔صرف ونحو کی پابندیاں کی جائیں تو اسلوب کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔لیکن یہ بھی اسلوب کی جامع تعریف نہیں۔اعلیٰ درجے کا فن کار صرف ونحو کی ان پابندیوں اور بیان کردہ خوبیوں کو دانستہ طور پر اپنی تحریر میں لاسکتا ہے۔اسلوب کی مکمل تعریف کے سامنے نہ آنے کے باوصف ایک ادیب اور ایک قاری سمجھ سکتا ہے کہ اسلوب دراصل ہے کیا۔مثال کے طور پر اردو کے شاعر نظیر اکبر آبادی کے ہاں تلفظ،املاء اور صرف ونحو کی پابندیاں نظر نہیں آتیں لیکن اس کے کلام میں روانی ،عوامی لہجہ اور مخصوص الفاظ کا استعمال اس کا اسلوبِ خاص ہے۔اس طرح بہادر شاہ ظفر کا اسلوب دل نشین اور عمدہ ہے۔

اسلوب اور شخصیت:

کسی دانشور کا قول ہے کہ اسلوب ایک طریقہ ہے جس کے وسیلے سے انسان ایک دوسرے کے افکار اور جذبات میں شریک ہوتے ہیں۔بنیادی بات یہ نہیں کہ فن کار کو لکھنے کا طریقہ ہے یا نہیں،بنیادی بات یہ ہے کہ لکھنے والے کی شخصیت قاری کے لیے نفرت انگیز یا کراہت آمیز تو نہیں۔انسانی فطرت کا یہ خاصہ ہے کہ قاری اگر مصنف کو ناپسند کرے تو وہ اسے داد تو کیا دے گا،الٹا اسے انصاف سے بھی محروم رکھے گا۔یہی وجہ ہے کہ بعض فن کاروں اور شاعروں کا کلام ان کی موت کے بعد اپنی اصل شکل میں سامنے آتا ہے۔جب ان کی شخصیت کی برائیاں ذہن سے نکل جاتی ہیں۔اور صرف ان کی تخلیقات کو یاد کیا جاتا ہے۔

ممتاز مفتی اور مستنصر حسین تارڑ کا اسلوب:

اسلوب کی مندرجہ بالا تعریفوں کی روشنی میں ہم اپنے زیرِ موضوع ادیبوں کے اسلوب کا غائرانہ جائزہ لیتے ہیں تو دونوں ادیبوں کے اسلوب میں کچھ خصوصیات مشترک دکھائی دیتی ہیں اور کچھ خصوصیات میں دونوں ادیبوں میں تضاد دکھائی دیتا ہے۔زیرِ نظر موضوع کے تحت ہم ان دونوں ادیبوں کے اسلوبیاتی اشتراکات کا جائزہ لیں گے۔

ممتاز مفتی کی ادبی زندگی کے دو واضح دور ہیں۔ان دونوں ادوار میں ممتاز مفتی کے فکروفن اور رویے میں امتیازات واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ان کے ادبی اسلوب کا پہلا دور1936 سے لے کر 1965 تک چلتا ہے۔اس دور میں ان کا اسلوب فرد کی ذات کے اندرون برپا ہونے والے طوفانوں کے گرد گھومتا ہے۔انھوں نے اردو ادب کی بہت سی اصناف میں فن کے جوہر دکھائے ہیں۔ ان کی نثر میں ایمائیت اور طنزوظرافت کی شوخی، اظہار میں سادگی، بے تکلفی اور بے ساختگی پائی جاتی ہے۔ ندرت اور انوکھا پن ان کے اسلوب کے خوشگوار اور تاثر انگیز پہلو ہیں۔اپنی نوے سالہ بھرپور زندگی وہ مختلف مسائل و حالات سے دوچار رہے۔ان کے گوناگوں تجربات کا عکس ان کی تحریر میں جھلکتا ہے۔ ان کا اسلوب سادہ، بے تکلف اور دلوں میں اتر جانے والا ہے۔

مستنصر حسین تارڑ کا اسلوب اپنی مخصوص اقدار لیے ہوئے ہے۔وہ اجمال کے نہیں بلکہ تفصیل کے قائل ہیں۔ ہر ہر موضوع پر لکھنے کے لیے ان کے پاس سینکڑوں فقرے موجود ہیں۔وہ لکھتے تو ہیں لکھتے ہی چلے جاتے ہیں۔مقامی اخبارات، رسائل اور مقامی لوگوں سے تفصیلات اور پس منظر معلوم کرنا ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ نہایت عرق ریزی سے متن تیار کرتے ہیں۔معلومات کا ذخیرہ ترتیب دیتے ہیں اور قلم کو حکم دے دیتے ہیں۔ ان کا اندازِ بیان ان کی تحریر کو دلکش بناتا ہے۔بعض جگہوں پر اتنے شگفتہ اور چلبلے انداز میں واقعہ بیان کرتے ہیں کہ ہمارا کوئی دوست سن لے ہنستا ہی رہے۔ان کے سفرناموں میں معلومات، اور ماڈرن سیاح کا سورج کی چمکتا ہوا مشاہدہ بھی ہے۔ ماضی بیان کرتے ہوئے تاریخ کے ورق اٹھانا پڑتے ہیں۔اور یہ کام مستنصر بخوبی کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ حال کو بیان کرنے کے لیے مستنصر حسین تارڑ کو مشاہدے کی ضرورت ہے۔یہ مشاہدے ہمیں کافی زیادہ تعداد میں ان کے سفرناموں میں ملتے ہیں۔جو سچے، کھرے اور خالص ہیں۔

اسلوبیاتی اشتراکات:

ممتاز مفتی اور مستنصر حسین تارڑ کے اسلوبیاتی اشتراکات پر ہم نے مختصراًبات کی۔اب ہم ان دونوں مصنفین کے اسلوبیاتی اشتراکات ان کے سفرناموں لبیك اور منه ول كعبے شریف کے تناظر زیرِ بحث لائیں گے۔

ممتاز مفتی کا اسلوب ان کی سادہ بیانی اور دلی کیفیات کو من وعن بیان کر دینے والا ہے۔جبکہ مستنصر حسین تارڑ میں بھی یہ اسلوبیاتی انداز موجود ہے۔اس کی مثالیں ہمیں ان کے سفرناموں میں جابجا مل جاتی ہیں۔مثال کے طور پر ممتاز مفتی اپنے حج کے سفرنامے کے شروع میں ہی لکھتے ہیں:''میرے دل میں حج کرنے کی خواہش کبھی پیدا نہ ہوئی تھی، پھر عجیب حالات رونما ہوئے۔''[۶۲]

یعنی ممتاز مفتی نے ایک عام مسلمان کی دلی کیفیات کو بے ساختگی سے بیان کردیا۔ کہ میرے دل میں کبھی حج کرنے کی خواہش ہی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ حالانکہ اگر تصنع اور بناوٹ سے کام لینے والا کوئی ادیب لکھتا تو

وہ یہ کہتا کہ مجھے ہر وقت دھن لگی رہتی تھی کہ حج کروں یا حج کرنا میری اولین خواہش تھی وغیرہ وغیرہ، لیکن ممتاز مفتی نے انتہائی صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ بات من و عن بیان کردی ۔ یہ ان کا خاص اسلوب ہے۔اسی طرح مستنصر حسین تارڑ بھی ایک صاف گو ادیب ہیں ۔ بات جو دل میں ہو، وہی زبان اور وہی قلم پر ہوتی ہے۔سفر حج کے دوران جب وہ جہاز میں بیٹھے مکہ مکرمہ کی طرف محو پرواز ہوتے ہیں۔تمام مسافر ''تلبیہ'' پڑھنے میں مشغول ہوتے ہیں۔تو مستنصر حسین تارڑ بھی مجبوراً پڑھنا شروع کردیتے ہیں ۔

مجبوراً مجھے بھی ۔۔اللھم لبیک کا ورد کرنا پڑا۔لیکن اس حاضری کی نوا میں میرا دل نہ تھا۔خود بخود رجحان نہ ہوتا تھا۔ بلکہ میں کچھ کچھ بے وقوف محسوس کررہا تھا ۲۷

یعنی مستنصر حسین تارڑ کہتے ہیں کہ ان کے دلی جذبات خود بخود اس ذکر کی طرف مائل نہ ہوتے بلکہ مجبوراًیا قصداًاس طرف ذہن لانا پڑتا تھا۔اسلوب کا یہ انداز ممتاز مفتی سے ملتا ہے۔اگر کوئی اور ادیب ہوتا تو شاید اس طرح کہتا کہ میں ''تلبیہ'' پڑھتے وقت وجد میں ڈوبا ہوا تھا۔وغیرہ لیکن انھوں نے صاف گوئی سے اپنے دلی جذبات بیان کیے۔اسی طرح جب سادگی کے انداز میں دوسروں سے حج کے متعلق استفسار بھی دونوں ادیبوں کے انداز کا ایک جزو ہے۔ممتاز مفتی نے قدرت اللہ شہاب سے سوالات پوچھے جو ان کی سادہ دلی کا ثبوت ہیں ۔وہ ان سوالوں کو مکالمے کے انداز میں بیان کرتے ہیں ۔

''آپ نے حج کیا ہے'' میں نے پہلا کنکر مارا۔

''ہاں کیا ہے''

طیارے سے گئے تھے''

''نہیں''

''پیدل گئے تھے''

''نہیں''

''پھر کیسے گئے تھے''

''بس سے گیا تھا'' ۲۸

اسی طرح مستنصر حسین تارڑ نے اپنی اہلیہ محترمہ سے سوالات کیے ان کو بھی انھوں نے مکالمے کی صورت میں لکھا۔

''تو جدہ سے تم منیٰ پہنچو گے۔وہاں لاکھوں خیمے ہوں گے اور ان میں سے ایک میں تم ہوگے وہاں تم تین دن گزاروگے''

''اور تین دنوں میں کیا کرنا ہوگا''

''عبادت کرنی ہوگی۔نمازیں پڑھنی ہوں گی''

''پانچوں نمازیں پڑھنی ہوں گی''

''کم از کم''

''میرا تو کُب نکل آئے گا اتنی نمازیں پڑھتے پڑھتے۔۔۔بہت ضروری ہے''

''ہاں بہت ضروری ہے'' ۴۹؎

ان دونوں ادیبوں نے زمینی حقائق بیان کرتے ہوئے ایک عام مسلمان کے دل کی کیفیات بیان کیں۔ان میں کسی قسم کی جذباتیت یا روحانیت کا اضافہ نہیں کیا۔ان کا یہ سپاٹ اسلوب ان کا ہی خاصہ ہے۔

کیفیت بیانی:

ممتاز مفتی کا اسلوب کیفیت بیانی بھی ہے۔وہ اپنی دلی کیفیت کو یوں بیان کرتے ہیں۔کہ اس سے ان کے من میں اُٹھنے والی مہین سی بات میں بھی ان کی نوکِ قلم پر آجاتی ہے اور قاری تک پہنچ جاتی ہے۔ وہ اس کیفیت بیانی کے دوران الفاظ کا استعمال بڑی نفاست سے کرتے ہیں۔وہ جان بوجھ کر ایسے الفاظ بیان نہیں کرتے اور نہ ہی انھیں لفظ ڈھونڈنے کی ضرورت پڑتی ہے۔یوں لگتا ہے۔جیسے الفاظ ایک پھوار کی طرح ان کی قلم سے برس پڑے ہوں۔اور اس پھوار میں بے ساختگی ہے بناوٹ نہیں۔حج پر جانے کی منظوری ملتے ہی ان کی جو کیفیت ہوتی ہے۔اسے یوں بیان کرتے ہیں۔

اس وقت میری کیفیت عجیب سی تھی۔جی چاہتا تھا کہ خوشی سے ناچوں، کودوں، جی چاہتا تھا کہ شہر کے ہر مکان کی کُنڈی بجاؤں اور جب کوئی باہر آئے تو کہوں، جی آپ کو نہیں پتہ کیا؟ میں حج پر جا رہا ہوں۔۵۰؎

یعنی کیسے اچھے انداز میں کیفیت کو بیان کر رہے ہیں۔یوں لگتا ہے جیسے اپنے کسی بے تکلف دوست کو یہ سب باتیں بتا رہے ہوں۔

مستنصر حسین تارڑ بھی کیفیت بیانی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ایسے بے ساختہ انداز میں دلی کیفیات کو بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔جیسے کسی راز دار کو اپنا سب حالِ دل بتاتے چلے جا رہے ہوں۔ان کی اس خوبی سے ان کے قارئین بھی بے حد محظوظ ہوتے ہیں۔جب وہ اپنے دل کی بات کرتے ہیں تو دراصل وہ قارئین کے دل کی بات کرتے ہیں۔ہوائی جہاز میں سفر کرتے ہوئے جب پائلٹ نے اعلان کیا کہ جہاز سے نیچے دیکھئے آپ کو مکہ شہر کی روشنیاں نظر آنے والی ہیں۔اس نے اعلان کیا۔

''خواتین وحضرات میں آپ کی توجہ چاہتا ہوں'' پائلٹ کی آواز پھر گونج کر کانوں میں اتری۔اور میرا جی چاہا کہ میں برادر جہاز نگہبان سے کہوں کہ بھائی جان۔آخر آپ کو کتنی اور توجہ درکار ہے۔ہم تو مشاق ہیں آپ کہیے تو سہی اور کیا کہتے ہیں۔ہماری دستک دیتی پلکوں کا کچھ خیال کریں۔۔کہیے!اور انھوں نے کہا۔

''جہاز کے بائیں جانب نیچے نظر کیجئے۔مکہ کا شہر نظر آرہا ہے''

کہاں نظر آرہا ہے۔۔کدھر۔۔۔

کچھ بھی نظر نہیں آرہا

نیچے ایک گھٹا ٹوپ تاریکی ہے۔اس کے سوا کچھ اور نہیں۔۔کچھ بھی نظر نہیں آرہا۔میں کھڑکی کے شیشے پر آنکھیں جھپکتا اپنے تئیں نظر کو نیچے اتارنے لگا کہ اے بینائی اگر تو بینائی ہے۔تو یہ وہ لمحہ ہے جب تو یہ ثابت کرسکتی ہے کہ تو سچ مچ بینائی ہے۔اور پھر اس نا بینائی میں کچھ بینا ہوا۔دیدۂ بینا ہوا۔۵۱

روحانی کیفیت:

روحانی کیفیت بیان کرتے وقت یہ دونوں ادیب صرف ایک سادہ لوح مسلمان کی کیفیات ہی بیان نہیں کرتے بلکہ ان کے اندر ایک پکے مسلمان والی متصوفانہ کیفیات بھی جاگزیں ہوتی ہیں۔ممتاز مفتی ان کیفیات کا اظہار بھی روحانی انداز میں کرتے ہیں۔پڑھنے والے کی روح میں سرشاری پیدا ہو جاتی ہے۔

پہلی بار میں نے محسوس کیا میں اکیلا ہوں،اتنی بھیڑ میں اکیلا ہوں۔اس سرزمین پر اکیلا ہوں،اجنبی ہوں۔جس کا نام لیتے وقت میں گزشتہ پچاس برس سے اپنی انگلیاں چوم کر آنکھوں پر لگاتا رہا ہوں اس گھر کی دہلیز پر اکیلا ہوں اس کے نام سے زندگی بھر میرے جسم کے رونگٹے کھڑے ہوتے رہے ہیں۔۵۲

یہ ایک مختلف حالت ہے جو انھوں نے روحانیت میں ڈوب کر بیان کی ہیں۔اسی طرح ایک اور جگہ لکھتے ہیں۔

میں نے شدت سے کوشش کی کہ جذبہ احترام سے میرا بند بند بھیگ جائے لیکن بے سود۔میں نے سوچا حضورﷺ ان گلی کوچوں میں گھوما کرتے تھے۔ان ٹیلوں پر ان کے قدموں کے نشانات۔ابھی ابھی موجود ہوں گے۔اس فضا میں ان کی آواز کی لہریں ابھی تک رواں دواں ہوں گی۔۵۳

ایسی ہی وارفتگانہ اور والہانہ،عشق و مستی میں ڈوبی ہوئی کیفیات مستنصر حسین تارڑ کے ہاں بھی پائی

جاتی ہیں۔خانہ کعبہ کو دیکھنے کی کیفیت یوں لکھتے ہیں:

> ذروں کا یہ بہاؤ بہتے بہتے طواف کرتے کرتے یوں لگتا تھا جیسے اس سیاہ عمارت میں جذب ہورہا ہے۔ابھی جذب ہوتا ہے اور ابھی اس میں سے پھوٹ کر بہنے لگتا ہے۔یہ رب کا گھر تھا لیکن اس کے گرد بہتے ذرے اس گھر سے کہیں اہم ہورہے تھے۔۵۴

اسی طرح خانہ کعبہ کی دیوار کو بوسہ دیتے وقت انھوں نے قلبی کیفیت کو عین اسی طرح بیان کیا جیسا کہ انھوں نے محسوس کیا، لکھتے ہیں:

> اس گیلی دیوار پر میں ہونٹ رکھتا تھا۔اسے بوسہ دیتا تھا۔دیر تک اپنے لب رکھتا تھا۔پھر ماتھا ٹیک کر مانگنے میں محو ہو جاتا تھا۔تو پھر بے تابی ہوتی تھی کہ ایک اور بار وہیں لب رکھ دوں۔محبوب کے چہرے کو چومتے ہوئے کون سیر ہوتا ہے۔کسی کی تسلی ہوئی ہے کہ بس کافی ہے۔لب ہٹاتے ہی ایک اور بوسے کی طلب ہوتی ہے۔۵۵

منظر نگاری:

منظر نگاری تحریر کا وہ اسلوب ہے جس کے بغیر کوئی ادیب بھی ایک کامیاب ادیب نہیں بنتا۔کمال یہ ہے کہ لکھنے والا ایسے انداز میں کسی منظر کو لکھے کہ پڑھنے والا ایسا محسوس کرے جیسے وہ منظر اس کی آنکھوں کے سامنے ایک فلم کی طرح چل پڑا ہے۔ممتاز مفتی اور مستنصر حسین تارڑ دونوں ہی تحریر کے اس اسلوب میں صف اول کے ادیب مانے گئے ہیں۔ان دونوں حضرات کی منظر نگاری کی دو دو مثالیں دونوں کے سفرناموں سے دینے سے بات کچھ واضح ہو جائے گی۔عام تحریر میں تو منظر نگاری اہم ہے ہی۔سفرنامے میں اس اسلوب کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔لبیک میں ممتاز مفتی لکھتے ہیں:

> سفارت کا وہ کارکن مجھے ایک کوٹھی میں لے گیا جس کا وسیع وعریض صحن خوبصورت ٹائلوں سے بنا ہوا تھا۔کوٹھی سے باہر صحن کے ایک جانب ایک چھوٹا سا کمرا تھا۔۵۶

اسی طرح زائرین کے خیموں کا منظر کچھ یوں بیان کرتے ہیں۔

> میرے سامنے خیمے ہی خیمے تھے۔ہر خیمے کے دو حصے تھے۔ایک وسیع وعریض حصہ جس میں زائرین نے زمین پر بستر بچھا رکھے تھے۔اور وہ ان پر بیٹھے ہوئے آپس میں باتیں کرنے میں مصروف تھے۔شامیانے کا سامنے کا پردہ اٹھا ہوا تھا۔جس کی وجہ سے وہ باہر سڑک سے دکھائی دے رہے تھے۔بڑے حصے سے ملحقہ ایک چھوٹا سا خیمہ تھا۔جس کے گرد قناتیں لگی ہوئی تھیں اور اندر چولہے بنے ہوئے تھے۔چولہوں پر بڑے بڑے دیگچے رکھے ہوئے تھے۔نیچے آگ

جل رہی تھی۔ ۵۷ے

اقتباس میں ممتاز مفتی کی منظر نگاری درجہ کمال کو پہنچی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ایک ایک چیز کا انھوں نے ایسا نقشہ کھینچا کہ ہمیں نظر آنے لگتا ہے۔منظر نگاری میں مستنصر حسین تارڑ بھی اعلیٰ درجے کے منظر نگار ہیں۔حرم پاک میں بابِ عبدالعزیز کے سامنے پہنچے تو منظر کو یوں رقم کرتے ہیں۔

> انگریزی میں کنگ عبدالعزیز کے دروازے کے سامنے ایک وسیع احاطہ تیز روشنیوں کی زد میں آیا ہوا اور وہاں احرام پوش مختلف حالتوں میں کچھ چلتے پھرتے تھے۔کچھ اونگھتے تھے۔کچھ جھمکٹوں میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔زیرِ زمین پھیلے غسل خانوں میں سے خودکار زینوں پر کھڑے کچھ نہا دھو کر، کچھ فارغ ہو کر، بیشتر وضو کر کے احاطے کی روشنیوں میں ابھر کر زینوں سے پہلے جھجکتا ہوا قدم اٹھا کر فرش پر رکھ کر ہجوم کا ایک حصہ بن جاتے تھے۔ ۵۸ے

عام طور پر حج کے سفر ناموں میں عقیدت نگاری زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔لیکن ان اصحاب کی منظر نگاری پر بھی بہت گرفت ہے۔ایک اور جگہ پر مستنصر حسین تارڑ نے زم زم کے کنویں کی لوکیشن بتاتے ہوئے کمال منظر نگاری کی ہے۔

> صحن حرم میں سنگِ مرمر کی سیڑھیاں نیچے اتر رہی تھیں۔نیچے ایک ایسے تہہ خانے تک جاتی تھیں جس کی چھت پر تو طواف ہو رہا تھا اور نیچے قطار اندر قطار بے شمار نل کھلے تھے۔اور ان میں پانی ٹھہرتا نہیں تھا۔رواں رہتا تھا۔وضو کیجئے۔پیاس بجھایئے اور اس پانی سے اپنے چہرے پر چھینٹے مار کر تر و تازہ ہو جایئے۔ ۵۹ے

درج بالا اسالیب ایسے ہیں جن میں دونوں ادیبوں کے درمیان بہت سے اشتراکات پائے جاتے ہیں۔اس حوالے سے پرکھا جائے تو ممتاز مفتی اور مستنصر حسین تارڑ اردو ادب کے اعلیٰ ادیبوں میں شمار ہوتے ہیں۔ان دونوں ادیبوں میں اسلوبیاتی اشتراکات ان کی دوسری تحریروں میں بھی پائے جاتے ہیں۔لیکن اس باب میں ہم صرف ان کے سفر ناموں لبیک اور منہ ول کعبے شریف کے تناظر میں بحث کر رہے ہیں۔ان دونوں ادیبوں کے ناولوں میں بھی ان کی تحریر کا جائزہ لیا جائے تو گوناگوں اشتراکات سامنے آتے ہیں۔

ذاتی رائے اور شخصیت:

کسی واقعہ یا جگہ کے بارے میں بیان کر دینا سفر نامے کا ایک اہم حصہ ہے۔لیکن اس کے ساتھ ساتھ ادیب اپنی ذاتی رائے کا اظہار بھی قارئین کی سپرد کرتا ہے۔اور یہی ذاتی رائے قاری کے ذہن میں ادیب کی شخصیت اور اس کے نظریات کو واضح کرتی ہے۔ادیب کی شہرت اور مقبولیت بھی اسی ذاتی رائے سے ہی تشکیل

پاتی ہے۔اس کی شخصیت اتنی ہی اہم ہو جاتی ہے جتنی اس کی تحریر۔اسلوب کا ایک اہم عنصر یہ بھی ہے کہ فن کار کی شخصیت اس کی تحریر میں جھلکی پڑ رہی ہو۔لیکن شرط یہ ہے کہ فن کار کو یہ بات معلوم ہو کہ اسے جو کچھ کہنا ہے۔وہ اس ترغیب اور تشویق کے انداز میں کہنا ہے کہ بات قاری کے درِگوش پر دستک دے اور فوراً دل میں اتر جائے ۔شخصیت کی یہی صفت کہ وہ اپنے بیانات تسلیم کرنے کے متعلق رغبت کی حس پیدا کرتی ہے۔سب سے اہم ہے۔سید عابد علی عابد لکھتے ہیں:

> اس میں کوئی شک نہیں کہ نگارش کا اختصار، منطقی پیرایہ، بیان، ترغیب دینے کا فن یہ سبھی باتیں اپنی جگہ پر اہم ہیں، لیکن اہم ترین عنصر یہ ہے کہ فنکار کی اپنی شخصیت کے متعلق قاری کا کیا خیال ہے۔دیکھ لیجئے جب ہم کسی سے مشورہ لیتے ہیں تو مشورے کی خوبی اور صحت سے قطع نظر مشیر کی شخصیت ہمیں کتنی متاثر کرتی ہے۔۶۰

کسی کے قول کے مطابق اسلوب ایک ایسا طریقہ ہے جس کے وسیلے سے انسان ایک دوسرے کے افکار اور جذبات میں شریک ہوتے ہیں۔بنیادی بات یہ نہیں ہوتی کہ ادیب کو لکھنے کا سلیقہ ہے کہ نہیں ،اصل بات یہ ہے کہ لکھنے والے کی شخصیت قاری کے لیے نفرت انگیز یا کراہت آمیز تو نہیں ۔صرف ونحو، معنی ، بیان ، علوم پر گرفت ہونے سے کچھ نہیں ہوگا اگر قاری ادیب کی شخصیت کو پسند کرتے ہیں تو اس کی تحاریر کو بھی قبولیت کا درجہ بخشیں گے۔اور اگر اسے ناپسند کرتے ہیں تو اس کی تحریریں بھی قارئین کے دل میں جگہ بنا نہیں پائیں گی۔یہی وجہ ہے کہ بہت سے ادبا اور شعرا کا کلام ان کی وفات کے بعد اپنی اصل صورت میں جلوہ گر ہوتا ہیں ۔جب ان کی شخصیت اور ذاتی خامیاں ذہنوں سے محو ہو جاتی ہیں۔پروفیسر لوکس کا کہنا ہے کہ مصنف اپنی کتابیں تو بیچتے ہیں لیکن اپنی شخصیت کے اسرار بغیر کسی قیمت کے بے نقاب کر دیتے ہیں۔

ممتاز مفتی اور تارڑ جی کی ذاتی رائے اور شخصیت بھی ان کے سفرناموں میں ساتھ ساتھ چلتی ہے۔خدا تعالیٰ کے بارے میں تقدس بھرے جذبات اور قلبی کیفیات کا اظہار تو ہر کوئی کرتا ہے۔خاص طور پر حج کے سفرنامے میں تو خالقِ کائنات کا ذکر نہایت عقیدت واحترام سے کرنا چاہیے۔لیکن ممتاز مفتی کی ذاتی رائے دیکھیے کہ وہ اس ذاتِ باری تعالیٰ کے متعلق کیا ذاتی رکھتے ہیں۔

> ایک عمر گزرنے کے بعد میں نے جانا کہ اللہ تعالیٰ تو ایک گڈریا ہیں ۔جنہیں اپنی بھیڑوں سے اتنی محبت ہے کہ ہر وقت انہی کے خیال میں محو رہتے ہیں۔۶۱

اسی طرح جب وہ کیمرہ سے حرم پاک کی تصاویر لینے والے اپنے کسی دوست جہانگیر کا ذکر کرتے ہیں تو انھیں اپنی ذاتی رائے میں وہ دوست اچھا نہیں لگتا۔چشمِ تصور سے وہ دیکھتے ہیں کہ جب وہ کیمرہ سے تصویریں کھینچ رہا تھا تو کمپوزیشن پر،ویو فائنڈر پر، اور کیمرے کے لینز پر اپنی ساری توجہ مرکوز کیے ہوئے تھا اور حرمین حیرت سے پتھر کی

دیواریں بنے کھڑے ہیں اور کعبہ کا مالک منہ میں انگلی ڈالے جہانگیر کا منہ تک رہا ہے۔ممتاز مفتی جہانگیر کے توسط سے سب دوستوں کو مشورہ دیتے ہیں کہ: ''بہر طور میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ اگر آپ حج یا عمرہ کے لیے حاضری دیں تو اللہ کے واسطے اپنے ساتھ کیمرہ نہ لے جایئے گا۔'' ۶۲

مستنصر حسین تارڑ اس قدر وسیع مطالعہ اور بھرپور شخصیت کے مالک ہیں کہ ان کے سفرناموں میں ان کی ذاتی رائے اور شخصیت متوازی چلتی ہے۔منہ ول کعبے شریف ایک ایسا موضوع ہے جس میں عمومی تاثر کے ساتھ ساتھ مصنف کی ذاتی نظریات کا اظہار بہت ضروری ہے۔وہ خانہ کعبہ کے پاس عقیدت مندوں کا ہجوم دیکھتے ہیں تو محسوس کرتے ہیں کہ دوسرے ملکوں کے لوگ جیسے سوڈانی، نائجیرین، ملائشیا والے ایک ترتیب سے بیٹھتے ہیں۔اور صرف پاکستانی ایسے لوگ ہیں جو بے ترتیبی سے بکھرے ہوتے ہیں۔مستنصر حسین تارڑ نے پاکستانیوں کو ''گمشدہ بھیڑیں'' کہا ہے۔جن کا کوئی والی وارث نہیں ہوتا۔لکھتے ہیں:

> اگرچہ یہ اپنے تئیں اسلام کے وارث ہیں۔اپنے آپ کو اسلام کا قلعہ ثابت کرنے کی ناکام کوشش کرتے رہتے ہیں۔لیکن ان کا کوئی والی وارث نہیں۔یہ ملنگ بابے ہیں جن کا اتحاد اور تنظیم سے کوئی واسطہ نہیں۔۶۳

اسی طرح بارہا مقامات پر مستنصر حسین تارڑ نے قارئین کو اپنے ذاتی خیالات اور اپنی ذاتی رائے سے روشناس کروایا ہے۔ان کی شخصیت جابجا جھلکتی ہے۔قربانی کے بعد جب بال اتروانے کے لیے جاتے ہیں تو وہاں کے منظر کو انھوں نے عجیب انداز میں پیش کیا ہے۔ٹنڈ کروانے میں تامل کا اظہار کیا۔اسے دنیاداری کو ترک کر دینے کے مترادف کہا۔اپنے ٹی وی شو میں ٹنڈ کے ساتھ جلوہ گر ہونے کو معیوب سمجھا۔ٹنڈ پر ہاتھ پھیر کر اپنے اپنے سروں کو کھجلاتے لوگوں کی ٹنڈوں کو کدو، بینگن، خربوزے اور تربوز کے نام دیے۔کسی کی ٹنڈ کو فٹ بال کہا تو کسی کی ٹنڈ کو مجسمہ سازی کا نمونہ۔حج کے فلسفہ پر مستنصر حسین تارڑ نے جو اپنی رائے پیش کی وہ کچھ اس طرح سے ہے کہ حج دراصل ایک سیاہ نام کنیز جس کا نام ہاجرہ ہے۔اس کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کا نام ہے۔وہ لکھتے ہیں: ''اگر اس کی جڑوں تک جایا جائے۔اس کی تہوں میں اترا جائے تو حج ہاجرہ ہے۔'' ۶۴

انھوں نے کہا کہ ''حطیم'' وہ جگہ ہے جہاں ہاجرہ کا گھر تھا۔خانہ کعبہ کے اندر موجود تین ستون ہیں وہاں تیسرے ستون کے نیچے ہاجرہ کی قبر ہے۔ہاجرہ اللہ کی ہمسائی ہے۔وہ کہتے ہیں۔طواف کرنا ہاجرہ ہی کی یاد تازہ کرتا ہے۔ہاجرہ نہ ہوتیں تو خانہ کعبہ کس کا خاوند اور بیٹا تعمیر کرتے۔نہ مکہ ہوتا نہ آبِ زم زم کا چشمہ پھوٹتا۔یہاں تک کہ ہجرت کا لفظ بھی ہاجرہ کے نام کی ایک شکل ہے۔سلگتی دھوپ میں ہاجرہ کا اپنے بیٹے کے لیے دوڑنا صفا مروا کی سعی کی شکل میں دہرایا جاتا ہے۔حضرت ابراہیم نے جب ہاجرہ اور حضرت اسمٰعیل کو ایک صحرا میں بے یار و مددگار چھوڑ جانے کا فیصلہ کیا تو ہاجرہ نے سرِتسلیم خم کیا۔کوئی واویلا نہ کیا۔انھوں نے اپنے رب پر

بے انتہا یقین کیا۔اور خدا کے بھروسے وہاں قیام کیا۔مستنصر حسین تارڑ کہتے ہیں کہ عورت کی اتنی تکریم ہوتے ہوئے آج بھی اسے کمزور اور حقیر جان کر جانوروں کی مانند ہانکا جاتا ہے۔

تمثال نگاری:

اسلوب کی ایک اہم صفت تمثال نگاری ہے۔لکھاری کسی چیز،منظر یا رویے کی بات کرتا ہے۔تو اسے کسی ایسے منظر سے نسبت دینے کی کوشش کرتا ہے۔جو اس کے ذہن میں پہلے سے موجود ہو۔اور اگر وہ منظر قارئین نے بھی دیکھا ہو تو بات دو چند ہو جاتی ہے۔اور قارئین کے ذہن میں تصویر بڑی وضاحت کے ساتھ ابھر آتی ہے۔احمد ندیم قاسمی،غلام عباس،منشی پریم چند اور امتیاز علی تاج جیسے عظیم ادیبوں میں یہ خوبی پائی جاتی ہے۔ممتاز مفتی نے اپنے سفرنامہ ''لبیک'' میں اس صفت کا بارہا استعمال کیا ہے۔کئی مرتبہ انھوں نے حج کے دوران پیش آنے والے واقعات کو اپنے وطن کے کسی واقعہ سے تشبیہہ دی ہے۔کئی سچوئیشنز کو انھوں نے لاہور کے کسی پرانے واقعہ سے ملا دیا ہے۔کبھی وہ کوئلہ سنٹر والے بابا کی مثال دیتے ہیں۔جہاں عمدہ چائے مفت ملتی ہے۔اوران بابا کے سامنے لوگ دھندلی روشنی میں نیم بروں دورویہ قطاروں میں لوگ بیٹھے ہیں۔عجز کی کیفیت سے سرشار ہیں۔کبھی تاریخ کا کوئی ورق پلٹتے ہیں اور ارسطو کے واقعہ سے قارئین کی آشنائی کرواتے ہیں۔

کبھی ڈاکٹر عصمت سے لندن میں لوگوں کے سوالات کے بارے میں بتاتے ہیں۔کبھی وہ کراچی کے ایک سفید ریش بوڑھے کے بارے میں لکھتے ہیں۔جب حکومتِ پاکستان نے 1959 میں حج پر پابندی لگادی تو وہ بزرگ پریذیڈنٹ ہاؤس کے سامنے دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔صدر ایوب باہر نکل آئے اور اس بڈھے کی آہ وبکا سن کر حیران رہ گئے۔کبھی وہ ایڈووکیٹ صاحب کے صدر ایوب کو سَو سے زائد خط لکھنے کے واقعہ سے مثال دے کر اپنے جذبۂ ایمانی کو جلا بخشتے ہیں۔

اسی طرح لاہور میں نور بابا کے ڈیرے کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہاں جو آتا اسے گوشت روٹی پیش کی جاتی تھی۔جو قصائی اس ڈیرے پر گوشت فراہم کرتا وہ بہت بیمار ہو گیا۔اس قصائی کی ماں اور بیوی بابا جی کے پاس آئیں اور کہا کہ قصائی کا منہ دیکھ لیجئے۔وہ آخری دموں پر ہے۔جب بابا جی اس قصائی کے گھر پہنچے تو اس کی حالت غیر تھی۔بابا جی نے دعا مانگی کہ اے خدا یہ قصائی ہمیں اچھا گوشت دیتا ہے اور تیرے بندے اسے کھاتے ہیں۔تو اسے زندگی دے دے،شام تک وہ قصائی بھلا چنگا ہو گیا۔

اسی طرح ممتاز مفتی نے شیخ سعدی کا ایک واقعہ قلمبند کیا۔جس میں انھوں نے اپنے گدھے کے ساتھ کسی گاؤں میں کسی کے گھر ٹھہرنے کی اجازت مانگی تو اس گھر کی عورت زچگی کے مرحلے میں سے گزر رہی تھی۔گھر کے مالک نے شیخ سعدی سے دعا کے لیے کہا۔انھوں نے تعویذ دیا اور کہا کہ اسے مریضہ کی ناف پر رکھ دیں۔تعویذ رکھتے ہی بچہ ہو گیا۔گاؤں والوں نے اس تعویذ کو سنبھال کر رکھا۔جب کبھی زچگی ہوتی وہ تعویذ استعمال کرتے۔ایک دن سولوی

صاحب وہ تعویذ مانگ کر لے گئے۔اور اسے کھول کر دیکھا۔اس پر لکھا تھا:''یااللہ !میں اور میرا گدھا اب آرام سے ہیں ٹھکانا مل گیا ہے۔باقی تو جانے اور تیرا کام جانے۔''۶۵

مستنصر حسین تارڑ نے بھی تمثال نگاری کے اس اسلوب کو بخوبی نبھایا ہے۔یہ اسلوب ایک صاحبِ مطالعہ ادیب کی نشانی ہے۔مستنصر حسین تارڑ ایک عمیق مطالعہ، گہری نظر اور تحریر پر گرفت رکھنے والے ادیب ہیں۔کوئی نئی چیز دیکھتے ہی ان کے ذہن میں ماضی کا کوئی واقعہ یا تاریخ کا کوئی ورق انگڑائیاں لینے لگتا ہے۔وہ اس واقعہ کو اپنے قلم کی زد میں لاتے ہیں۔قرطاس پر بکھیرتے ہیں اور قارئین کے حظ اٹھانے کا اہتمام کرتے ہیں۔

حج پر جانے اور وہاں کے خیمے، رہائشی کمروں ،لوگوں ، ہوٹلوں اور جغرافیائی انتظام وانصرام کے بارے میں جب وہ اپنی اہلیہ میمونہ بیگم سے پوچھ رہے ہوتے ہیں تو انھیں ایک ایسی عورت کی بات یاد آتی ہے جو ان کی اہلیہ کو حج کے دوران ملی تھیں۔وہ گھبرائی ہوئیں تھیں۔کہتی تھیں کہ بہن مجھے تو کچھ پتہ نہیں چل رہا کہ کیا کرنا ہے اور کدھر جانا ہے۔بس جدھر سب لوگ چلتے جاتے ہیں میں بھی چل پڑتی ہوں۔اسی طرح جب خانہ کعبہ کے دروازے پر نظر پڑتی ہے تو انھیں اپنے بیٹے سلجوق کا وہ واقعہ یاد آجاتا ہے۔جب وہ اس دروازے کے اندر یعنی خانہ کعبہ کے اندر گیا تھا۔اس نے اندر کا سارا منظر اپنے ابا جی یعنی مستنصر حسین تارڑ کو بتایا تھا۔خانہ کعبہ کے منظر کو اپنی آنکھوں میں بساتے ہوئے انھیں ناول نگار قرۃ العین طاہرہ یاد آجاتی ہیں۔جو عشق میں کوچہ بہ کوچہ پھرنے والی خاتون کا نقشہ کھینچتی ہیں۔خانہ کعبہ کے اوپر آسمان کی طرف نگاہ دوڑاتے ہیں تو انھیں چودہ سو سال قبل ابرہہ کے ہاتھیوں کا خانہ کعبہ کو مسمار کرنے کی نیت سے ہاتھیوں کی فوج لے کر آنے والا واقعہ یاد آجاتا ہے۔جب آسمان پر ابابیلوں کا ایک لشکر اپنی چونچوں میں کنکریاں لیے آیا اور ان ہاتھیوں کی فوج کو بھس بنا کر رکھ دیا۔

ابرہہ کے فوجی حضرت عبدالمطلب کے سو اونٹ پکڑ کر لے گئے۔بعد میں حضرت عبدالمطلب اس کے پاس گئے اور اپنے سو اونٹوں کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ابرہہ نے کہا کہ میں خانہ کعبہ کو مسمار کرنے آیا تھا۔اس بارے میں آپ نے مجھ سے کوئی درخواست نہیں کی تو عبدالمطلب نے جواب دیا۔''اے بادشاہ!میں نے اپنے مال کے بارے میں درخواست کی ہے۔میں تو ان اونٹوں کا مالک ہوں۔بیت اللہ کا مالک اللہ ہے۔وہ خود اس کی حفاظت فرمائے گا۔''۶۶

حاصلِ کلام:

ممتاز مفتی اور مستنصر حسین تارڑ کے سفرناموں لبیک اور منہ ول کعبے شریف کا غائرانہ مطالعہ کرنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ دونوں ادیبوں کے اسلوب میں ان گنت اشتراکات پائے جاتے ہیں۔جذبات نگاری، منظر نگاری، تلمیحات، تشبیہات و استعارات، تمثال نگاری، حقیقت نگاری، جزئیات نگاری،

الفاظ ومحاورات کا استعمال اور مذہبی عقائد جیسے بہت سے عناصر اسلوب ہیں جوان ادیبوں میں مشترک ہیں۔ان کے فکری وفنی اشتراکات پر سیر حاصل بحث کے بعد اس باب میں ہم نے ان کے اسلوبیاتی اشتراکات پر بحث کی۔نتیجتاً یہ کہنا بالکل درست ہے کہ دونوں ادیب نہ صرف اسلوبیات کے بہت سے عناصر پر قدرت رکھتے ہیں۔ بلکہ بعض عناصر میں اپنی انفرادیت بھی رکھتے ہیں ۔ان کا اپنا مخصوص سٹائل ہے۔جو انھیں اپنے ہم عصر ادیبوں سے ممتاز کرتا ہے۔اپنی انفرادیت رکھنے کے باوجود ان دونوں کے مابین بہت سی قدریں مشترک ہیں ۔ جن میں سے چند کے بارے میں ہم نے اپنی اس تحقیق میں بحث کی۔سب اقدارِ مشترک پر فرداً فرداً بحث کرنا بے حد طوالت کا باعث بنتا ہے۔لیکن چند اشتراکات کے سامنے آنے سے اور ان کی تفصیل بیان کرنے سے ہمیں کافی حد تک اس امر کا احساس ہو جاتا ہے۔کہ مذکورہ دونوں ادیب اپنے عہد کے عظیم ادیب ہیں ۔جن کے درمیان اسلوب کی کئی اقدار مشترک ہیں ۔

حوالہ جات

۱۔ سید عابد علی عابد، اسلوب، سنگِ میل پبلیکیشنز، ۲۰۱۱، ص ۴۱

۲۔ ابنِ انشاء، ممتاز مفتی حج کو چلے مشمولہ ممتاز مفتی، ص ۱۲۷، ۱۳۷

۳۔ نجیبہ عارف، ڈاکٹر، ممتاز مفتی، شخصیت اور فن، اکادمی ادبیات پاکستان، ص ۱۰۸

۴۔ باربرا میٹکاف، ممتاز مفتی، ایک اسلامی طنز نگار، مترجمہ مسعود قریشی، مشمولہ مہا اوکھا، ص ۴

۵۔ فاروق اقدس، کالم، اخبارِ جہاں

۶۔ مستنصر حسین تارڑ، منہ ول کعبے شریف، سنگِ میل پبلیکیشنز، ۲۰۱۷، ص ۳۶

۷۔ ممتاز مفتی، لبیک، رُمیل ہاؤس آف پبلیکیشنز، ۲۰۱۴، ص ۱۱

۸۔ مستنصر حسین تارڑ، منہ ول کعبے شریف، سنگِ میل پبلیکیشنز، ۲۰۱۷، ص ۴۲

۹۔ ممتاز مفتی، لبیک، رُمیل ہاؤس آف پبلیکیشنز، ۲۰۱۴، ص ۲۱

۱۰۔ مستنصر حسین تارڑ، منہ ول کعبے شریف، سنگِ میل پبلیکیشنز، ۲۰۱۷، ص ۳۶

۱۱۔ ممتاز مفتی، لبیک، رُمیل ہاؤس آف پبلیکیشنز، ۲۰۱۴، ص ۲۲

۱۲۔ مستنصر حسین تارڑ، منہ ول کعبے شریف، سنگِ میل پبلیکیشنز، ۲۰۱۷، ص ۴۸

۱۳۔ ممتاز مفتی، لبیک، رُمیل ہاؤس آف پبلیکیشنز، ۲۰۱۴، ص ۳۵

۱۴۔ مستنصر حسین تارڑ، منہ ول کعبے شریف، سنگِ میل پبلیکیشنز، ۲۰۱۷، ص ۱۲

۱۵۔ ممتاز مفتی، لبیک، رُمیل ہاؤس آف پبلیکیشنز، ۲۰۱۴، ص ۳۷

۱۶۔ مستنصر حسین تارڑ، منہ ول کعبے شریف، سنگِ میل پبلیکیشنز، ۲۰۱۷، ص ۱۳

۱۷۔ ممتاز مفتی، لبیک، رُمیل ہاؤس آف پبلیکیشنز، ۲۰۱۴، ص ۴۳

۱۸۔ مستنصر حسین تارڑ، منہ ول کعبے شریف، سنگِ میل پبلیکیشنز، ۲۰۱۷، ص ۲۱

۱۹۔ ممتاز مفتی، لبیک، رُمیل ہاؤس آف پبلیکیشنز، ۲۰۱۴، ص ۶۳، ۶۴

۲۰۔ مستنصر حسین تارڑ، منہ ول کعبے شریف، سنگِ میل پبلیکیشنز، ۲۰۱۷، ص ۵۷

۲۱۔ ممتاز مفتی، لبیک، رُمیل ہاؤس آف پبلیکیشنز، ۲۰۱۴، ص ۷۸

۲۲۔ مستنصر حسین تارڑ، منہ ول کعبے شریف، سنگِ میل پبلیکیشنز، ۲۰۱۷، ص ۶۴

۲۳۔ ممتاز مفتی، لبیک، رُمیل ہاؤس آف پبلیکیشنز، ۲۰۱۴، ص ۶۴

۲۴۔ مستنصر حسین تارڑ، منہ ول کعبے شریف، سنگِ میل پبلیکیشنز، ۲۰۱۷، ص ۷۰

۲۵۔ ممتاز مفتی، لبیک، رُمیل ہاؤس آف پبلیکیشنز، ۲۰۱۴، ص ۸۵

۲۶۔ مستنصر حسین تارڑ، منہ ول کعبے شریف، سنگِ میل پبلیکیشنز، ۲۰۱۷، ص ۸۵

۲۷۔ ممتاز مفتی، لبیک، رُمیل ہاؤس آف پبلیکیشنز، ۲۰۱۴، ص ۹۰

۲۸۔ مستنصر حسین تارڑ، منہ ول کعبے شریف، سنگِ میل پبلیکیشنز، ۲۰۱۷، ص ۸۶

۲۹۔ ممتاز مفتی، لبیک، رُمیل ہاؤس آف پبلیکیشنز، ۲۰۱۴، ص ۸۳

۳۰۔ مستنصر حسین تارڑ، منہ ول کعبے شریف، سنگِ میل پبلیکیشنز، ۲۰۱۷، ص ۸۶

۳۱۔ ممتاز مفتی، لبیک، رُمیل ہاؤس آف پبلیکیشنز، ۲۰۱۴، ص ۱۲۵

۳۲۔ مستنصر حسین تارڑ، منہ ول کعبے شریف، سنگِ میل پبلیکیشنز، ۲۰۱۷، ص ۱۱۸

۳۳۔ ممتاز مفتی، لبیک، رُمیل ہاؤس آف پبلیکیشنز، ۲۰۱۴، ص ۱۳۱

۳۴۔ مستنصر حسین تارڑ، منہ ول کعبے شریف، سنگِ میل پبلیکیشنز، ۲۰۱۷، ص ۱۴۱

۳۵۔ ممتاز مفتی، لبیک، رُمیل ہاؤس آف پبلیکیشنز، ۲۰۱۴، ص ۱۵۳، ۱۵۴

۳۶۔ مستنصر حسین تارڑ، منہ ول کعبے شریف، سنگِ میل پبلیکیشنز، ۲۰۱۷، ص ۲۰۳، ۲۰۴

۳۷۔ ممتاز مفتی، لبیک، رُمیل ہاؤس آف پبلیکیشنز، ۲۰۱۴، ص ۱۸۳

۳۸۔ مستنصر حسین تارڑ، منہ ول کعبے شریف، سنگِ میل پبلیکیشنز، ۲۰۱۷، ص ۳۱۰، ۳۱۱

۳۹۔ ممتاز مفتی، لبیک، رُمیل ہاؤس آف پبلیکیشنز، ۲۰۱۴، ص ۲۴۸

۴۰۔ ایضاً، ص ۲۶۲

۴۱۔ مستنصر حسین تارڑ، منہ ول کعبے شریف، سنگِ میل پبلیکیشنز، ۲۰۱۷، ص ۴۵۳

۴۲۔ ممتاز مفتی، لبیک، رُمیل ہاؤس آف پبلیکیشنز، ۲۰۱۴، ص ۲۷۶

۴۳۔ مستنصر حسین تارڑ، منہ ول کعبے شریف، سنگِ میل پبلیکیشنز، ۲۰۱۷، ص ۴۵۹

۴۴۔ سید عابد علی عابد، اسلوب، سنگِ میل پبلیکیشنز، ۲۰۱۱، ص ۴۱

۴۵۔ ایضاً، ص ۴۲

۴۶۔ ممتاز مفتی،لبیک، رُمیل ہاؤس آف پبلیکیشنز، ۲۰۱۴،ص ۱۱
۴۷۔ مستنصر حسین تارڑ، منہ ول کعبے شریف، سنگِ میل پبلیکیشنز، ۲۰۱۷،ص ۱۳
۴۸۔ ممتاز مفتی،لبیک، رُمیل ہاؤس آف پبلیکیشنز، ۲۰۱۴،ص ۱۶
۴۹۔ مستنصر حسین تارڑ، منہ ول کعبے شریف، سنگِ میل پبلیکیشنز، ۲۰۱۷،ص ۲۷
۵۰۔ ممتاز مفتی،لبیک، رُمیل ہاؤس آف پبلیکیشنز، ۲۰۱۴،ص ۳۱
۵۱۔ مستنصر حسین تارڑ، منہ ول کعبے شریف، سنگِ میل پبلیکیشنز، ۲۰۱۷،ص ۱۴
۵۲۔ ممتاز مفتی،لبیک، رُمیل ہاؤس آف پبلیکیشنز، ۲۰۱۴،ص ۴۰
۵۳۔ ایضاً،ص ۵۷
۵۴۔ مستنصر حسین تارڑ، منہ ول کعبے شریف، سنگِ میل پبلیکیشنز، ۲۰۱۷،ص ۵۷
۵۵۔ ایضاً،ص ۸۳
۵۶۔ ممتاز مفتی،لبیک، رُمیل ہاؤس آف پبلیکیشنز، ۲۰۱۴،ص ۴۱،۴۲
۵۷۔ ایضاً،ص ۱۲۱
۵۸۔ مستنصر حسین تارڑ، منہ ول کعبے شریف، سنگِ میل پبلیکیشنز، ۲۰۱۷،ص ۵۴
۵۹۔ ایضاً،ص ۲۲۳
۶۰۔ سید عابد علی عابد، اسلوب، سنگِ میل پبلیکیشنز، ۲۰۱۱،ص ۶۰
۶۱۔ ممتاز مفتی،لبیک، رُمیل ہاؤس آف پبلیکیشنز، ۲۰۱۴،ص ۶۲
۶۲۔ ایضاً،ص ۱۵۶
۶۳۔ مستنصر حسین تارڑ، منہ ول کعبے شریف، سنگِ میل پبلیکیشنز، ۲۰۱۷،ص ۷۳
۶۴۔ ایضاً،ص ۲۱۳
۶۵۔ ممتاز مفتی،لبیک، رُمیل ہاؤس آف پبلیکیشنز، ۲۰۱۴،ص ۱۵۰
۶۶۔ مستنصر حسین تارڑ، منہ ول کعبے شریف، سنگِ میل پبلیکیشنز، ۲۰۱۷،ص ۹۷،۹۸

باب چہارم:

لبیک اور منہ ول کعبے شریف میں فکری و اسلوبیاتی امتیازات

ابتدائیہ:

گزشتہ باب میں یہ تذکرہ ہو چکا ہے کہ کسی چیز کی خوبی یا خامی کو جانچنے کا پیمانہ یہ ہے کہ ہم اس کا موازنہ اس جیسی کسی دوسری چیز سے کرتے ہیں۔ جیسے کوئی شخص خوبصورت ہے تو ہم کہیں گے کہ یہ فلاں کی طرح خوبصورت ہے یا فلاں سے زیادہ خوبصورت ہے یا فلاں سے کم خوبصورت ہے۔ کوئی سے دو فن پاروں کا موازنہ اس بات کو واضح کر دیتا ہے کہ دونوں میں کیا چیزیں مشترک ہیں اور کیا چیزیں متفرق۔

خیال افروزی:

کسی فن پارے کی بنیاد میں جو صفت کارفرما ہوتی ہے وہ ہے اس کی Suggestion۔ جسے اردو میں ''خیال افروزی'' کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ بقول سید عابد علی عابد:

> یہ اسلوب کا وہ شیوۂ خاص ہے اور نگارش کی وہ شعبدہ گری ہے، جس کے اسرار و رموز صرف تخلیقی فن کار کو معلوم ہوتے ہیں۔ نقاد تو بعض اوقات یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ ہم خیال افروزی کی نشاندہی تو کر سکتے ہیں لیکن یہ نہیں بتا سکتے یہ صنعت کس طرح وجود میں آئی۔ تخلیقی عمل کا یہ وہ مرحلۂ پر اسرار ہے جہاں باریک بین نقادوں کی ژرف نگاہی، ہنر اور فن کے رموز کے سامنے سپر ڈال دیتی ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ سربسجدہ ہو جاتی ہے۔ [1]

تصویریت: Picturesquenes

تصویریت کا مفہوم یہ ہے کہ فن کار اصلاً قوت بصارت سے کام لے کر جن چیزوں کو ہم تک منتقل کرنا چاہتا ہے انہیں سلسلہ تصاویر کی شکل میں دیکھتا ہے۔ جو لوگ سینما کے کھیل کے لیے منظر نامہ (Scenario) لکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ جذبات ہوں یا افکار، اچھا منظر نامہ انہیں تصویروں کی صورت میں دیکھتا ہے۔ اس کے لیے اسے استعارہ کا سہارا بھی لینا پڑتا ہے۔ انسان کے ادراک کی تمام قوتیں اور اس کے حواس کی ساری صلاحیتیں بصارت کو اپنا ٹھکانہ بنا لیتی ہیں۔ سید عابد علی عابد ''اسلوب'' میں روسی مصنف چیخاف کا قول نقل کرتے ہیں کہ:

> مصنف (اعلیٰ درجے کا فن کار) چیزوں کو چکھتا ہے، سونگھتا ہے، چھوتا ہے، سنتا ہے اور دیکھتا

ہے۔حواس کی تمام قوتوں کی یکجائی سے بعض اوقات التباس بھی پیدا ہوتا ہے کہ دیکھنے والی چیز خوشبو کا روپ دھار لیتی ہے اور خوشبو نغمہ بن جاتی ہے۔ ۲؎

سید عابد علی عابد کی تحقیق کی روشنی میں دیکھا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ خیال افروزی اور تصویریت اسلوب کی دو ایسی صفات ہیں کہ جن کا براہِ راست تعلق مصنف کے ذاتی تخیل سے ہے۔ وہ جو کچھ سوچتا ہے اسے الفاظ کی تصویریں بنا کر پینٹ کرتا ہے۔ اسلوب کی ان دو صفات کا گہرائی میں جا کر جائزہ لیا جائے تو اس بات کا ادراک ہوگا کہ کوئی دو مصنفین بھی بیک وقت اور بعینہ ایک جیسا نہیں سوچ سکتے اور نہ لکھ سکتے ہیں۔لہٰذا کسی دو تخلیق کاروں کے فن پاروں میں جتنی بھی اقدار مشترک ہوں کسی نہ کسی مقام پر جا کر ان کے اسلوب میں، اندازِ تحریر میں،ذاتی رائے میں، انتخابِ الفاظ میں، وسیع النظری میں اور رویوں میں کہیں نہ کہیں امتیازات ضرور پائے جاتے ہیں۔

ممتاز مفتی اور مستنصر حسین تارڑ کے مابین متفرقات:

مندرجہ بالا دونوں مصنفین ادبی دنیا میں ایک جانے پہچانے ادیب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ممتاز مفتی اپنے دور کے معروف افسانہ نگار اور سفرنامہ نگار ہیں۔مستنصر حسین تارڑ سے جس بنیاد پر ان کے امتیازات پائے جاتے ہیں ۔ان میں پہلا امتیاز یہ ہے کہ ممتاز مفتی نے اپنی ادبی زندگی میں بہت سے افسانے لکھے۔ ان کے افسانوں کے پانچ ، چھ مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

جب کہ مستنصر حسین تارڑ نے کوئی افسانہ نہیں لکھا۔ یا کم از کم ان کا افسانوں کا کوئی مجموعہ منظر عام پر نہیں آیا۔ممتاز مفتی نے صرف ایک سٹیج ڈرامہ نظام سقہ لکھا۔ان کا ایک ہی ڈرامہ،منظر عام پر آیا۔جبکہ مستنصر حسین تارڑ نے چار سو سے زائد ٹی وی ڈرامے لکھے۔جن میں قسط وار ڈرامے بھی شامل ہیں ۔شہپر اور اس جیسے بہت سے کامیاب ڈرامے مستنصر حسین تارڑ کے زورِ قلم کا نتیجہ ہیں ۔

ممتاز مفتی نے علی پور کا ایلی کے نام سے ایک ضخیم کتاب لکھی۔ جسے بعد میں انھوں نے اپنی خودنوشت قرار دیا۔''ایلی'' انھوں نے اپنے آپ کو لکھا ہے۔ بعد میں اس کا دوسرا حصہ الکھ نگری کے نام سے شائع کیا۔ جو ان کی خودنوشت کو مکمل کرتا ہے۔مستنصر حسین تارڑ کی کوئی خودنوشت منظر عام پر نہیں آئی۔شاید ان کے پاس ابھی وقت نہیں ہے اپنی کہانی لکھنے کا۔اپنے بارے میں بتانے کا۔

ممتاز مفتی نے شخصی خاکے بھی لکھے۔جس میں انھوں نے اپنی خوبصورت تحریر سے پڑھنے والوں کو متاثر کیا۔مستنصر حسین تارڑ کو کوئی شخصی خاکہ پڑھنے کو نہیں ملا۔اسی طرح ممتاز مفتی کے کریڈٹ پر ناول بھی نہیں ہیں۔ جبکہ مستنصر حسین تارڑ نے اردو کے بہترین ناول لکھے۔جن کے کئی زبانوں میں تراجم ہوئے اور ان پر مقالے بھی لکھے گئے۔انھیں ''بیسٹ سیلر'' ایوارڈ بھی ملے اور صدی کے دس بڑے ناولوں میں بھی ان کے ناول کا

شمار ہوا۔ مستنصر حسین تارڑ اور ممتاز مفتی کی شخصیات کے درمیان امتیازات پر بات کریں تو پتہ چلتا ہے کہ ممتاز مفتی کی زندگی مختلف جگہوں پر کام کرتے اور حالات سے لڑتے ہوئے گزری۔ انھوں نے فلم اور ٹی وی کے لیے کام کیا لیکن خود اداکاری نہیں کی۔

جبکہ مستنصر حسین تارڑ ٹی وی کے کامیاب اداکار بھی رہے۔ انھوں نے کمپیئرنگ کے میدان میں بھی خوب نام کمایا۔ اور ان کی شخصیت کا ایک اہم پہلو یہ بھی رہا کہ وہ خود کوہ پیما بھی رہے۔ بہت سی چوٹیوں کو سر کرنے کے لیے سفر پر نکلے۔ اور انہی پہاڑی سفروں کے قصوں کو سفر ناموں کی صورت میں تحریر بھی کیا۔ لبیک کا فکری و موضوعاتی رویہ ممتاز مفتی اور مستنصر حسین تارڑ کے سفر ناموں لبیک اور منہ ول کعبے شریف کے مابین فکری و موضوعاتی امتیازات کو جانچنے کے لیے ہم ان کے سفر ناموں کا مختصراً جائزہ لینا پڑے گا۔

لبیک کا فکری رویہ یہ ہے کہ ممتاز مفتی نے دقیانوسی انداز میں نہیں بلکہ غیر معمولی طریقہ سے اپنی ماہیت قلب بیان کی ہے۔ ان کا فکری رویہ ایک متشکک مسلمان کا ہے۔ وہ عقیدت میں ڈوب کر نہیں بلکہ عام ذہنی سطح پر آ کر بات کرتے ہیں۔ اس کا اسلوب بھی مخصوص ہے۔ اذان کی آواز سن کر کانوں میں انگلیاں ٹھونس لینے کا ذکر ہے۔ طواف کو دھکم پیل کہا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو گڈریا کہہ کر یاد کرتے ہیں۔ فجر کے لیے جگائے جانے پر انھیں غصہ آتا ہے۔ خانہ کعبہ کو ''کالا بے ڈھب کوٹھا'' کہتے ہیں۔ ان کے اس انداز کو پڑھ کر مختلف قارئین نے مختلف آرا دیں۔ بعض نے ان کو پکا سچا مسلمان لکھا جبکہ بعض نے ان کو مذہب سے بیزار قرار دیا۔ بقول ڈاکٹر نجیبہ عارف:

> انھوں نے شکوک وشبہات کی دھند نہیں پھیلائی بلکہ اس دھند میں سے ایک صاف، بین اور معین راستہ بھی نکال کر دکھا دیا۔ آپ اس راستے پر چلنے سے انکار کر سکتے ہیں، اسے غلط قرار دے سکتے ہیں، لیکن اس بات سے انکار نہیں کر سکتے کہ حقائق کی تفہیم کا یہ بھی ایک راستہ ہے۔[۳]

منہ ول کعبے شریف کا فکری وموضوعاتی رویہ:

مستنصر حسین تارڑ نے اپنے حج کے سفر نامے میں ایک مخصوص فکری فضا بنا کر رکھی ہے۔ وہ ایسے مسلمان کی حیثیت سے ان مراحل سے گزر رہے ہیں، جیسے ارکانِ حج اور مقاماتِ مقدسہ کا کوئی علم نہیں۔ وہ پہلی بار بیت اللہ کو دیکھتا ہے تو اس کے دل میں عقیدت کا سیلاب نہیں آتا بلکہ وہ اسے عام انداز میں لیتا ہے۔ وہ ایسے انداز میں اپنی کیفیت کو بیان کرتے ہیں جیسے کوئی ایسا شخص ہے جو حج پر جانا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن اسے دوسروں کے توسط سے یہ موقع مل گیا ہے۔ وہ فکری طور پر ایک عام مسلمان کی قلبی واردات کو بیان کرتے ہیں جبکہ موضوعاتی طور پر وہ تقریباً جس مقام پر بھی پہنچتے ہیں۔ اس سے متعلقہ عقائد اور تاریخی واقعات کو موضوعاتی بناتے ہیں۔

حجرِ اسود کا بوسہ لینے کو خدا سے ہاتھ ملانا قرار دیت ہیں۔''طواف'' کو ہندوؤں کی شادی کے رسم میں ''پھیرے لینے'' سے جا ملاتے ہیں ۔ خانہ کعبہ کے پہلو میں دفن''ہاجرہ'' کو قبر کو موضوع بناتے ہیں۔ تو اس کی ساری تاریخ بیان کر دیتے ہیں ۔ وہ ہاجرہ کو اللہ تعالیٰ کی ہمسائی قرار دیتے ہیں۔

اسی طرح ہر مقام کے متعلق تاریخی حوالے ضرور دیتے ہیں۔ ان کا فکری و موضوعاتی انداز منفرد ہے۔

لبیک اور منہ ول کعبے شریف میں فکری و موضوعاتی امتیازات:

دونوں سفرناموں میں فکری اور موضوعاتی اشتراکات پر بات ہوئی ہمارے سابقہ باب میں ۔ اس باب میں دونوں سفرناموں میں فکری و موضوعاتی امتیازات پر بات ہوگی۔ ہر ادیب کی ایک مخصوص دنیا ہوتی ہے۔ وہ اس مخصوص دنیا میں رہتے ہوئے اپنے قلم سے کام لیتا ہے۔ اس کا قلم اس کے قلب و ذہن میں موجود کیفیات کو صفحۂ قرطاس پر بکھیرتا چلا جاتا ہے۔

لبیک اور منہ ول کعبے شریف کا فکری ماخذ ایک ہے۔یعنی دونوں حج کے سفرنامے ہیں۔ ان کا موضوعاتی ماخذ بھی یکساں ہے۔یعنی مقاماتِ مقدسہ پر جانے کے واقعات کو موضوع بتایا گیا۔لیکن جہاں ان دونوں ادیبوں نے اس موضوع پر اپنے اپنے انداز میں لکھا۔ دونوں میں امتیازات سامنے آتے گئے۔دونوں چونکہ حج کے سفرنامے ہیں ۔لیکن دو مختلف لوگ ایک ہی موضوع پر ہمیشہ متفق نہیں ہوتے کیونکہ یہی دستور ہے۔ لہٰذا ایک موضوع پر بات کرتے ہوئے بھی مختلف لوگوں کے نظریات مختلف طور پر سامنے آتے ہیں۔

ایک ہی ملک کے ادیب ہوتے ہوئے بھی دونوں کے درمیان امتیازات پائے جاتے ہیں۔ ان دونوں سفرناموں کے درمیان امتیازات ان ادیبوں کے مختلف زاویہ ہائے سوچ ہیں۔ جن کے بارے میں سیر حاصل بحث آئندہ صفحات میں کی جائے گی۔

ممتاز مفتی ذہنی رجحان:

ممتاز مفتی اور مستنصر حسین تارڑ کے سفرناموں کے درمیان امتیازات پر بات کرنے کے لیے سب سے ان کے ذہنی میلانات کو پرکھنا پڑے گا۔

ممتاز مفتی ذہنی طور پر ایک ایسے لکھاری تھے۔جن کے افسانوں کا موضوع عام پر جنس ہوا کرتی تھی۔عورت کا پسندیدہ کردار تھا۔ انھوں نے بے باکانہ انداز میں جنس پر لکھا۔ وہ مذہبی ہرگز نہیں تھے۔ اسی لیے جب انھوں نے سفرنامہ حج لکھا تو لوگوں کے سامنے یہ ایک عجیب چیز کے طور پر آیا۔لوگ انھیں ایک عام دنیادار لکھاری کے طور پر جانتے تھے۔ بقول افتخار عارف:

> ممتاز مفتی کی عام کتابیں اس بات کی گواہی دیتی ہیں کہ ان کے ذاتی تجربات اور مشاہدات کا

> دائرہ بہت وسیع ہے۔ وہ کسی بھی مشکل اور ادق فلسفیانہ مسئلے پر جس سادگی اور بے تکلفی سے اظہار خیال کی قدرت رکھتے ہیں۔ معاصرین میں سے شاید ہی کسی اور کے ہاں نظر آئے۔ انسانی نفسیات کا جیسا گہرا مطالعہ ممتاز مفتی کر سکتے تھے،شاید ہی اردو ادب کا کوئی اور نثر نگار قدرت رکھتا ہو۔۴؎

وہ بیک وقت ایک بے باک اور ایک عقیدت مند مصنف کے طور پر جانے جاتے تھے۔حج کے سفرنامہ کے دوران بھی ان سے ایسی ایسی باتیں تخلیق ہوئیں جو بیک وقت غیر مذہب بھی تھیں اور تصوف میں ڈوبی ہوئی بھی۔

مستنصر حسین تارڑ، ذہنی رجحان:

مستنصر حسین تارڑ چونکہ خود ایک ٹورسٹ ہیں۔کوہ پیما ہیں۔لہٰذا ان کے سفرنامے خالصتاً اس ماحول میں ڈھب کر لکھے ہوتے ہیں جس ماحول میں وہ اس سفر کے دوران تھے۔ وہ خود پہاڑوں پر چڑھنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ اور پہاڑوں کو قریب سے دیکھنے کا تجربہ ان کے لہو میں شامل ہے۔ یہی تجربہ وہ سفرناموں میں بیان کرتے ہیں۔ وہ چونکہ ڈرامہ نگار اور خود اداکار بھی رہے ہیں۔لہٰذا ان کے اندازِ تحریر میں ڈرامائی عنصر اور اداکاری کا انداز غالب ہوتا ہے۔

مذہبی طور پر وہ اور ان کے خاندان (سسرال) والے مولانا احمد علی لاہوری کے پیروکار تھے۔ اس لیے ان کی تحریر میں مذہبی پن بھی کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ بقول فاروق اقدس:

> ان کے بارے میں کسی ہچکچاہٹ کے بغیر کیا جا سکتا ہے کہ وہ واقعی اپنی ذات میں ایک انجمن ہیں ۔ اور کمال یہ ہے کہ اظہار کی جتنی بھی اصناف انھوں نے اپنائیں۔ ان سب میں عروج وکمال حاصل کے۔علم وفکر سے صحرا نوردی تک۔۔ انھوں نے صرف لوگوں کی توجہ حاصل کرنے یا مقبولیت کے حصول کے لیے کوششیں نہیں کیں بلکہ اپنے داخلی اضطراب کا کتھارسس انھوں نے تخلیق کے حوالے سے کیا۔۵؎

آغازِ سفر:

سفرنامے کا آغاز دراصل سفر کے آغاز کا نام ہے۔کوئی سفرنامہ تب ہی لکھا جائے گا، جب کہیں نہ کہیں ، کسی نہ کسی نے سفر کیا ہو۔سفر کی داستان لکھنے والا یا سنانے والا ، اُس سفر کے بارے میں توجیہی انداز میں بات کرتے ہوئے یہ بتاتا ہے کہ اسے وہ سفر کیوں کرنا پڑا۔ مذکورہ سفرناموں میں یہ بات طے ہے کہ سفر کا باعث حج بیت اللہ ہے، لہٰذا اس موضوع پر دونوں اصحاب نے بات نہیں کی کہ وجۂ سفر کیا تھی۔ بلکہ اس سفر میں بات آغازِ

سفر سے شروع ہوتی ہے۔ دونوں ادیبوں نے اپنے اپنے انداز میں بات کی ہے اور یہی انداز ان دونوں کے درمیان فکری وموضوعاتی امتیاز کا آغاز ہے۔

ممتاز مفتی نے فوارہ چوک میں ایک مست فقیر کا واقعہ بیان کیا کہ کس طرح اس نے ممتاز مفتی کو روک کر کہا کہ تو حج پر جائے گا۔ کچھ دن بعد انہیں حج کے خواب آنا شروع ہو گئے۔ پھر قدرت اللہ شہاب انھیں ایک باریش بزرگ کے سے ملوا دیا جو حاجی تھے۔ پھر تو جیسے بھُس میں آگ لگ گئی۔ اور حج کے خوابوں کا تانتا بندھ گیا۔ تین ماہ تک خوابوں کا سلسلہ جاری رہا۔ حتیٰ کہ ممتاز مفتی بوکھلا گئے۔ پھر قدرت اللہ شہاب نے ہالینڈ سے ممتاز مفتی کو خط لکھا کہ حج کے لیے درخواست جمع کروادیں۔ اسی طرح کئی مہینے گزر گئے۔ بالآخر وہ دن آ پہنچا جب وہ گھر سے حج کے لیے روانہ ہوگئے۔ لکھتے ہیں:

> دفعتاً آواز آئی، پی آئی اے کا طیارہ روانگی کے لیے تیار ہے۔ وہ میرا طیارہ تھا۔ میں اٹھ بیٹھا ارم خوشی سے چلانے لگی، ''بابا مبارک ہو'' قدرت اللہ اور ڈاکٹر عفت کو وہیں چھوڑ کر میں لاؤنج سے باہر نکل گیا سامنے میرا طیارہ روانگی کے لیے تیار کھڑا تھا۔ ۶

مستنصر حسین تارڑ کا آغازِ سفر ممتاز مفتی سے ہٹ کر ہے۔ جن دنوں وہ صبح کی نشریات کی میزبانی کیا کرتے تھے، انھیں ایک شخص ملا جس کا کہنا تھا کہ ڈاکٹر کہتے ہیں میری زندگی مختصر ہے۔ میں نے سوچا کہ مجھے زندگی میں سب سے زیادہ خوشی جس چیز نے دی ہے وہ آپ کی تحریریں ہیں۔ اس کے شکریہ کے طور پر اس شخص نے مستنصر حسین تارڑ کو ایک چیک پیش کیا، جس پر اڑتیس ہزار روپے کی رقم درج تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ آپ اس رقم سے حج کریں۔ انھوں نے وہ چیک لے لیا۔ لیکن بعد میں اپنی بیگم صاحبہ کے کہنے پر اسے واپس کر دیا۔ جب دوستوں کو پتہ چلا کہ مستنصر صاحب حج پر جا رہے ہیں تو انھوں نے ان سے کہا، مستنصر حسین تارڑ آپ کس کو دھوکہ دے رہے ہیں۔ آپ جیسا شخص تو حج بھی اس لیے کرے گا کہ واپسی پر ایک ضخیم کتاب سفرنامہ کی صورت میں لکھ سکے۔ لیکن مستنصر صاحب کا کہنا ہے کہ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میں فقط رضائے الٰہی کے لیے حج پر جانا چاہتا تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ ان کا بیٹا سلجوق جو اقوامِ متحدہ میں آفیسر تھا۔ ان دنوں سعودی عرب میں تھا۔ اس نے انھیں مدعو کیا۔ اور تیسری وجہ یہ تھی کہ ان کی بیگم میمونہ بیگم گزشتہ برس حاجن ہو کر لوٹی تھیں لہٰذا مستنصر حسین تارڑ کا ارادہ بھی بن گیا۔

مستنصر حسین تارڑ کا آغازِ سفر تحریر کرنے کا انداز ممتاز مفتی سے مختلف ہے۔ انھوں نے اپنی داستانِ سفر کا آغاز اس وقت سے کیا جب وہ جہاز میں بیٹھے ہیں اور پائلٹ اعلان کرتا ہے کہ ہم صرف دو منٹ میں مکہ شہر کے اوپر پہنچنے والے ہیں۔ نیچے جو روشنیاں آپ کو نظر آئیں گی وہ مکہ شہر کی ہوں گی۔ وہ کھڑکی کے شیشے سے ناک چپکائے مکہ کی روشنیوں کے منتظر ہوتے ہیں۔ اور یہ منٹ انھیں بے حد طویل لگے۔ جب وہ لاہور ایئر پورٹ

سے سوار ہوئے تو وہ عام لباس میں تھے۔ جب کہ دوسرے حاجی احرام باندھے ہوئے تھے۔ مستنصر حسین تارڑ کے ساتھ ان کے بیٹے سمیر تھے، ان دونوں کو عام لباسوں میں دیکھ کر عازمینِ حج انہیں عجیب نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ لکھتے ہیں:

> اگر چہ ہم دونوں بھی حج کی نیت سے ہی گھر سے نکلے تھے۔ سُمیر نیلی جین اور ٹی شرٹ میں تھا اور میں اپنے دیسی شلوار کرتے میں۔ احرام میں نہ تھے، کیوں نہ تھے؟ اس لیے کہ ہمارے پاس حج کا ویزا نہ تھا ملاقاتی ویزا تھا۔ ہم پر یہ پابندی نہ تھی کہ لاہور سے ہی اپنے آپ کو کفن میں لپیٹ لیں بلکہ ہم نے جدہ پہنچ کر احرام باندھنا تھا کہ ملاقاتی ویزا دراصل حج میں نقب لگانے کے مترادف ہے۔ جانا تھا ملاقاتی ویزا پر، اور پھر سمگل ہوجانا تھا۔ کہیں میرے بیان سے آپ یہ قیاس نہ کرلیں کہ ہم کوئی غیر قانونی قسم کا مخدوش سا حج کرنے کو تھے۔۔۔ جی نہیں یہ خالصتاً ایک شرعی حج تھا۔ اگر چہ نسبتاً مختصر تھا۔ ۷

لبیک اور منہ وِل کعبے شریف میں فکری و موضوعاتی امتیازات کا مطالعہ کرتے ہوئے ہمیں شروع سے ہی ان دونوں سفرناموں میں امتیازات نظر آجاتے ہیں۔ ممتاز مفتی نے لاہور سے احرام باندھا اور باقاعدہ حاجیوں والے گیٹ اپ میں یہاں سے روانہ ہوئے۔ جبکہ مستنصر حسین تارڑ عام لباس میں لاہور ایئر پورٹ سے روانہ ہوئے۔

مناسکِ حج کے متعلق مشورے:

لبیک میں ممتاز مفتی نے مناسکِ حج سے متعلق لوگوں سے جو مشورے کیے انھیں مکالموں کی صورت میں لکھا ہے۔ انھوں نے اکثر سوال قدرت اللہ شہاب سے کیے۔ جن کا انداز یہ تھا کہ مختصر جواب دیتے۔ ممتاز مفتی نے اللہ اور عبد کے تعلق کے بارے میں سوالات کیے۔ اپنی حیثیت اور مرتبے کے بارے میں گفتگو ہوئی۔ اور حج پر اکیلے جانے یہ نہ جانے پر بحث ہوئی۔ قدرت اللہ سے سوالات پوچھنے کے بعد ممتاز مفتی نے جو محسوس کیا اسے اپنے الفاظ میں اس طرح لکھتے ہیں:

> دفعتاً میں نے محسوس کیا کہ جیسے اللہ اور اس کے رسول کا مجھ سے گہرا تعلق ہو۔ میرے دل سے منہ زبانی مسلمان ہونے کا کانٹا نکل گیا۔ میرے بند بند میں ایک نیا رشتہ ابھرا، میں عبد ہوں۔ ۸

جب کہ اس کے برعکس مستنصر حسین تارڑ نے اپنے کسی دوست سے سوالات نہیں کیے۔ صرف اپنی بیگم صاحبہ سرسری پوچھا۔ انھوں نے بھی کوئی تسلی بخش جواب نہ دیا تو مستنصر حسین تارڑ نے دوستوں سے رجوع کیا۔ دوستوں سے مناسکِ حج کے متعلق مشورے کرتے ہوئے مستنصر حسین تارڑ کا انداز مکالمے کا نہیں اور نہ ہی

ممتاز مفتی کی طرح ان کو دوستوں نے بتایا۔ بلکہ ان کے دوستوں نے الٹا پر طنز شرع کر دیا کہ آپ تو محض سفر نامہ لکھنے کی غرض سے حج پر جائیں گے۔ جس کے جواب میں انھوں نے لکھا:

> فرض کر لیجئے کہ وہاں پہنچ کر میری وہ کیفیت نہ ہو۔ جو حج پر جانے والا ہر سفر نامہ نگار بیان کرتا ہے۔ کہ مجھ پر تو یہ قلبی اور روحانی واردات گزری۔ اور مجھے کچھ بھی نہ ہو۔ میں جوں کا توں رہوں جیسا ہوں ویسا ہی رہوں۔ نہ گناہوں کی پشیمانی میں آنکھوں سے آنسوؤں کے آبشار اتریں نہ کسی روحانی کیف کی سرمستی کی بارش میں بھیگوں۔۔ تو پھر کیا کروں۔ ۹

دونوں ادیبوں کے فکری شعور میں بہت فرق ہے اور دونوں کے ہاں ملنے والے موضوعات میں تنوع ہے۔

احوالِ سفر:

احوالِ سفر بیان کرتے ہوئے لبیک اور منہ ول کعبے شریف کے مصنفین کے اپنے اپنے اسلوب ہیں۔ دونوں میں کئی جگہ پر امتیازات پائے گئے۔ مثلاً یہ کہ ممتاز مفتی نے لاہور سے جدہ کا سفر بذریعہ ہوائی جہاز کیا۔ سفر کے بارے میں ان کا فکری انداز اور فنی مہارت جا بجا جھلکتی ہے۔ وہ طیارے میں موجود زائرین کی کیفیات بتاتے ہیں۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے جہاز ہائی جیک ہو چکا ہے۔ جدہ ائیر پورٹ پر جہاز سے باہر نکلنے کا منظر بیان کرتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ سامنے عام سا میدان تھا اور پیچھے پہاڑیاں۔

زائرین کو اپنے اپنے سامان کی فکر پڑ گئی۔ سب سامان سامان کا شور کر رہے تھے۔ حاجی کیمپ پہنچے تو وہاں کا منظر بتاتے ہیں کہ حاجی کیمپ ایک سہ منزلہ عمارت تھی۔ پھر معلم ڈھونڈنے اور کوٹھی تک پہنچنے کا واقعہ۔ پھر جداہ کے بازار کی گہما گہمی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> بازار میں لوگ اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ راہ گیر اپنی اپنی دھن میں چلے جا رہے تھے۔ ان کے چہروں پر مصروفیت کی لکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ انداز میں خشک کاروباری چشتی تھی۔ ان کی آنکھوں میں خوابوں کے دیئے روشن نہ تھے بلکہ ان پر حقائق پسندی کے پردے پڑے ہوئے تھے۔ انداز سے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے انھیں خبر ہی نہ کہ ان کی سر زمیں پر ایک عظیم واقعہ ہونے والا ہے۔ جس کے لیے دنیا کے گوشے گوشے سے لوگ وہاں اکٹھے ہو رہے ہیں۔ ۱۰

اس کے برعکس مستنصر حسین تارڑ نے بڑے فلسفیانہ انداز میں احوالِ سفر بیان کیے ہیں۔ انھوں نے لاہور سے جدہ اور جدہ سے مکہ کے سفر کو بڑے ہی دلچسپ پیرائے میں بیان کیا ہے۔ وہ جدہ کے بارے میں معلومات بہم پہنچتے جاتے ہیں۔ بطور ایک سفر نامہ نگار ان کی عادت ہے کہ شہر میں گھومنا، وہاں کے لوگوں کا،

دکانوں کا بازاروں کا، تاریخ کا، عمارتوں کا بغور مطالعہ کرنا اور انھیں اپنی تحریر کا حصہ بنانا۔ وہ جدہ کی سڑکوں، ہوٹلوں، قہوہ خانوں، شیشہ خانوں اور گلیوں کا کھینچتے چلے جاتے ہیں۔ جدہ سے مکہ کا سفر انھوں نے بذریعہ سڑک بیان کیا ہے جبکہ آغاز میں انھوں نے مکہ پہنچنے کا سفر بذریعہ ہوائی جہاز کیا ہے۔ دونوں صورتوں میں شہروں کی مکہ کا سفر جذباتی انداز میں کرنے کا تذکرہ کیا ہے۔ زندگی میں پہلی بار سڑک کے کنارے ''مکہ مکرمہ'' کا بورڈ دیکھا تو وہ چپ کے سناٹے میں چلے گئے۔ وہ لکھتے ہیں کہ انھوں نے پیرس، برلن، سٹاک ہوم، بیروت، دمشق، اشبیلیہ، استنبول اور کاشغر جیسے علاقوں کے سائن بورڈ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ لیکن جو تلذذ انھیں مکہ مکرمہ کا بورڈ دیکھ کر مل رہا تھا وہ پہلے اس سے آشنا نہ تھے۔ وہ سیاہ پوش ٹیلوں اور صحراؤں میں سے گزرتے ہوئے یہ سوچ رہے تھے کہ ابھی ان ٹیلوں اور جلتی بجھتی روشنیوں میں سے خانہ کعبہ ظاہر ہوگا۔ اور وہ سارے سفر کی منزل کو دیکھ لیں گے۔ لیکن پہاڑیاں تھیں کہ ختم ہونے میں ہی نہیں آرہی تھیں۔ ان کے ذہن میں بلھے شاہ کے اشعار چل رہے تھے۔

چوری کر، تے بھن گھر رب دا

کیسے عجیب شعر تھے بلھے شاہ کے۔

خانہ کعبہ کے مینار تک پہنچنے کے سب احوال انھوں نے حرف بہ حرف بیان کیے ہیں۔ سفر کے یہ سب حالات بیان کرنے کا انداز لبیک کے فکری انداز سے یکسر مختلف ہے۔ مستنصر حسین تارڑ کے کے اسلوب میں طوالت ہے، جزئیات نگاری ہے، تفصیل ہے، تخیل کی کارفرمائی ہے اور قلم کی بوقلمونی ہے۔ ممتاز مفتی بات کو جامع، مختصر، سلیس اور رواں انداز میں بیان کرتے ہوئے آگے بڑھ جاتے ہیں جبکہ مستنصر حسین تارڑ بات کو پھیلا کر اسے سمیٹنے کا، قاری کو اس بات کے اندر لے جانے اور پھر باہر نکال لینے کا فن جانتے ہیں۔ بات کو تہہ در تہہ لپیٹتے اور پھر سمیٹتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

> ایک طویل سرنگ میں داخل ہو گئے۔ اس کے اندرون میں جیٹ ہوائی جہازوں میں نصب پنکھوں ایسے جہازی ایئر کنڈیشنر ایک ملفوف میکانکی شور میں بلند ہو رہے تھے۔ سرنگ میں ٹھنڈک اور سرد ہوا تھی۔ ہم اس یخ بستہ ہواؤں والی سرنگ سے باہر آئے۔ باہر آئے تو ایک پُل کے پار۔ اونچی عمارتوں میں سے ایک بلند قامت کھجور کے درخت کی مانند ایک چکا چوند روشن مینار نمودار ہوا۔۔۔!!

پہلی نظر:

لبیک میں ممتاز مفتی کا اسلوب جا بجا جھلکتا ہے۔ انھوں نے خانہ کعبہ پر پہلی نظر پڑنے کی کیفیت بیان کی ہے۔ مستنصر حسین تارڑ کی کیفیت اس سے یکسر مختلف ہے۔ دونوں کا فکری انداز بالکل الگ ہے۔ ممتاز مفتی

کا کہنا ہے کہ خانہ کعبہ کالے پتھروں سے بنا ہوا ایک بے ڈھب کوٹھا ہے، جس پر سیاہ غلاف چڑھا ہوا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس کوٹھے کی چھت سے کسی نے سر نکالا۔ وہ چہرہ جھریوں والا تھا۔ ان جھریوں میں محبت کا طوفان ابھرا اور سمٹ رہا تھا۔ آنکھیں پُرنم، پیشانی روشن اور ہونٹوں پر مسکراہٹ۔ پوری سفر کی داستان میں پہلی نظر پڑنے والا مرحلہ سب سے اہم اور مرکزی اہمیت کا حامل ہے۔ جسے ممتاز مفتی نے ایک صفحے میں سمیٹ دیا ہے۔ ان کا مختصر نویسی کا اسلوب آڑے آتا ہے۔ اور وہ بات کو جلدی جلدی قارئین تک پہنچا کر آگے بڑھ جانا چاہتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

> وہ عظیم الشان مسجد معدوم ہو گئی۔ زائرین کا بے پناہ ہجوم چیونٹیوں میں بدل گیا، صرف کوٹھا رہ گیا۔ پھر وہ کوٹھا ابھرتا گیا، حتیٰ کہ ساری کائنات اس کی اوٹ میں آ گئی۔ ۱۲

اس کے برعکس مستنصر حسین تارڑ کا اپنا اسلوب ہے۔ وہ پوری داستان کے اس مرکزی نقطے کو اپنے انداز میں بیان کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جب مجھے خانہ کعبہ کا غلاف نظر آیا تو میں نے اپنی توجہ اس پر مرکوز کرنا چاہی۔ وہ کہتے ہیں کہ خانہ کعبہ کی عمارت مکمل طور پر مکعب نہیں ہے اونچائی اور چوڑائی میں کچھ فرق ہے۔ خانہ کعبہ پر ایک نظر ڈال کر وہ اس سے غافل ہو گئے۔ ان کے خیال میں اس میں وہ بات نہیں تھی جو اس کا گرداب ہونے والے سفید ذروں کے تحرک میں تھی۔ کہتے ہیں کی ٹیلی ویژن سکرین پر دیکھنے سے خانہ کعبہ جتنا بڑا نظر آتا ہے۔ اتنا بڑا ہے نہیں بلکہ چھوٹا ہے۔ حجرِ اسود کے بارے میں تاریخی معلومات، خانہ کعبہ کے پہلو میں دفن ہاجرہ کا قصہ اور زائرین کے متعلق جذباتی کیفیات اور بیان جو مستنصر حسین تارڑ کے یہاں تفصیلاً ملتے ہیں، ویسے ممتاز مفتی کے ہاں نہیں ملتے۔ حطیم اور رکن یمانی کی درمیانی دیوار کا منظر، خانہ کعبہ کی دیوار کے مستی میں بوسے لینے کا اندازِ وارفتگی جو ان کے ہاں موجود ہے، ویسا ممتاز مفتی کے ہاں نہیں ہے۔ انھوں نے طواف کے دوران موجود عورتوں کے عورت پن کے احساس سے بالکل عاری ہونے کو بیان کیا ہے۔ کیسے دنیا کی ہر عورت آپ کی ماں، بہن یا بیٹی بن جاتی ہے۔

ہر چیز کی جزئیات میں وہ اپنی قلبی واردات کو بھی شامل کرتے جاتے ہیں، یوں وہ ایک مکمل کیفیت بیان کر دیتے ہیں۔ جسے وہ قاری تک پہنچانا چاہتے ہیں۔ خانہ کعبہ کی دیوار کو بوسہ دینے کا ذکر ممتاز مفتی کے سفرنامے لبیک میں نہیں ملتا۔ مستنصر حسین تارڑ نے طواف کعبہ کو ہندوؤں کی شادی میں پھیرے لینے کی رسم سے تشبیہ دی ہے۔ انھوں نے ممتاز مفتی کے چھوڑے ہوئے تشنہ موضوعات پر سیر حاصل بحث کی اور یوں فکری و موضوعاتی اعتبار سے لبیک سے بالکل نرالا اور انوکھا سفرنامۂ حج رقم کیا۔ ممتاز مفتی حجرِ اسود کے بوسے لینے میں کامیاب ہو گئے۔ جب کہ مستنصر حسین تارڑ حجرِ اسود کے بوسے سے محروم رہ گئے۔ لکھتے ہیں:

> ساتواں پھیرا مکمل ہوا اور اس سیاہ پٹی پر قدم رکھا جو حجرِ اسود تک چلی جاتی تھی۔ تو ہم نے اس

پتھر کو جسے میں چوم نہ سکا تھا، ہاتھ بلند کر کے الوداع کہا اور بہاؤ سے الگ ہو گئے۔۔ میری زندگی کا پہلا طواف مکمل ہو گیا تھا۔ ۱۳؎

مستنصر حسین تارڑ نے حجرِ اسود کے بوسوں کی پیاس دیوارِ کعبہ کے بوسے لے کر بجھا لی اور اپنی ایمانی وجدانی کیفیات کی تسکین کی۔

عبادات کا سلسلہ:

ممتاز مفتی لکھتے ہیں کہ حرم میں بیٹھے ہوئے پہلی مرتبہ اذان کی آواز سن کر میں بھونچکا رہ گیا۔ یہ کیا چیز ہے، ایسا لگا جیسے پہلی بار اذان کی آواز سنی ہو۔ اس آواز نے سوتوں کو جگا کر رکھ دیا۔ بیٹھوں کو اٹھا کر رکھ دیا اور کھڑے ہوؤں کو دوڑا کر رکھ دیا۔ اس اذان کو سن کر عبادت کرنے کو دل چاہتا تھا۔ نماز پڑھنے کے لیے کھڑے ہوئے تو عجیب سی تنگ سی جگہ تھی۔ پچھلی صف کے نمازی کا سر میری ٹانگوں میں گھسیڑ رہا تھا۔

ایسی جگہ نماز پڑھنا ناممکن تھا۔ ایک طرف سے دھکا لگا تو ساری صف لڑکھڑا گئی۔ ممتاز مفتی کہتے ہیں کہ ایسے میں خشوع و خضوع کہاں ممکن تھا۔ لکھتے ہیں: ''دفعتاً میں نے محسوس کیا کہ میں خود بھی غیر حاضر تھا۔ حاضر ہو کر بھی غیر حاضر تھا۔ تسبیح کے شیدائی نے منکوں کا پردہ قائم کر رکھا تھا۔'' ۱۴؎

حطیم میں قدرت اللہ شہاب کے پیچھے پیچھے انھوں نے دو نفل نماز شروع کی۔ ابھی سورۃ فاتحہ شروع ہی کی تھی کہ چاروں جانب سے آوازیں آنے لگیں۔ اور عبادت میں خلل پڑ گیا۔ انھوں نے دعا مانگی کہ کاش وہ حطیم میں سجدہ کر سکیں۔ لاکھ کوشش کی لیکن سر، زمین تک نہ پہنچ سکا۔ ایک انجانے خوف میں وہ وہیں کونے میں کھڑے رہے، نجانے کتنی دیر۔

اس کے برعکس مستنصر حسین تارڑ کو عبادت کرنے کے مواقع تو میسر آئے لیکن وہ نوافل کے دوران بھی غلاف کعبہ کو تکتے رہے۔ انھوں نے اپنے بیٹے سُمیر کو بھی ایسا کرتے دیکھا۔ حجرِ اسود سے رخصت ہو کر انھوں نے مقامِ ابراہیم کی قربت میں بھی نوافل ادا کیے۔ انھوں نے افریقی خواتین کی عبادت کو بھی دیکھا جو جھومتی ہوئی تقریباً رقص کے انداز میں عبادت کرتی تھیں انھوں نے اتنی عبادت کی کہ تقریباً تھک گئے۔ لکھتے ہیں: ''عبادت کرتے کرتے۔۔احترام کرتے کرتے میں تھک چکا تھا۔۔عبادت اور احترام کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔'' ۱۵؎

منیٰ کا بیان:

منیٰ کے سفر میں دونوں ادیبوں کو مختلف واقعات اور قلبی کیفیات سے دو چار ہونا پڑا۔ جس کو دونوں ادیبوں نے اپنے اپنے اسلوب میں بیان کیا۔ ممتاز مفتی نے لکھا کہ چھ سے آٹھ لاکھ آدمی بسوں میں سوار ہو کر ایک میدان کی جانب چل رہے تھے۔ بسوں کے انجن گھاؤں گھاؤں کر رہے تھے۔ منیٰ کے شہر کو ممتاز مفتی نے

الف لیلوی شہر کہا ہے۔ جہاں سڑکیں ہیں، گلیاں ہیں، مکانات ہیں، رہائشی سامان بھی لگا ہے لیکن وہاں کوئی نہیں رہتا۔ حج کے موقع پر یہاں ہزار ہا خیمے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ لاکھوں لوگوں کا میلہ وہاں پہنچ جاتا ہے۔ تین جمروں کو مارنے کے لیے ہر زائر کو تقریباً ساٹھ ستر کنکریاں چننی ہوتی ہیں۔ زائرین ایسی کنکریاں چُن رہے تھے جو بڑی نہ ہوں، گول ہوں، ایک سی ہوں۔

کنکریاں مارنے کا منظر انھوں نے کچھ یوں بیان کیا ہے کہ زائرین غصے سے سرخ ہو رہے تھے۔ کوئی جوتوں سے جمرے کو پیٹ رہا تھا۔ کچھ عورتیں جمرے کو 'کھلے' دکھا رہی تھیں۔ کچھ 'بُجّے' دکھا رہی تھیں۔ ممتاز مفتی کہتے ہیں کہ میں بھی ہاتھوں میں کنکریاں پکڑ کر جُمرے کی طرف ایسے بھاگا جیسے باؤلر گیند پھینکنے کے لیے بھاگتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ نے جمرے کی طرف کنکری پوری قوت سے پھینکی، لیکن یہ کیا ہوا کہ ایک کنکری میرے ماتھے پر آ کر لگی۔ اگر زائرین کی پھینکی ہوئی کنکری مجھے لگتی تو سر کے پچھلے حصے میں لگتی، پیشانی پر نہیں۔ پھر میں نے مزید غصے میں آ کر دوسرا پتھر جمرے کو مارا تو میرے گال پر ایک پتھر آ کر لگا۔ پھر جب میں نے تیسرا پتھر مارا تو میری ناک پر آ کر لگا۔ میں نے سوچا کہ میں جمرے کو پتھر مار رہا ہوں یا جمرہ مجھے پتھر مار رہا ہے۔

ممتاز مفتی نے تینوں شیطانوں کو کنکریاں مارنے کے اس عمل کو بالکل ایک نئے زاویئے سے پرکھا۔ انھوں نے سوچا کہ وسوسے ڈالنے ولا، بہکانے والا، نافرمانی پر مائل کرنے والا میرے وجود کے اندر کہیں آپس میں مل کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ انھوں نے اس عمل کو ایک ایسے اینگل سے سوچا کہ کوئی بھی ایسا نہیں سوچتا ہوگا۔ ان کی سوچ کا یہ انداز ان کی فکری جہت سے قارئین کو روشناس کرواتا ہے۔ انھوں نے اپنے اندر کے چوڑ کو پکڑنے کے لیے اور اسے کنکریاں مارنے کے لیے لوگوں کو اس طرح دعوت دی۔

> بھائیو! جمرہ وہ نہیں ہے، جمرہ میں ہوں۔ مجھے کنکر مارو مجھے۔ اس بے جان کو کنکریاں مارنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ میں نے بنی نوع انسان کو بہکایا ہے۔ میں نے لوگوں کے دلوں میں وسوسے پیدا کیے ہیں۔ میں نے کفر و الحاد کا بیج بویا ہے۔
>
> میری طرف دیکھو، میں دانش ور ہوں۔ میں نے شک کو علم کی بنیاد قرار دیا ہے۔
>
> میری طرف دیکھو، میں ادیب ہوں، میں نے نئی اور انوکھی بے ادبیوں پر جدید ادب کی تعمیر کی ہے۔ بھائی! مجھے کنکریاں مارو، میں جمرہ ہوں، مجھ سے ڈرو نہیں کہ میں تم میں سے ہوں۔
>
> میں وہاں کھڑا چلا رہا تھا۔ لیکن میرے حلق میں آواز نہ تھی۔ اور ہجوم غصے اور غیظ وغضب سے جمرہ کو پتھر مارنے میں مصروف تھا۔ ۱۶

مستنصر حسین تارڑ کے یہاں جمرہ کو کنکریاں مارنے کے عمل کو کسی اور رنگ میں لیا گیا ہے۔ ان کا فکری

اسلوب ممتاز مفتی سے کچھ الگ ہے۔منہ ول کعبے شریف میں جہاں مستنصر حسین تارڑ نے باقی سب معاملات پر سیر حاصل بات کی اور ہر واقعہ کو اپنے مخصوص اسلوب میں بیان کیا۔اور اس بیان سے فلسفیانہ نتائج اخذ کیے، وہیں انھوں نے شیطان کو کنکریاں مارنے کے عمل کو ممتاز مفتی سے بالکل الگ انداز میں سوچا۔ وہ کنکریاں مارنے کے عمل کو شیطان سے مقابلہ کرنے کے مترادف سمجھتے ہیں۔انھوں نے منیٰ کے شہر کو بھنبھور سے تشبیہ دی اور خود کو سسی سے، وہ بے خبر سوتے رہے اور بھنبھور لٹ گیا۔

منیٰ کے میدان میں دو زندگیاں تھیں۔ایک خیمے کے اندر اور دوسری خیموں کے باہر۔رات کے اندھیرے میں کنکریاں تلاش کیں۔مزدلفہ کی سنگلاخ زمین میں تلاش کی جانے والی کنکریاں ایک پوٹلی میں لپیٹ کر وہ منیٰ کے میدان میں شیطانوں کو مارنے کے لیے بالکل تیار تھے۔ان کے خیال میں کروڑوں کی تعداد میں اس پہاڑی سے کنکریاں چُنی جاتی ہیں تو پھر ہر سال اتنی کنکریاں کہاں سے آجاتی ہیں۔مستنصر حسین تارڑ بتاتے ہیں کہ میں کنکریاں مارنے کے اس عمل کو پاگل پن اور حماقت سمجھتا تھا۔لیکن آج نہ جانے مجھ میں اتنا جوش کہاں سے آگیا کہ میں آگے بڑھ بڑھ کر کنکریاں مارنے لگا۔

وہ کہتے ہیں کہ میں اولمپک کھیلوں میں شامل کسی نشانہ باز کی طرح بڑے حساب کتاب سے شیطان کا نشانہ لیتا تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ شیطان کو کنکریاں مارنا دراصل اپنے نفس اور غرور وتکبر کو کنکریاں مارنا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ کنکریاں ہمیشہ فاتح ہوتی ہیں۔وہ ابابیلوں کے پنجوں میں ہوں تو ابرہہ کی فوج کو تہس نہس کر دیتی ہیں۔ اگر آپ ایک کنکری شیطان کی جانب اچھالتے ہیں تو وہ آپ کو لاکھوں کنکریوں کی موجودگی کے باوجود جمرے تک پہنچنے اور جمرے کو لگنے تک کا منظر صاف دکھائی دے گا۔ وہ اپنے منفرد اور انوکھے نقطۂ نظر کو یوں بیان کرتے ہیں۔

> ویسے تو یہی جی چاہ رہا تھا کہ مزدلفہ کی رات میں سے جتنی بھی کنکریاں چن کر لایا ہوں ۔ان سب کو بے دریغ داغ دوں کہ جی ابھی بھرا نہیں۔حکم تھا کہ آج کے روز صرف سات کنکریاں مارنے پر اکتفا کرنا ہے۔اور شرافت سے لوٹ جانا ہے۔ ۱۷

عشقِ رسول:

جذبۂ عشقِ رسول کے حوالے سے پرکھا جائے تو لبیک اور منہ ول کعبے شریف میں امتیاز موجود ہے۔ پہلے سفرنامے کے لکھاری ممتاز مفتی کا اپنا مخصوص زاویۂ نظر ہے۔ وہ عشقِ رسالت میں کہاں تک پہنچے ہیں اس کا اندازہ ان کی اس بات سے لگایا جا سکتا ہے جب انھوں نے مدینہ منورہ میں بکنے والی چیزوں میں سے کسی چیز کو خریدنا مغربی تجوریوں کو بھرنے کے مترادف سمجھا۔ وہ کہتے ہیں کہ مدینہ منورہ کا صرف ایک ہی تحفہ ہے اور وہ ہے یہاں کی خاکِ پاک۔ وہ اس مٹی کے حصول میں مارے مارے پھرتے رہے۔ ایک زائر نے

انہیں خاک پاک دینے کی کوشش کی تو اسے پولیس والے نے پکڑ لیا۔ کیوں کہ خاک پاک بیچنا جرم تھا۔

مسجدِ نبوی میں حاضری ہوئی تو قدرت اللہ شہاب کے ساتھ وہ بابِ جبرئیل کے راستے مسجد میں داخل ہوئے۔ حجرے میں داخل ہوئے تو ان پر عجیب کیفیت طاری ہوگئی۔ وہاں لوگ نفل پڑھ رہے تھے،لیکن ان میں نفل پڑھنے کی ہمت نہ رہی۔ دھکوں کی وجہ سے نماز قائم رکھنا دشوار تھا۔ وہ من ہی من میں رسول اللہ سے التجا کرنے لگے کہ انھیں بھی یہاں نفل پڑھنے کے لیے یکسوئی حاصل ہو جائے۔ عشقِ رسول کا جذبہ ان کے دل میں اتنا موجزن ہو چکا تھا کہ وہ یہاں صرف ایک عقیدتوں بھرا سلام پیش کرنا چاہتے تھے۔ لکھتے ہیں۔۔

> وہ سلام نہیں جو دوسروں پر سلامتی بھیجتا ہے۔وہ سلام نہیں جو کتابوں میں لکھا ہوتا ہے بلکہ وہ سلام جو ایک ادنیٰ، عاجز اور مسکین شخص، ایک اعلیٰ اور ارفع ہستی کو جھک کر ماتھے پر ہاتھ رکھ کر کرتا ہے۔میری آرزو ہے کہ اپنی عقیدت کا اظہار کروں۔تیری خوشنودی حاصل کرنے کے لیے سجدہ کروں۔ تیری خوشنودی سے عظیم تر نعمت کیا ہو سکتی ہے۔میرا جی چاہتا ہے کہ میں تیرے قدموں میں کھڑا ہو کر نعرہ لگاؤں کہ اے عظیم ترین انسان! میں جو ننگِ انسانیت ہوں۔ میں تجھے سلام پیش کرتا ہوں۔تو جو میرا سلام قبول کر لے تو میری خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہ رہے۔ اور تجھے کوئی پوچھنے والا نہیں کہ ایسے شخص کا سلام قبول کیوں کیا۔جو انسانیت کے نام پر کلنک کا ٹیکا ہے۔ ۱۸

مندرجہ بالا اقتباس سے پتہ چلتا ہے کہ روضۂ رسول پر حاضری دیتے وقت ممتاز مفتی کے قلب میں انکساری، عاجزی، روحانیت اور عشقِ محمدی کے کیا مراحل طے ہو رہے ہیں۔ وہ دعائیں مانگتے ہیں،لیکن انھیں سمجھ میں نہیں آتا کہ دعاؤں میں کیا مانگیں۔پھر شرم ساری کے ساتھ حضورِ رسالت مآب میں عرض کرتے ہیں۔کہ:''یا حضور! میری باتوں کا برا نہ مانیے ، میں بے وقوف ہوں جاہل ہوں۔'' ۱۹

پھر درودِ تاج پڑھ کر اپنی خفت مٹانے لگتے ہیں۔

مستنصر حسین تارڑ کے ہاں مدینہ منورہ حاضری، عشقِ محمدی اور دعاؤں، التجاؤں کی صورت بالکل الگ تھلگ نظر آتی ہے۔ روضۂ رسول پر جانے کے منظر کو ایسے بیان کرتے ہیں جیسے کوئی سیاح کسی تاریخی مقام پر جا رہا ہے۔ وہ صحن عبور کر کے مسجد نبوی کے بلند دروازوں تک پہنچے۔ یہ اونچے، سنہری، منقش اور شاندار دروازے ہیں۔ صحن سے باہر آ کر روضۂ رسول تک پہنچتے ہیں۔سلام کرنے والوں کے لیے مخصوص دروازہ ہے جسے باب الاسلام کہا جاتا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ کہتے ہیں کہ سلجوق مجھے بار بار سہارا دیتا، میں لاچار سا ہو گیا تھا۔ جیسے یکدم بوڑھا ہو گیا ہوں۔ وہ باب الاسلام میں داخل ہوئے تو ہجوم کا ایک ذرہ بن گئے۔ ٹانگوں میں جان نہیں رہی۔ وہ اس لیے کہ میں روضۂ رسول کے بالکل قریب پہنچنے والا تھا۔ وہاں کام کی چیکنگ ہو رہی تھی اور میری

کاپی کوری تھی۔

حاضری کے وقت مستنصر حسین تارڑ کی آنکھوں کے سامنے رسول اللہ کی حیاتِ مبارکہ کا سارا فلیش بیک سمٹ آیا۔ حضور اکرم ﷺ کی پیدائش سے لے کر بچپن تک۔ بچپن سے لے کر جوانی تک اور جوانی سے لے کر رحلت تک ساری تاریخ انھوں نے خوبصورت پیرائے میں بیان کر دی۔ وہ روضۂ رسول کے اندر درود شریف پڑھتے جاتے اور اس کی سرسراہٹ گنبدوں کی نیلاہٹ کو جا کر چھوتی اور واپس آتی تھی۔ وہ بے چین تھے اور بار بار سر اٹھا کر 'کچھ' دیکھنے کی کوشش کرتے۔ وہ اپنی کیفیت کو بیان کرنے سے قاصر تھے۔ لکھتے ہیں:

بے شک ایک ایسا شخص جو قادر الکلام ہو۔ اپنی عقیدت اور جذبات کو بیان کرنے میں یکتا ہو۔ کل کائنات کے درختوں کو قلم بنا کر۔۔۔ انہیں حسبِ منشا تراش کر گھڑ سکے اور کل سمندروں کی روشنائی میں ''ڈوبے'' لگا کر اس چند سو قدم کے فاصلے کو ایک ہی بار لکھ دے۔۔۔ تو ایسا شخص ایسے بیان پر قادر ہو سکتا ہے۔ لیکن میں تو ایسا نہیں ہوں ۲۰

دل ڈوب رہا تھا۔ خون کی ترسیل رُکی ہوئی تھی۔ کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا کہ کیا کہنا ہے اور کیا مانگنا ہے۔ اشکوں کے گرنے سے پاؤں کے نیچے والے قالین کے گل بوٹے نم ہو رہے تھے۔ کہ اچانک ایک کشتی میری تمنا کے ساحل سے آ لگی۔ وہ ایک مصرعہ ذہن آیا تھا کہ سکون مل گیا۔ لکھتے ہیں:

کتھے مہر علی، کتھے تیری ثنا۔۔۔

بس یہی تو عرض کرنا چاہ رہا تھا۔ اور عرض کے لیے ہر حرف ناکافی ہو رہا تھا۔ تو بس میں تو فارغ ہو گیا۔ اطمینان سے سکون میں ہو گیا۔ کہ جو عاجز تھا اس نے عجز کا ایسا اظہار کیا کہ ایک لمحے کے لیے پرتکبر ہو گیا کہ بابا جی ہم نے ہتھیار ڈال دیئے ہیں۔ ۲۱

الوداعی جذبات:

لبیک میں ممتاز مفتی نے اپنے انداز میں اختصار کے ساتھ تمام کیفیات کو بیان کیا ہے۔ جبکہ منہ ول کعبے شریف میں مستنصر حسین تارڑ نے ہر موضوع پر اتنا زیادہ لکھا کہ تشنگی نہ رہی۔ ان کے پاس الفاظ اور خیالات کے سمندر ہیں۔ جو کھولیں تو سمٹنے میں نہیں آتے۔ اس کے برعکس ممتاز مفتی کے بیانات میں جامعیت اور مختصر نویسی نمایاں ہے۔ وہ جلدی سے بات کر کے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کا اپنا انداز ہے۔ مناسکِ حج ادا کر لینے کے بعد وہاں سے الوداع لینا، واپسی کا ارادہ کرنا ایک کٹھن مرحلہ تھا۔ اس مرحلے پر بھی ممتاز مفتی اور مستنصر حسین تارڑ کے سفرناموں میں امتیازات موجود ہیں۔ دونوں کا اپنا اسلوب ہے، بات کرنے کا ڈھنگ ہے۔

مکے سے وداع ہونے کے جذبات بھی دونوں حضرات نے قلم بند کیے لیکن اب باری تھی مدینہ منورہ سے رخصت ہونے کی۔ جو ایک عاشقِ رسول کے لیے بہت مشکل تھا۔ مکہ سے تمام زائرین ایک ہی دن وداع ہوتے ہیں جبکہ مدینہ منورہ میں زائرین کے ٹولے آتے جاتے رہتے ہیں۔ لہٰذا الوداع کا وہ منظر پیدا نہیں ہوتا جو مکہ معظمہ میں ہوتا ہے۔ سفارت خانے میں جا کر ضروری کارروائی کرنے، مسافر خانہ میں شب و روز گزارنے کے مناظر بیان کرتے ہوئے ممتاز مفتی اس قدر رنگا رنگ دلچسپیوں کا ذکر کرتے ہیں کہ منظر سامنے نظر آنے لگتا ہے۔ مسافر خانے میں لوگ زیادہ تر نمازیں پڑھتے، نفل ادا کرتے، تسبیح چلاتے یا پھر جلد از جلد وطن پہنچنے کی ذہنی فکر اور تگ و دو میں دن گزارتے۔

جدہ سے خروج ہوا۔ ممتاز مفتی کہتے ہیں کہ میں اپنے دل میں یہ ایمان پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہوں کہ میں حاجی ہوں۔ تو مطاف، حطیم اور جمرۃ العقبہ مجھ سے یہ کہتے ہوئے سنائی دینے لگتے ہیں کہ ''مجھ سے پتھر کھا کر گیا ہے اور حاجی بننے چلا ہے۔'' بالآخر ۲۶ مارچ کو ایئر پورٹ کے لاؤڈ سپیکر پر اعلان ہوا کہ مسافر رن وے پر کھڑے جہاز میں اپنی نشستوں پر جا کر بیٹھیں۔ تو ایسے لگا جیسے ہم اپنے وطن پہنچ گئے ہوں۔

رخصت ہوتے ہوئے ان کے دماغ میں یہی چل رہا تھا کہ جب میں راولپنڈی پہنچوں گا تو لوگ مجھ پر پھول نچھاور کریں گے۔ مجھے لوگ یا حاجی یا حاجی کہیں گے۔ لکھتے ہیں:

> پھر زندگی بھر لوگ 'یا حاجی' کی زیارت کو آیا کریں گے۔ اور محفل میں بیٹھ کر میں کھنکھار کر کہوں گا، سبحان اللہ، سبحان اللہ۔ کیا سماں تھا۔ نور ہی نور، نور ہی نور، اور جب ہم اس پاک سرزمین سے واپس آنے لگے تو ہماری آنکھوں سے اشک رواں تھے۔ اور دل جدائی کے غم سے نڈھال تھے۔ [۲۲]

اس کے برعکس مستنصر حسین تارڑ نے منہ ول کعبے شریف میں الوداعی جذبات کو اور ہی پیرائے میں بیان کیا ہے۔ انھوں نے درِ رسول پر حاضری کو ساغر صدیقی کے ایک شعر سے مثال دے کر سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ کہتے ہیں۔۔

میں نے پلکوں سے درِ یار پہ دستک دی ہے
میں وہ سائل ہوں جسے کوئی صدا یاد نہیں

مستنصر حسین تارڑ کو روضۂ رسول کے اندر جا کر زیارت کا موقع بھی ملا ہے۔ انھوں نے سنہری جالیوں کو روضۂ رسول کے اندر سے دیکھا۔ وہ کہتے ہیں کہ اندر تین قبریں ہیں۔ جو دراصل تعویذ ہیں اور اصل قبریں اس کے عین نیچے تہہ خانہ میں موجود ہیں۔ انھوں نے مدینے میں ایک فہرست مرتب کر لی تاکہ بھول نہ جائیں کہ کس

وقت کون سا کام کرنا ہے۔ جس میں یہ شامل تھا کہ مسجدِ نبوی میں جمعہ ادا کرنا ہے۔ ریاض الجنۃ میں دو نفل ادا کرنا، منبر رسول کے آگے دو نفل ادا کرنا۔ محرابِ رسول کے آگے دو نفل ادا کرنا۔ اصحابِ صفہ کے تھڑے پر بیٹھ کر ابو ذر غفاری، ابو ہریرہ اور عبیدہ بن جراح کو یاد کرنا۔ حجرۂ رسول کی دیوار کے ساتھ بیٹھ کر کچھ دیر پڑھنا۔ اور جو جی میں آئے مانگتے جانا۔

اس کے بعد مستنصر حسین تارڑ مسجدِ قبا کی زیارت کے لیے چلے گئے۔ مسجدِ قبلتین گئے، بیرِ عثمان دیکھا۔ جنگِ خندق کا میدان دیکھا۔ مدینہ منورہ کا ریلوے سٹیشن دیکھا۔ اس کے بعد وہ سات مسجدیں دیکھیں، جو ان صحابہ کرام کی یاد میں بنائی گئی تھیں، جنہوں نے غزوۂ خندق کے دوران جس جگہ اپنے خیمے لگائے تھے۔ وہیں پر وہ مساجد تعمیر کی گئی ہیں جو تعداد میں صرف تین رہ گئی ہیں۔ حضرت ابو بکر، حضرت عثمان، حضرت علی، سلمان فارسی اور رسول اللہ۔ یہ مسجدیں ترکوں نے تعمیر کی تھیں۔

غارِ حرا:

مستنصر حسین تارڑ نے غارِ حرا کا احوالِ قلم بند کیا ہے جو مکہ سے دو میل کے فاصلے پر ایک بلند اور دشوار گزار چڑھائی والے جبل پر واقع ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ اس پہاڑ پر چڑھتے ہوئے پاؤں میں سنگریزے چبھتے ہیں۔ پتھروں کو تھامنا پڑتا ہے، چڑھائی کی مشقت سے بدن پسینے پسینے ہو جاتا ہے۔ کئی عورتیں ہانپ رہی تھیں۔ کوئی دل کا مریض ہے تو چاروں شانے چت پڑا ہے۔ ملائیشیا، ایران، انڈونیشیا، افغانستان، منگولین، تُرک، بوسنیا، ترکستان، اور افریقی مرد و خواتین اس دشوار گزار چڑھائی پر چڑھ رہے تھے۔ راستے میں بلا معاوضہ سیڑھیاں تعمیر کرنے والے مستریوں سے ملاقات ہوتی ہے۔ جنہیں لوگ اپنی جیبیں خالی کر کے کرنسی نوٹ دیتے ہیں۔ گداگروں سے ملاقات ہوتی ہے جو معذور ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں ڈالر، ریال، پاؤنڈ، لیرا، ین، اور نجانے کون کون سی کرنسی کے نوٹ ہوتے ہیں۔

چوٹی پر پہنچتے ہیں تو ایک چھپر نظر آتا ہے۔ ایک چٹان پر نہایت بھدے انداز میں غارِ حرا لکھا ہوا ہے۔ تا کہ زائرین وہاں اپنی تصویریں اترواسکیں۔ اور اپنے وطن جا کر دکھاسکیں۔ حالانکہ وہ غارِ حرا نہیں ہے بلکہ غارِ حرا تھوڑا آگے نشیب میں واقع ہے۔ نشیب میں جانے کے لیے چھوٹی چھوٹی سیڑھیاں ہیں۔ جبلِ نور کی چوٹی کے نیچے ایک ٹنڈ مُنڈ سا درخت ہے۔ غارِ حرا کے باہر ایک بنگالی بابا بیٹھے بیٹری کی روشنی سے اشارہ کر کے کہہ رہے ہیں کہ اس طرف جاؤ جہاں ایک سرنگ تھی۔ مستنصر حسین تارڑ لکھتے ہیں:

> میں اس سرنگ کے دہانے پر جھک جاتا ہوں۔ اس تنگ سرنگ کی تاریکی میں بھیڑ بہت ہے۔ کچھ لوگ پھنسے ہوئے ہیں۔ اور مدد کے لیے پکار رہے ہیں۔ لیکن ٹریفک جاری ہے لوگ آجا رہے ہیں۔ یہ سرنگ غارِ حرا کے سامنے جو مختصر صحن کھلتا ہے اس میں کھلتی ہے۔ لیکن میں اس

> سرنگ میں داخل ہونے سے گھبرا رہا ہوں، مجھ میں ہمت نہیں ہے کہ ایک تاریک غار میں داخل ہو جاؤں۔ جہاں لوگ ٹھنسے پڑے ہیں۔کیا پتہ وہاں ٹریفک جیم ہو جائے۔۔۔میرا اس خیال سے ہی دم رکنے لگا۔۲۳

چٹان کے دائیں جانب دیکھوتو غارِ حرا کی چھت ہے۔اس چھت پر بیٹھ کر نیچے دیکھا جائے تو جبلِ نور کی دوسری جانب نیچے ایک وادی نظر آتی ہے۔قیاس کیا جاتا ہے کہ وہاں ام المومنین حضرت خدیجہ خیمہ زن ہوا کرتی تھیں کہ ان کا شوہر اوپر غارِحرا میں مصروفِ عبادت ہے۔اسے کھانے پینے کی اشیا پہنچانی ہیں۔

مستنصر حسین تارڑ اور ان کے بیٹے سلجوق اور سمیر غار کے باہر بیٹھ کر لوگوں کی مدد کرنے لگے۔اس دوران وہ کبھی کبھی غار کے اندر جھانک کر دیکھ لیتے۔جہاں سنگِ مرر کا ایک فرش نظر آتا اور کچھ نہیں۔یہ غار تو نہ تھی ایک کھوہ تھی۔آڑھی ترچھی چٹانوں کے ڈھیر میں ایک کھوہ۔جس کے اندر جانا ان کے نصیب میں نہ تھا۔بالآخر وہ وہاں سے اٹھے، نوافل ادا کیے۔اس جگہ بہت سے لوگ نوافل ادا کر رہے تھے۔وہاں کھڑا ہونا مشکل تھا۔لکھتے ہیں:

> اس کے باوجود کھائی کے کناروں پر جو پتھر معلق تھے۔ان پر قبضہ ہو چکا تھا۔اور لوگ نفل ادا کرنے میں محو تھے۔چپٹی، ستواں، موٹی، صرف نتھنوں والی اور اونچی ناکوں والے اور والیاں نفل ادا کر رہے تھے۔اور ان سب کا ''منہ ول کعبے شریف'' تھا۔۲۴

طوافِ وداع:

مستنصر حسین تارڑ کے بیٹوں نے انھیں کہا کہ واپسی کی تیاری کرنی ہے لہٰذا طوافِ وداع کر لیا جائے۔ تو ان کے دل پر اداسی چھا گئی۔وہ بابِ عبدالعزیز کے باہر سنگِ مرمر کے صحن میں بچھی سبز قالین کی پٹیوں پر احتیاط سے چل رہے تھے کہ کہیں یہ احرام نہ کھل جائیں، جو انھوں نے حج سے فارغ ہونے کے کافی دنوں بعد پہنے تھے۔

مستنصر حسین تارڑ کہتے ہیں کہ میرے اندر پہلی ملاقات والا ہیجان نہیں بلکہ آخری ملاقات والی اداسی تھی۔جیسے بیٹیوں کو رخصتی پر وداع کیا جاتا ہے تو دل ڈوب ڈوب جاتا ہے۔اسی طرح آج ہماری رخصتی تھی۔ہم چڑیوں کا وہ چنبہ تھے جنہیں آج بابل کے اس دیس سے اڑ جانا تھا۔اور بابل کے سیاہ پوش محل سے بچھڑ جانا تھا۔ کہتے ہیں۔

> طوافِ وداع کی ایک عجیب اداسی تھی۔ایک دکھ تھا۔بے شک وہ اس کا گھر تھا۔ہم پل دو پل کے مہمان تھے۔آئے تھے تو جانا بھی تھا۔اس کے گھر کو اپنا گھر سمجھ لیا تھا۔اور جانے کو

جی نہ چاہتا تھا۔ ہمیں اس کے آس پاس رہنے کی عادت ہوگئی تھی۔ ''ہن وچھڑن ہو یا محال نہیں'' ۲۵

مستنصر حسین تارڑ کہتے ہیں کہ دراصل کوئی شخص جب ایک بار اس سفید گرداب نما طواف کا حصہ بن جاتا ہے تو ساری عمر اس میں سے نکل نہیں سکتا۔ گھومتا چلا جاتا ہے۔ اس کا طواف کبھی مکمل نہیں ہو پاتا۔ وہ دنیا میں کہیں بھی چلا جائے تب بھی اس گرداب میں حرکت کرتا رہتا ہے۔ یہ زندگی بھر کا طواف ہے۔

یہ سات پھیرے ایک بار انسان کی زندگی میں آجاتے ہیں تو واپس نہیں جاتے۔ حجرِ اسود کا بوسہ ان کی قسمت میں آج بھی نہیں تھا۔ اسے دور سے سلام کیا۔ ایک میاں بیوی اپنے بچے کو اٹھائے ان کے پاس آگئے اور کہا کہ آپ مستنصر حسین تارڑ ہیں۔ ہمارے اس بچے کے لیے دعا کیجئے یہ بول نہیں سکتا۔ ان کی یہ بات سن کر مستنصر حسین تارڑ کی آنکھوں سے دریا بہہ نکلے۔ انھوں نے سوچا کہ مجھ جیسے گناہ گار کو یہ لوگ نہ جانے کیا سمجھ کر دعا کروا رہے ہیں۔ بہر حال انھوں نے خدا سے گڑگڑا کر دعا کی کہ یا اللہ میرا بھرم رکھ لیجئے ان لوگوں نے ساری ذمہ داری مجھ پر ڈال دی ہے۔ اس بچے کو قوتِ گویائی عطا کر دیجئے۔ دعا کروا کے وہ میاں بیوی ہجوم میں گم ہو گئے لیکن مستنصر حسین تارڑ کہتے ہیں کہ مجھے اس بات کا پورا یقین ہے کہ دنیا میں جہاں کہیں بھی ہوں گے۔ ان کا بچہ بول رہا ہوگا۔ حطیم کے اندر نوافل ادا کرنے کے بعد خانہ کعبہ کی دیوار پر اپنے ہونٹ ثبت کرتے ہوئے انھوں نے مختصر دعا کی: ''مجھے واپس بلانا۔۔'' ۲۶

خلاصۂ کلام:

ممتاز مفتی نے وطن واپس پہنچ کر لوگوں سے ملاقات اور ان کے تاثرات کے بارے میں بہت سی باتیں لکھیں۔ ایک دنیا دار آدمی کے بے تکلف دوست واقعتاً اسے ایسی ہی باتیں کرتے ہیں۔ اس کے برعکس مستنصر حسین تارڑ نے واپسی کے سفر اور وطن پہنچنے پر لوگوں کے تاثرات والا موضوع تشنہ چھوڑ دیا ہے۔ اس موضوع پر انھوں نے اس سفرنامے میں کچھ نہیں لکھا۔ حالانکہ وہ اس موضوع پر بھی لکھتے تو قارئین کو بڑی دلچسپ معلومات مل جاتیں۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ ''لبیک'' اور ''منہ ول کعبے شریف'' میں فکری و موضوعاتی اعتبار سے بہت سے امتیازات موجود ہیں۔ جو ان دونوں مصنفین کے انداز کی بدولت ہیں۔ کچھ امتیازات ان کے ساتھ پیش آنے والے واقعات کی وجہ سے ہیں۔ جیسے ایک کو حجرِ اسود کو بوسہ نصیب ہو، دوسرے کو نہیں۔ ایک روضۂ رسول کے اندر پہنچا تو دوسرے نے باہر جالیوں میں سے نظارہ کیا۔ ایک نے غارِ حرا تک پہنچنے کے احوال لکھے تو دوسرے نے اس کا ذکر نہیں کیا۔ اسی طرح ہر ادیب کا اپنا سوچ کا زاویہ ہے۔ اس زاویئے کی وجہ سے اس کی تحریر کا سٹائل دوسرے سب ادیبوں سے جداگانہ حیثیت اختیار کر جاتا ہے۔ ممتاز مفتی اور مستنصر حسین تارڑ میں بھی انہی بنیادوں پر امتیازات موجود ہیں۔

لبیک اورمنہ ول کعبے شریف میں اسلوبیاتی امتیازات

ابتدائیہ:

لبیک اورمنہ ول کعبے شریف میں موجود اسلوبیاتی اشتراکات پر ہم نے گزشتہ باب میں بحث کی۔اس باب میں ان کے اسلوبیاتی امتیازات پر بات ہوگی۔

اسلوب کیا ہے؟ اسلوب کے درمیان امتیازات کیسے پیدا ہوتے ہیں۔اور ان امتیازات کا تجزیہ کیسے کیا جاتا ہے۔اس حوالے سے سید عابد علی عابد کی کتاب ''اسلوب'' سے کچھ حوالے پیش کیے گئے۔اس باب کے آغاز میں ہم سید عابد علی عابد کی کتاب سے اسلوبیاتی امتیاز کے حوالے سے کچھ قول درج کر کے اپنے موضوع کی طرف آتے ہیں۔

انگریز مفکر لوکس کے قول کو''اسلوب'' میں بیان کیا گیا ہے۔سید عابد علی عابد لکھتے ہیں:

> بہر حال لوکس اس بات کی صراحت کرتا ہے کہ ادبی اسلوب وہ طریق کار ہے جس سے فن کار دوسروں کو متاثر کرتا ہے۔اسلوب کا مسئلہ درحقیقت شخصیت کا مسئلہ ہے۔یہی وجہ ہے کہ منطقی بنیادیں پہلے رکھی جانی چاہییں کہ خطابت و بلاغت کے اصول انہی پر مبنی ہوئے ہیں۔یہ اصول منطقی پیرایوں کے پابند ہوتے ہیں۔عقلی پیمانوں کے تابع ہوتے ہیں۔اور پڑھنے والے کو نہ اکتاتے ہیں اور نہ اسے جھنجھلاہٹ میں مبتلا کرتے ہیں۔ ۲۷

سادگی:

سادگی اسلوب کا ایک اہم عنصر ہے۔لوکس کے مطابق یہ بات مناسب نہیں ہے کہ بات معمولی اور سیدھی سادھی ہو اور اس کے لیے الفاظ مغلق اور تراکیب پیچیدہ استعمال کی جائیں۔یوں تحریر میں سادگی پیدا ہوتی ہے۔اور یہ بھی موزوں نہیں کہ فن کار اپنے قارئین کا وقت یونہی ضائع کرے۔درآں حال وہ بات کو مختصر طور پر کہہ سکتا ہو۔یہ صفت اختصار کی مثال ہے۔سید عابد علی عابد لکھتے ہیں:

> بات یہ ہے کہ جہاں بنیادی محرک یا فکر کا وہ پہلو جو بنائے ادب بنتا ہے،سادہ ہوتا ہے،اور اس میں کسی قسم کی پیچیدگی نہیں ہوتی،سادگی پیدا ہوتی ہے۔ ۲۸

لبیک کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ممتاز مفتی کے اسلوب میں سادگی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔وہ بات کو سیدھے انداز میں کہنے کے عادی ہیں۔یہ سادگی ان کے اسلوب کا حصہ بھی ہے اور خوبصورتی بھی۔کیسے سادہ الفاظ میں واقعہ بیان کر رہے ہیں۔

> گھر پہنچ کر میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ غسل کیا۔اس سے پہلے میں صرف نہایا کرتا تھا۔غسل کے بعد جب میں نے احرام پہنا تو قیصر قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔ جے نے قیصر کو ڈانٹا لیکن قیصر کب کسی کی ماننے والا تھا۔اس کے قہقہے کو سن کر میں نے دوڑ کر آئینہ دیکھا۔ سچی بات یہ ہے کہ آئینے میں اپنے آپ کو دیکھ کر میرا بھی جی چاہا کہ قہقہہ مار کر ہنسوں۔ میرے روبرو گویا ایک بہروپیا کھڑا تھا۔ چہرے پر نہ پاکیزگی تھی نہ خلوص تھا نہ خوشی تھی۔ ۲۹

اس کے برعکس مستنصر حسین تارڑ بات کو سجا سنوار کر اسے ادبی رنگ میں پیش کرتے ہیں۔ کہ پڑھنے ولا اصل واقعہ سے آگاہ بھی ہو جاتا ہے اور اسے لطف بھی حاصل ہوتا ہے۔ممتاز مفتی گھر سے احرام باندھ کر نکلے تھے جبکہ مستنصر حسین تارڑ شلوار کرتے میں ملبوس ایئر پورٹ پر گئے۔ ان کے بیٹے سمیر نے نیلی جینز اور ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ اپنی اس حالت کو انھوں نے بیان کیا تو وہ بھی بڑے خوبصورت انداز میں۔

> چنانچہ سُمیر اور میں اس ہجوم میں سراسر اجنبی تھے۔ اپنے لباس کے باعث ہم بہت برگزیدہ بھی محسوس نہیں ہو رہے تھے کہ لباس کا برگزیدگی سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔احرام پوشوں نے ہم دونوں کو شک کی نظروں سے دیکھا۔ ۳۰

اختصار:

لوکس کے بقول سادگی اور قطعیت کے ساتھ ساتھ ایک اہم اسلوبیاتی وصف ، اختصار ہے۔ اختصار کی خوبی مصنف کی شخصیت سے میل کھاتی ہے۔ایک اچھا ادیب درحقیقت یہ نہیں چاہتا کہ اس کے قارئین خوامخواہ وہ چیزیں پڑھتے جائیں جن کے بغیر بھی گزارہ ہوسکتا ہے۔ اور یوں ان کا وقت ضائع ہو۔کسی خطیب نے اپنے سننے والوں میں سے ایک صاحبِ ذوق سے پوچھا،''میری تقریر کیسی رہی'' اس نے کہا،''بہت خوب لیکن ذرا۔۔۔طویل تھی۔'' اس سے ثابت ہوا تقریر سننے والوں پر بوجھ بن گئی تھی۔

ممتاز مفتی اختصار کے عادی ہیں۔لبیک میں کئی مقامات پر ان کی اختصار نویسی سے پالا پڑتا ہے۔ بعض اوقات ان کی اختصار نویسی قاری کے ذہن میں بہت خوبصورت طریقے سے اپنا تاثر چھوڑتی ہے۔طبیعت پر بوجھ بنے بغیر ان کا نقطۂ نظر قاری کے قلب پر نقش ہو جاتا ہے۔اور یہ نقش دیرپا ہوتا ہے۔لیکن بعض اوقات ان کا یہ اختصار ایک موہوم سی تشنگی بھی چھوڑ دیتا ہے۔حرم شریف میں داخل ہوتے ہیں تو لمبی چوڑی پر مغز گفتگو نہیں کرتے اور نہ ہی اپنے قلم سے مرصع قسم کے جملے بکھیرتے ہیں۔ بلکہ انتہائی اختصار کے ساتھ لکھتے ہیں۔:''بڑے غور سے ان حسین اور عظیم دیواروں کو دیکھتا ہوا میں صدر دروازے سے حرم شریف میں داخل ہو گیا۔'' ۳۱

اس طرح طوافِ وداع کا منظر انھوں نے محض ایک ڈیڑھ صفحے میں بیان کر دیا ہے۔ جبکہ مستنصر حسین تارڑ نے طوافِ وداع کا مضمون باندھا تو پوری اسلامی تاریخ رقم کر ڈالی۔ ہاجرہ اور اسمٰعیل سے شروع ہو کر نبی

کریم ﷺ کے دور کا ذکر کیا۔ اہلِ مکہ کے مظالم کا احوال لکھا۔ اور اپنے قلب وذہن کی کیفیات کو تفصیلاً بیان کیا۔

زورِ بیان:

نثر اور نظم یا شعر میں فرق ہے تو یہ ہے کہ جہاں محرکات ایسے جذبے ہوتے ہیں جو شدید ہوں اور جو نثر کی زبان میں اچھی طرح ادا نہ کیے جاسکیں۔ ان کے لیے شعر کا قالب اختیار کیا جاتا ہے۔ شعر میں جس قوت اور قطعیت سے بات کہی جاتی ہے۔ نثر میں اسے زورِ بیان کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ایک اچھا مقرر یا اچھا مصنف عام سی بات کو زورِ بیان کے بل بوتے پر خاص بنا سکتا ہے۔

ممتاز مفتی کے یہاں زورِ بیان اتنی شدت سے نہیں پایا جاتا جتنی شدت سے مستنصر حسین تارڑ کے ہاں پایا جاتا ہے۔ ممتاز مفتی کا زورِ بیان دیکھیے۔ ایک وقت میں اتنے غصے میں آگئے کہ اپنی عاجزی اور احترام کے پردے میں سے غصیل آدمی بن کر اپنے آپ میں سے باہر نکل آئے۔ کہتے ہیں۔

> یہ آرام، یہ انگریزی ہوٹل، یہ غالیچے، یہ کرسیاں، یہ بیڈ، مجھے ان چیزوں کی ضرورت نہیں۔ یہ میری طبیعت کے منافی ہیں۔ میں نالے کے کنارے دری بچھا کر پڑا رہوں گا۔ میں عرفات پیدل چل کر جاؤں گا۔ مجھے اس مرسڈیز کی ضرورت نہیں جسے سعودی حکومت نے اپنے مہمان کے لیے وقف کر رکھا ہے۔ ۳۲

مستنصر حسین تارڑ زورِ بیان میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ ان کے سفر نامے ''منہ ول کعبے شریف'' میں ان کے زورِ بیان کی مثالیں بارہا ملتی ہیں۔ ان کا یہ انداز ممتاز مفتی سے ایک الگ ہی اسلوب لیے ہوئے ہے۔ وہ بات کو مثال سے واضح کرتے ہیں مثال سے تشبیہ دیتے ہیں اور مثال سے سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی مثالوں میں زورِ بیان جھلکتا ہے۔ ایک جگہ ہجوم میں چلنے کی کیفیت یوں مثال دے کر سمجھاتے ہیں۔

> ہزاروں لوگوں کے اجسام کی قربت بھی تھی لیکن گراں نہ گزرتی تھی۔۔۔ بہاؤ میں بہتے ایک ذرے کو دوسرے ذروں کی نزدیکی کیسے گراں گزر سکتی ہے۔ ۳۳

اسی طرح ایک اور جگہ پر ان کی اعجاز بیانی کا اسلوب ملاحظہ کیجئے۔ جب انھوں نے بابِ ملتزم میں سے خانہ کعبہ کے اندر قدم رکھا تو زورِ بیان دیکھیے۔

> البتہ سب میں ایک کیفیت مشترک ہوتی ہے۔۔ سب لوگ رو رہے ہوتے ہیں۔۔ بلند آواز میں نہیں۔۔ اپنے اندر ہی اندر۔۔ کہ آنسوؤں کے گرنے کی آواز نہیں ہوتی۔۔۔ فانی انسانیت، ابدیت کے ذائقے سے آشنا ہوتی ہے۔ ۳۴

بذلہ سنجی:

سفرنامے کے اسلوب میں ایک اہم چیز بذلہ سنجی ہے۔ زیادہ تر سفرنامہ نگار بذلہ سنج ہوتے ہیں۔ وہ عملی طور پر بھی اور لکھتے وقت بھی اپنی اس عادت سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہیں۔ بات کو لطیف پیرائے میں لے کر اس مے سے کوئی ایسا باریک نقطہ اٹھا کر بات کرنا کہ جس سے پڑھنے سننے والے کے لبوں پر مسکراہٹ رینگ جائے، بذلہ سنجی کہلاتی ہے۔

ممتاز مفتی کے سفرنامے لبیک میں انھوں نے کئی مقامات پر اپنی اس صفت سے کام لینے کی کوشش کی ہے۔ لیکن بات ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھ پاتی۔ ان کی بذلہ سنجی میں سنجیدگی غالب رہتی ہے۔ جبکہ مستنصر حسین تارڑ میں یہ حس بہت اعلیٰ معیار کو جا کر چھوتی ہے۔ ان کی بذلہ سنجی ایک مخصوص معیار قائم کرتی ہے۔ جو شفیق الرحمن، مشتاق احمد یوسفی اور پطرس بخاری کے معیار سے جا ٹکراتی ہے۔ لبیک میں ممتاز مفتی کی بذلہ سنجی کی مثال دیکھیے۔ جب مکہ میں قدرت اللہ شہاب کے پیٹ میں خرابی ہوئی تو ڈاکٹر عفت میڈیکل سٹوروں پر اسپغول ڈھونڈ رہی تھیں۔ کہنے لگیں۔

> ایلوپیتھی میں کوئی حتمی دوا نہیں۔ عارضی آرام کی دوائیں ہیں۔ ان سے بیماری نہیں جاتی۔ آپ فلاں آیت کا ورد کیا کریں ان شاء اللہ شفا ہوگی۔ میری آزمودہ ہے۔"
>
> میں نے کہا، "ڈاکٹر! آہستہ بولیے۔ اگر میڈیکل کونسل کے کسی رکن نے سن لیا تو وہ آپ کا لائسنس ضبط کر لیں گے۔" یہ کہہ کر میں قہقہہ مار کر ہنسا۔ ؎۳۵

ممتاز مفتی کی یہ بات ظرافت کے رنگ میں ہے۔ لیکن بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ ایک سطحی مذاق سا لگتا ہے۔ اس میں لطافت کم ہے اور ظرافت زیادہ۔

مستنصر حسین تارڑ کے ہاں بذلہ سنجی اعلیٰ ترین ہے۔ ان کی ظرافت پڑھ کر دل خوش ہوتا ہے۔ ذہن کے شعور میں نہیں بلکہ لاشعور کے کسی گوشے میں سرشاری کا احساس ہوتا ہے۔ حج کے متعلق مشورہ لینے کے لیے جب وہ اپنی بیوی سے رجوع کرتے ہیں تو وہاں ایک جملہ لکھتے ہیں۔۔

> ۔۔۔اور زندگی میں پہلی بار دین کے معاملے میں رجوع کیا، جو گزشتہ رجوع سے مختلف نوعیت کا تھا۔ یوں بھی اتنے اہم دینی معاملات زندگی میں پہلی بار سامنے تھے۔ ؎۳۶

اسی طرح بارہا مقامات پر انھوں نے اپنی بذلہ سنجی کو استعمال کیا اور صفحۂ قرطاس پر رنگینی بکھیری۔ عید الاضحیٰ سے فارغ ہو کر سر کے بال منڈوانے کا مرحلہ آیا تو مستنصر حسین تارڑ نے عجیب انداز میں اس سارے عمل کا نقشہ کھینچا ہے۔ اس عجیب انداز میں ان کی بذلہ سنجی غالب رہی۔ ان ناتجربہ کار حجاموں کے ہاتھوں لوگوں کے

سروں کی درگت بن رہی تھی۔ لکھتے ہیں:

سینکڑوں آرٹسٹ کہیں تربوز تخلیق کر رہے ہیں، جو لمبوترے ہیں۔ کہیں خربوزے سے نمودار ہو رہے ہیں۔ اور کہیں چپکے ہوئے کدو ہیں تو کہیں شاندار شکل کے ایسے فٹ بال تراشے جا رہے ہیں، جو ورلڈ کپ کے پیانوں پر اترتے ہیں۔ اور کہیں عجیب سے بینگن بھی ظاہر ہو رہے ہیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے ہم نیشنل کالج آف آرٹس کی مجسمہ سازی کی کسی کلاس میں آنکلے ہیں۔ ۳۷

تشبیہات:

سید عابد علی عابد لکھتے ہیں۔۔دو چیزوں میں مشابہت کے اظہار کے لیے علامتیں استعمال کی جاتی ہیں۔ ان علامتوں سے اصل حقیقت تک پہنچنے کے لیے تشبیہ کا رشتہ استعمال کرنا پڑتا ہے۔ یہی وہ عمل تخلیق ہے جسے تشبیہات سے تعبیر کیا جاتا ہے۔لبیك اورمنه ول کعبے شریف میں تشبیہات کا استعمال جا بجا کیا گیا ہے۔ممتاز مفتی ہاں یہ عنصر خال خال ہی ملتا ہے۔ وہ بات کو کسی دوسری بات سے ملانے کی بجائے اصل بات کہہ کر آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسے لگتا ہے جیسے انھیں کوئی جلدی ہے۔ مثال کے طور پر جب زائرین لاہور ایئر پورٹ سے طیارے میں سوار ہوتے ہیں۔ طیارہ محوِ پرواز ہوتا ہے تو طیارے میں تقدس بھی خاموشی چھا جاتی ہے۔ چہروں سے ولولہ ختم ہو جاتا ہے۔ یہاں ممتاز مفتی تشبیہ کا استعمال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:''ایسے لگتا تھا جیسے سرزمین حجاز کو نہیں جا رہے بلکہ طیارہ ہائی جیک ہو چکا ہے۔''۳۸

وہ ایک جملے میں تشبیہ کو بیان کرتے ہیں اور اگلے جملے کی طرف توجہ مرکوز کر لیتے ہیں۔ اسی طرح مطاف میں سنگِ اسود کو بوسہ دینے کے لیے دھکم پیل کو تشبیہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:''ہر کوئی دوسرے کو پیچھے کی طرف دھکیل رہا تھا۔ اپنا راستہ بنانے کے لیے یوں کندھے مار رہا تھا جیسے مطاف فٹ بال گراؤنڈ ہو۔''۳۹

یہ چھوٹی چھوٹی تشبیہیں لبیك میں کئی مقامات پر نظر آتی ہیں۔

مستنصر حسین تارڑ کے ہاں تشبیہات کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ ملتا ہے۔ وہ تشبیہ کو دور تک لے کے چلتے ہیں۔ علامتوں کا ایک دریا بہنے لگتا ہے۔ اور بات کہیں سے کہیں جا پہنچتی ہے۔ ان علامتوں، تشبیہات اور استعارات میں ان کا روایتی اسلوب جھلکتا ہے، خوبصورت ہے اور قارئین کی حسِ لطیف کے لیے باعثِ تسکین ہے۔ مثال کے طور پر حرم میں بیٹھے ہوئے ان کی نظر پرندوں کے غول پر پڑتی ہے جو صحنِ حرم میں اترتا ہے۔ ان کبوتروں کو وہ کیسے صفتِ تشبیہ کے استعمال سے 'انجن' دکھا رہے ہیں۔

ان کے غول کے غول اترتے تھے۔ بے آواز اور بے شور جیسے بغیر انجن کے سیاہ گلائڈر ہوں جو

> ہوا میں جھولتے آرہے ہوں۔ ان میں سے کوئی ایک غول یکدم صحنِ حرم میں ڈائیو لگاتا اور خانہ کعبہ کے گرد ایک نصف دائرہ بنا کر پرواز کرتا بلند ہو جاتا۔ [۴۰]

اسی طرح وہ تشبیہات کا ایک سلسلہ چلا دیتے ہیں۔ ایک مضمون کا بیان کر رہے ہوں تو اس میں دو دو چار چار تشبیہات لے آتے ہیں۔ حرم سے مسجد نمرہ تک کے سفر کے بیان میں وہ اس قدر رش اور ہجوم میں گھرے ہوئے ہیں کہ اس کو بیان کرتے ہوئے ان کے قلم میں وہی کیفیات نمودار ہو جاتی ہیں جو اُس وقت ان کے ذہن وقلب میں تھیں۔ انہیں کیفیات کے اظہار کے لیے وہ کیسے تشبیہات کا استعمال کرتے ہیں ملاحظہ کریں:

> لاکھوں سارڈین مچھلیوں میں پانچ اور پیک شدہ مچھلیوں کی طرح۔۔جڑے ہوئے، پسینے میں بھیگے ہوئے۔۔چلتے تو کیا تھے، دھکے کھاتے، رکتے، پھر سے رواں ہوتے، ایک ایسی کار کی مانند جس کا پٹرول ختم ہونے کو ہو۔ ویسے ہچکیاں بھرتے، رکتے، پھر سے سٹارٹ ہو جاتے۔ [۴۱]

اسی طرح کی اور بہت سی مثالیں، منہ ول کعبے شریف میں موجود ہیں۔ ان کا یہ اسلوب ممتاز مفتی کے اختصاری اسلوب سے یکسر مختلف ہے۔ ممتاز مفتی تشبیہات کا استعمال کرتے ہیں لیکن اجمالاً۔ مستنصر حسین تارڑ کے ہاں تشبیہات کا دریا بہنے لگتا ہے۔ وہ اس صفت کو اپنے ناولوں، ڈراموں اور سفرناموں میں بھی استعمال کرتے ہیں۔ منہ ول کعبے شریف میں ان کے اسلوب کا یہ انداز نمایاں نظر آتا ہے۔

اثر آفرینی:

اثر آفرینی سے مراد یہ ہے کہ سفر کرنے والے نے کس کس چیز سے اثر قبول کیا، اور کس کس شخصیت کی چھاپ اس کے قلب پر لگی۔ رستے میں کون کون سے واقعات نے اس کی زندگی اور شخصیت پر گہرے نقوش مرتب کیے۔ ایک سفرنامہ نگار اپنے سفر کے دوران میں پیش آنے والی اس طرح کی باتوں کا تذکرہ دانستہ یا نادانستہ طور پر ضرور کرتا ہے۔ لبیک میں ممتاز مفتی نے کئی ایسے لوگوں کا تذکرہ کیا جن سے انھوں نے اثر قبول کیا۔

سب سے پہلے فوارہ چوک پر ملنے والا وہ فقیر جس کے بال بکھرے ہوئے اور چہرہ بھیانک تھا۔ اس نے ممتاز مفتی کو روک کر کہا کہ ''تو حج پر جائے گا''۔ اس کی اس بات کا اثر ان کے دل پر ہوا۔ اور وہ خوابوں میں حج پر جانے کی بشارتیں وصول کرنے لگے۔ دوسری شخصیت جس سے انھوں نے ہر موقع پر اثر قبول کیا، بلکہ اس شخصیت کو ممتاز مفتی نے ایک ولی اللہ کی طرح پینٹ کیا، وہ قدرت اللہ شہاب کی ہے۔ انھوں نے ممتاز مفتی کو حج کے بارے میں معلومات دیں، اور بعد میں تمام تر مدد کی۔

قدرت اللہ شہاب، ہالینڈ میں سفیر بن کر چلے گئے تو کچھ عرصے کے لیے حج کا پروگرام رک گیا۔ ہالینڈ سے انھوں نے خط لکھا کہ ''مفتی! حج پر جانے کی تیاری کرو''۔ حج پر بھی قدرت اللہ شہاب اور ان کی بیوی ڈاکٹر عفت ممتاز مفتی کے ساتھ ساتھ رہے۔ قدرت اللہ شہاب کے بارے میں لکھتے ہوئے ان کا انداز عاجزانہ اور مودبانہ ہو جاتا ہے۔ لکھتے ہیں:

> قدرت اللہ ایسے تپسوی ہیں جو کھلی آنکھوں سے دھیان لگاتا ہے۔ اور ساتھ ہی نرتکی کو کانی آنکھ سے دیکھتا بھی جاتا ہے مگر اس کا دھیان نہیں ٹوٹتا۔ ۴۲

اسی طرح ستائیسویں شب میں جب قدرت اللہ ساری رات نوافل پڑھتے رہے تو ممتاز مفتی انھیں دیکھ کر حیران ہوتے رہے۔ لکھتے ہیں:

> نفل پڑھتے ہوئے قدرت کے قیام اتنے لمبے تھے کہ مجھے سمجھ میں نہ آتا کہ وہ کھڑے ہو کر کیا کیا کچھ پڑھتے ہیں۔ اس کے علاوہ حیران کن بات یہ تھی کی قدرت کے کھڑے ہونے کا انداز عجیب تھا۔ اس میں عجز، ندامت، گناہ گاری، اور توبہ کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے۔ ۴۳

اور بھی کئی مقامات پر انھوں نے قدرت اللہ شہاب سے متاثر ہونے کا ذکر کیا ہے۔ اثر آفرینی ایسا عنصر ہے جو نادانستہ طور پر بھی ادیب کے اسلوب کا حصہ بن جاتا ہے۔

مستنصر حسین تارڑ کے ہاں اثر آفرینی ممتاز مفتی سے بالکل مختلف ہے۔ انھوں نے کسی شخص کو اس طریقے سے پینٹ نہیں کیا۔ البتہ ان کے بیٹے ہر جگہ ان کے ساتھ موجود تھے۔ جو ان کے لیے گائیڈ، رہنما، خدمت گزار اور فرزندانِ ارجمند سب کچھ تھے۔ مستنصر حسین تارڑ کے اسلوب میں شخصی اثر آفرینی کم ہے اور مقاماتی اثر آفرینی زیادہ ہے۔ وہ علاقوں سے، عمارتوں سے، تاریخی حوالوں سے، شہروں کی عظمت سے اور مجموعی طور پر لوگوں کے رویوں سے اثر قبول کرتے ہیں۔ وہ کسی ایک شخص کو اپنا آئیڈیل نہیں بناتے بلکہ ہر چھوٹے بڑے کردار کے ساتھ ان کا تعلق ہے۔ وہ سب کے ساتھ یکساں انداز میں ملتے جلتے ہیں۔

جدہ سے مکہ جاتے ہوئے کیسے پُرشکوہ پہاڑیوں اور پُر ہیبت سڑکوں سے متاثر ہوتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

> اس لمحے رات کا ایک بج رہا تھا جب شاہراہ کے دونوں جانب اندھیرے میں چند سیاہ پہاڑیاں تاریکی میں سے اٹھیں اور واضح ہو گئیں۔ اور ان کے درمیان میں شاہراہ کے اختتام پر مکہ کی پہلی روشنیاں ٹمٹمانے لگیں۔ ۴۴

معرفت:

حج کے سفرنامے میں معرفت کا ذکر نہ ہو یہ ممکن نہیں۔ معرفت سے مراد ذاتِ خدا کا عرفان، حق کی

پہچان اور قلبی کیفیات کے توحید و رسالت کے عشق میں ڈوبنے کا نام ہے۔

لبیک اور منہ ول کعبے شریف میں معرفتِ الٰہی کا ذکر موجود ہے لیکن جداگانہ انداز میں۔ ممتاز مفتی ایک ایسے مسلمان ہیں جو ایک وقت میں خدا کے وجود سے بھی انکاری تھے۔ لیکن بتدریج وہ تبدیل ہوتے گئے۔ لبیک کے دیباچہ میں وہ خود لکھتے ہیں کہ ''اللہ کا کرم ان دنوں میں بھی تھا جب میں خدا کے وجود کا منکر تھا اور خدا کے متعلق ان کے ذہن میں شکوک وشبہات تھے، اور ان دنوں میں بھی جب میری سوچ اس نہج تک آ گئی ہے کہ میرا خدا میرے لیے جاگ رہا ہے، تاکہ میری ضرورتیں پوری ہوتی رہیں۔ میرے مسائل حل ہوں، اور میرے دل کا سوتا سوکھ نہ جائے۔

ممتاز مفتی نے خدا کی ذات کو ایک نئے انداز سے لیا۔ وہ یہ کہ خدا جب اتنا مہربان ہو تو بندہ اس کی محبت میں سرشار ہو کر اس سے لاڈ کرنے لگتا ہے۔ اور اس سفرنامے میں بھی میں نے کئی جگہ اپنے اللہ میاں سے لاڈ کیے ہیں۔ خدا کے وجود سے انکار سے لے کر خدا سے لاڈ کرنے تک کا یہ سفر انھوں نے کیسے کاٹا۔ اس کا ذکر تو لبیک میں مفصل نہیں ملتا۔ ایک جاہل، انجان زائر کے دل میں اٹھنے والے سوالات کے جوابات انھیں ایک خود بخود حاصل ہونے والے عرفان سے ملتے گئے۔ جس کا ذکر لبیک میں بارہا مقامات پر ملتا ہے۔ یہی معرفت ہے۔

طوافِ کعبہ کے وقت ممتاز مفتی نے آیات پڑھنے کے لیے کتاب کا سہارا لیا۔ وہ کہتے ہیں کہ میرے سامنے کتاب تھی اور باقی سب کچھ غائب ہو گیا۔ وہ کتاب میرے اور خانۂ خدا کے درمیان رکاوٹ بن رہی تھی۔ خانہ کعبہ کے اوپر سے جھانکنے والا وہ مسکراتا چہرہ بھی کتاب کی اوٹ میں آ گئے۔ انھوں نے غصے میں کتاب پھینک دی۔ یہاں ان کا معرفتِ الٰہی سے بھرپور تعارف ہوتا ہے۔ لکھتے ہیں:

> اب میرے اور میرے اللہ کے درمیان کچھ حائل نہ تھا۔ نہ پہلا چکر نہ دوسرا نہ تیسرا نہ کوئی مقام محمود تھا نہ مقامِ ابراہیم۔ پہلی بار میرے اللہ میری خاطر اس بے ڈھب سے کوٹھے میں محدود ہو گئے۔ پہلی بار میری خاطر، میرے اللہ ایک جسم میں مقید ہو گئے تھے۔ پہلی بار میرے اللہ میری خاطر بُت بن گئے تھے تاکہ میرے دل میں چھپے ہوئے بت پرست کی تسکین ہو سکے۔ میرے اللہ میرے روبرو تھے اور میں ان کے گرد والہانہ گھوم رہا تھا۔ ۴۵

''لبیک'' عام حاجی کا سفرنامہ نہیں یہ تو ایک صاحبِ دل کا روحانی سفر ہے۔ دل اور نظر کے پردے اٹھا دینے والی داستان ہے۔ علامتوں کا ایک سلسلہ ہے۔ معرفتِ الٰہی سے روشناس ہونے کا اہم ذریعہ ہے۔

میدانِ عرفات میں پہنچتے ہیں تو ان کے دل میں ایسا جوش اور ولولہ پیدا ہوتا ہے کہ خوشی سے دھمال ڈالنے کو دل کرتا ہے۔ انھیں ایسا لگتا ہے جیسے خدا کی ذات خود ان لاکھوں زائرین کے ہجوم میں، میدانِ عرفات

میں موجود ہو۔ انہیں معرفتِ الٰہی سے آشنائی مل رہی ہے۔ فرماتے ہیں۔

> زائرین۔۔۔اپنی اپنی تسبیحیں پھینک دیں نوافل پڑھنا بھول جائیں۔ اور پھر ہم سب مل کر اس کو ڈھونڈ نکالیں، جس کے حکم پر ہم سب وہاں حاضری دینے آئے تھے۔ ہمیں حاضری کا حکم دینے کے بعد وہ خود ہم میں شامل ہو گیا تھا۔ اور ہمیں میں چھپا بیٹھا تھا۔ ۴۶؎

مستنصر حسین تارڑ کے یہاں معرفتِ الٰہی کے بیان موجود ہیں لیکن ان کا انداز ممتاز مفتی سے یکسر مختلف ہے۔ مستنصر حسین تارڑ خدا کے وجود سے انکاری نہیں تھے۔ اور نہ ہی ان کے دل میں ذاتِ خدا سے متعلق شکوک وشبہات تھے۔ وہ مکمل مسلمان ہیں۔ لیکن اس بات کا اظہار بارہا کرتے ہیں کہ میں نے زندگی میں کبھی پانچ نمازیں باقاعدگی سے نہیں پڑھی تھیں۔ انھیں ذاتِ الٰہی پر کامل یقین پہلے سے ہے صرف اعمال کی کمی ہے۔

اپنی معرفت سے متعلق وہ اس طرح کے بیان نہیں دیتے کہ انھیں پہلے بار خدا سے تعارف ہو رہا ہے بلکہ ان کا انداز ممتاز مفتی سے بہت مختلف ہے۔ وہ اس طرح کی کیفیات بیان کرتے ہیں جیسے ان کے وجود کو تحلیل کر کے دوبارہ بنایا جا رہا ہو اور اس نئی تعمیر میں کچھ نئی خصوصیات پیدا ہو گئی ہوں۔

> اس دوبارہ تعمیر سے بعض اوقات خرابی کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور وہ مشینری جو ایک عرصے سے بے آواز چلتی آ رہی تھی، اب گھر رگھر کرنے لگتی ہے۔ اور کئی بار یہ ایک اور مشین ہو جاتی ہے۔ اس کے چلنے کا انداز مختلف ہو جاتا ہے۔۔۔ تو یہاں ایسا ہی ہوا تھا کہ میں کھول کر دوبارہ جوڑا گیا تھا۔ تبھی تو میں وہ نہ تھا۔ جو میں ہوا کرتا تھا۔ ۴۷؎

اسی طرح خدا کی ذات کو اپنے سامنے جس طرح انھوں نے میدان عرفات میں محسوس کیا ویسے اور کہیں نہیں کیا۔ وہ محسوس کرتے ہیں جیسے لاکھوں زائرین جن کی گردنیں جھکی ہوئی ہیں اور آنسو جاری ہیں۔ ان کے سامنے خدا خود آن بیٹھا ہے۔ لکھتے ہیں:

> تو اپنے سنگھاسن سے اتر کے صرف ایک ذرے کی دلجوئی کی خاطر۔۔۔ میرے سامنے آ بیٹھا ہے اور کان لگائے کبھی مسکراتا ہے، کبھی میری سادہ لوحی اور بہانہ سازی پر ہنستا ہے۔ اور کبھی تو قہار اور جبار ہو جاتا ہے۔ لیکن جو بھی تیری ادا ہو۔ قہر کی ہو یا مہر کی تُو صرف میری ہی بات سن رہا ہے۔ ۴۸؎

خدا کی ذات کا یہ عرفان لبیک سے مختلف ہے۔ مستنصر معرفت کی اس نہج پر جا پہنچتے ہیں کہ وہ یہ دیکھتے ہیں کہ خدا اپنا گھر کھلا چھوڑ کر پچیس ساکھ لوگوں کی عرضیاں وصول کرنے، کھلی کچہری لگانے آ گیا ہے۔ ہر ذرے کی، ہر فرد کی فریاد خود سنتا ہے۔ عرضیاں وصول کر کے ان پر قبولیت کی مہریں لگاتا ہے۔ ہر شخص کی آنکھوں میں

آنکھیں ڈال کر، اس کی پکار سنتا ہے۔ وہ خدا کی ذات کو ایسے محسوس کرتے ہیں جیسے وہ کوئی خیال نہ ہو بلکہ ایک ٹھوس وجود میں براہِ راست آمنے سامنے محسوس کرتے ہیں۔ ہاتھ پھیلائے لاکھوں محتاج اور فقیر اللہ تعالیٰ کو اپنے گھر سے نکل آنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ کا معرفت کا یہ نویکلا انداز ہے۔

تاریخی حوالے:

لبیک اور منہ ول کعبے شریف میں اسلوبیاتی اشتراکات کا بغور مطالعہ کرتے ہوئے ہمیں اس بات کا ادراک بھی ہوتا ہے کہ دونوں سفرناموں کے اسلوب میں اور اہم امتیاز یہ بھی ہیں کہ لبیک میں تاریخ کے حوالے بہت کم دیئے گئے ہیں۔ بلکہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ جبکہ منہ ول کعبے شریف میں ہر مقام اور ہر مناسکِ حج کے بارے میں تاریخی معلومات دی گئی ہے۔ ان کی وجہ تسمیہ بیان کی گئی ہے۔ بعض اوقات کئی کئی صفحات پر مشتمل اسلامی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ ان اسلامی تاریخی حوالوں سے ایک تو حج کا یہ سفرنامہ لوگوں کے لیے اہم معلوماتی کتاب بھی بن جاتا ہے دوسرے ان حوالوں سے قارئین کو مناسکِ حج کے فلسفہ سے آگاہی بھی ہو جاتی ہے۔ تیسرے اس سے سفرنامہ کی ضمانت میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہوتا ہے۔

لبیک میں ممتاز مفتی کو کسی مقام پر کوئی حوالہ یاد آتا بھی ہے۔ تو وہ شیخ سعدی کا، ارسطو کا، لاہور کے کسی حلوائی کا، چوک میں کھڑے فقیر کا یا پھر قدرت اللہ شہاب کا۔ یا پھر انبالے کے فقیر کا۔ جو صبح سویرے جنا داس پوری والے کی دکان پر جا کھڑا ہوتا دو آنے کا حلوہ خرید کر ہاتھ پر رکھ لیتا اور سارے شہر میں چکر لگاتا بار بار لوگوں سے پوچھتا تو حلوہ کھائے گا۔ شام ہوتی تو وہ حلوہ کتوں کا ڈال دیتا۔ قہقے مار کر ہنستا تو اس کی آنکھوں میں آجاتے۔

انھوں نے ایک مسلمان لڑکی حمیدہ کا واقعہ بھی قلمبند کیا ہے۔ جسے تقسیم کے وقت سکھ اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ اسے سکھ کی بیوی بنا دیا گیا۔ وہ حمیدہ کور بن گئی۔ وہاں وہ سکھ کے بچوں کی ماں بن گئی۔ ایک وقت ایسا آیا جب وہ بھاگ کر پاکستان آگئی۔ لیکن اسکے ماں باپ نے اسے قبول نہ کیا۔ اس نے مدینہ جانے کی ٹھانی لیکن زادِ راہ نہ تھا۔ اس نے جسم فروشی شروع کر دی۔ پیسے اکٹھے کر کے عازمِ مدینہ ہوئی۔ راستے میں خیال آیا کہ کیسے ناپاک جسم کے ساتھ وہاں جاؤں گی۔ روتے روتے ہچکی بندھ گئی۔ سوئی تو خواب میں رسول ﷺ کی زیارت ہوئی۔ سرکار نے فرمایا:

''اٹھو حمیدہ ملال نہ کرو۔ دیکھو تو تمھارا جسم کتنا پاکیزہ ہے''

حمیدہ نے دیکھا اس کا جسم منور تھا۔ اسے ہوش آیا تو اس نے خود مسجدِ نبوی میں پایا۔ کہتے ہیں کہ وہ آج تک وہیں ہے۔ اسی طرح انگریزی لوک کہانی ''گلیورز ٹریولز'' میں سے حوالہ دیتے ہیں۔ گلیور جو کہ ایک بہت بڑا انسان تھا۔ اسے بالشتیوں نے قید کر لیا تھا۔ وہ خود کو گلیور محسوس کر رہے تھے۔ لکھتے ہیں۔

۔۔۔اس وقت میری کیفیت گلیور کی سی تھی۔گلیور پاکیزگی کے رسوں سے بندھا ہوا تھا۔اور وہ بالشتنی تھی۔ جو اپنی کمان سے ننھے ننھے تیر برسارہی تھی۔ پھر ایک عجیب کایا پلٹ عمل میں آئی۔ پاکیزگی کے وہ رسے جن سے میرا بند بند بندھا ہوا تھا۔ایک ایک کرکے ٹوٹ گئے۔ان کے ٹوٹتے ہی گلیور سکڑنے لگا،سکڑتا ہی چلا گیا اور بالشتنی پھیلنے لگی۔پھیلتی ہی چلی گئی حتیٰ کہ میں بالشتیہ میں بدل کر رہ گیا اور وہ گلیور بن کر سارے جہاز پر چھا گئی۔[۴۹]

غرض یہ کہ ممتاز مفتی نے تاریخ میں سے حوالے دیئے تو ہیں لیکن ان میں سے زیادہ تر ایسے ہیں جو زبانی سنے سنائے ہیں۔ یا ان کی یاد داشت میں محفوظ کوئی پرانے واقعات ہیں۔ان حوالوں کی کوئی مستند تاریخی سند موجود نہیں ہے۔ وہ ایسی باتیں جو اکثر لوگ اپنے بڑوں سے سنا کرتے ہیں اور من وعن اپنے بچوں تک وہی باتیں پہنچا دیتے ہیں۔ان کو تاریخ کی کتابوں میں سے حوالوں کے ساتھ ڈھونڈنے کی زحمت نہیں کرتے۔

جبکہ ان کے برعکس مستنصر حسین تارڑ تاریخ کے حوالے دیتے ہیں تو ایسے واقعات سے دیتے ہیں جو اکثر پڑھے لکھے لوگوں نے کہیں نہ کہیں پڑھ رکھے ہوتے ہیں۔ وہ کسی کتاب میں موجود ہوتے ہیں یا مذہبی پیشوا کی لکھی ہوئی کتب میں حوالوں کے ساتھ موجود ہوتے ہیں۔ وہ سعودی عرب کے تمدن کا احوال بیان کرتے ہیں تو بتاتے ہیں کہ کچھ عرصہ پہلے عرب کے لوگوں کو سختی سے،بید کی چھڑی کے استعمال سے نماز کے لیے مجبور کیا جاتا تھا۔

عرب میں سزائے موت دینے والے جلادوں کے بیانات انھوں نے مقامی اخباروں سے حاصل کیے اور ایسے ایسے واقعات سنائے کہ پڑھنے والا دنگ رہ جائے۔ابابیلوں کا ذکر کیا تو عام الفیل کا حوالہ دیا۔ یہ واقعہ قرآن پاک میں ہے۔ابرہہ کی ہاتھیوں کی فوج کو تباہ کرنے کا سارا تاریخی واقعہ مستنصر حسین تارڑ نے لکھا۔

خانہ کعبہ کی چابی عثمان بن طلحہ کے پاس تھی۔اس نے رسول اللہ کو چابی دینے سے انکار کیا۔جس پر اس کی ماں نے اس کی سرزنش کی۔ یہ واقعہ تاریخی اور اسلامی کتب میں مستند حوالوں کے ساتھ موجود ہے۔حضرت ابراہیمؑ کا ہاجرہ اور حضرت اسمٰعیلؑ کو لق و دق صحرا میں چھوڑ آنے کا واقعہ سب کو معلوم ہے۔لیکن مستنصر حسین تارڑ نے اس واقعہ کو علی شریعتی کی کتاب کے حوالے سے پھر سے قارئین کی نذر کیا۔ ہاجرہ کی سعی،اسمٰعیل کی پکار، ابراہیم کے خواب،اسمٰعیل کی قربانی اور سارا واقعہ بیان کیا۔

مسجدِ نبوی کے تعمیری پہلو پر غور کرتے ہوئے انھوں نے مسجدِ قرطبہ کی بات شروع کر دی تو وہاں کا نقشہ بھی بیان کر دیا۔ وہاں کے منبر پر موجود موزیک کے ٹکڑوں کا بتایا جہاں ایک دیا سلائی جلانے سے ہزاروں رنگین پھول جھڑنے لگتے ہیں۔

مدینہ منورہ میں سرکارِ دوعالم کی آمد کا واقعہ قلم بند کرتے ہیں تو جزئیات میں چلے جاتے ہیں۔آپ ﷺ

کی اونٹنی 'قصویٰ' کیسے مدینہ کی گلیوں گھومتی گھومتی ایک جگہ پر بیٹھ گئی جہاں حضرت ابوایوب انصاری کو سرکار کی میزبانی کا شرف حاصل ہوا۔

مسجدِ نبوی کے صحن میں ستونوں کی ایک قطار پر نظر پڑی جسے صفہ کہا جاتا ہے۔تو انھوں نے سارا منظر قلمبند کر دیا کہ کیسے وہاں بے آسرا لوگوں کو سرکار نے رہنے کی اجازت دی اور انھیں اسلامی خدمت کے لیے تیار کرتے۔ مستنصر حسین تارڑ نے ابوعبیدہ بن جراح ،حضرت بلال،ابو ذر غفاری، ابو ہریرہ،عبداللہ بن مسعود عمار بن یاسر جیسے صحابہ کرام کی زندگی کے حالات کا ذکر ان کے رفقاء کے ناموں سمیت اور ان کے مزارات کے بارے میں معلومات فراہم کرتے ہوئے کہا ہے۔ ابوعبیدہ بن جراح کے متعلق لکھتے ہیں:

> ابوعبیدہ۔۔جنگِ احد کے دوران حضور کے خود کے دندانے رخساروں میں دھنس جاتے ہیں۔ اور وہ شدید زخمی ہوجاتے ہیں۔ ابوعبیدہ اپنے دانتوں سے حضور کے رخساروں میں پیوست دندانے کھینچ کر نکالتے ہیں تو اس تردد میں ان کے اگلے دو دانت ٹوٹ جاتے ہیں۔اور ایک خلا پیدا ہو جاتا ہے۔اس لیے۔۔جراح۔۔۔خلا والا۔۵۰؎

حاصلات:

لبیک اور منہ ول کعبے شریف کے تقابلی جائزے میں ہم نے ان دونوں سفرناموں کے مصنفین کے بارے میں خاطر خواہ معلومات حاصل کیں۔ سب سے پہلے اردو میں سفرناموں کی روایت پر غور وخوض کیا۔ اردو کے قابلِ ذکر سفرناموں کا ذکر ان کے مصنفین کے مختصر احوال کے ساتھ کیا۔ ان سفرناموں میں سے اقتباسات بھی پیش کیے گئے۔

لبیک پر بات کرنے سے قبل ہم نے اس کے مصنف ممتاز مفتی کے حالات زندگی پر شواہد اکٹھے کیے۔ ان کی ذاتی اور ادبی زندگی پر سیر حاصل بحث کی۔ مستنصر حسین تارڑ کے احوالِ زندگی پر معلومات اکٹھی کیں تو پتہ چلا کہ وہ بیک وقت کوہ پیما،سیاح، اداکار،کمپیئر،ناول نگار اور اردو ادب کے عظیم سفرنامہ نگار ہیں۔ ان کے سفرنامے دنیا کے مختلف ممالک کی سیر پر مبنی ہیں۔ خاص طور پر ان کے سفرناموں نے پاکستان کے شمالی علاقہ جات کی سیاحت کے فروغ میں کلیدی کردار ادا کیا۔ممتاز مفتی نے حج کے سفرنامے لبیک کے علاوہ صرف ایک اور سفرنامہ لکھا جس کا نام 'ہندیاترا' ہے۔

ان کے سفرنامۂ حج 'لبیک' سے ہمیں ان کی ذاتی زندگی اور شخصیت کے بارے میں جاننے کا موقع ملا۔ وہ سادہ اور دلچسپ اندازِ تحریر کے مالک ہیں۔ وہ ایک جاہل گنوار،اور دنیادار مسلمان کی حیثیت سے حج پر گئے۔ عام مسلمان کے دل میں عام سے جذبات ہوتے ہیں۔ وہی انھوں نے بیان کیے ہیں۔کوئی لگی لپٹی نہیں کہیں۔ بلکہ واشگاف الفاظ میں اپنی کم مائیگی اور اپنے ایمان کی ناخالص پن کو دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔لیکن طوافِ

کعبہ، مطاف، وقوفِ عرفات منیٰ میں مدینہ منورہ میں سنہری جالیوں کے پاس ان کے جذبات نے ایسی بوقلمونی کے مظاہرے کیے جوان کے قلم کی نوک سے ندرت آفریں تحریر بن کر نکلے۔ انھیں خانہ کعبہ کی چھت سے روشن ،ہنستا ،مسکراتا چہرہ بار بار دکھائی دیتا تھا۔ طواف کے دوران میں اپنا وجود ریزہ ریزہ ہوتا اور پھر سے جڑتا محسوس ہوا۔ عورت کے وجود سے یکسر لاعلمی اور لاتعلقی ہوگئی۔ دعاؤں ،عبادات ،تسبیحات ، ذکر اذکار، کے موضوع پر کھل کر بات کی۔ عقیدت میں ڈوبے ہوئے جملے، شوقِ دیدارِ خدا میں اٹھتے ہوئے قدم۔ قدم قدم پر صعوبتوں کے انبار ،انسانوں کا ہجوم عظیم، اس عظیم ہجوم میں دھکم پیل ، بدنظمی ، جمروں کو مارنے کے لیے تاریکی میں کنکریوں کی تلاش، پتھروں اور چٹانوں پر چڑھنے کے لیے مشکل اور پر پیچ راستے ،گلی کوچوں ،سڑکوں ، بازاروں پر چھائی ہوئی ہیبت ، خدا کی شان کے جلوے ہر طرف بکھرے، محرابوں کی دیواروں کے سائے میں پہروں کھڑے ہونا، ان سب کا بیان ملتا ہے۔ وفورِ شوق میں ڈوبے ہوئے جذبات، احساسات ،تخیلات، دنیاوی سازوسامان ، پارچہ جات ،ریشم، کمخواب، اطلس ایئر کنڈیشنز، کولر ، چھت کے پنکھے ، لمبی چھوٹی شیشیاں، دیواری پنکھے ،تسبیحوں کے ڈھیر، جائے نمازوں کے انبار، اٹلی اور ترکی بنے ہوئے جائے نماز ،کھجوریں، یورپی مصنوعات اور مساجد کے باہر بکنے والا مذہبی سازوسامان یہ سب مضامین ممتاز مفتی کی تحریر میں جابجا ملتے ہیں۔

انھوں نے قلبی کیفیات کومن وعن بیان کیا۔ لوگوں کے دلی اور اوپری دونوں قسم کے جذبات کا ذکر کیا۔ اصلی مذہبی حوالوں اور قیاس آرائیوں میں فرق بیان کیا۔ دعا مانگنے اور نہ مانگنے والوں کے احوال لکھے۔ ہوس و حرص کے قصے بیان کیے اسلامی پس منظر کو ساتھ رکھتے ہوئے جدید دنیا کا پیش منظر لکھا۔ جذبات کی رو میں بہک کر ممتاز مفتی یہ دعا مانگ بھی مانگ بیٹھے کہ: ”یااللہ! تو اتنا اچھا ہے کہ اللہ تجھے خوش رکھے، اللہ تجھے عظمتیں بخشے۔“ [۱۵]

جذبات میں بہہ کر اس اینگل سے سوچا، کہ کوئی مسلمان بھی سوچ نہیں سکتا۔ بعض اوقات خالی ہاتھ اٹھا کر کھڑے ہونا اور دعا کے لیے الفاظ کا نہ ہونا۔ ایسے بزرگ کا قصہ جنہوں نے مسجدِ نبوی میں آنے سے اس لیے انکار کر دیا تھا کہ مسجد شاہ مراکو کے لیے خصوصی طور پر کھولی گئی تھی۔ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کی اذانوں سے دلوں کے جھنجھوڑے جانے کی کیفیات ،عام زائرین اور خصوصی زائرین میں فرق۔ نماز شروع کرتے ہی دور کی باتوں کا یاد آجانا، بھولے ہوئے نام یاد آجانا ، بڑی بڑی گتھیاں سلجھ جانا۔ طوافِ وداع کی اداس کیفیت، مدینہ منورہ سے رخصتی کی بوجھل کیفیت، مناسکِ حج پورے ہونے کی خوشی اور وہاں سے واپس آنے کا غم مل جل کر ایک عجیب سماں پیدا کررہے ہیں۔ وہاں سے واپس نکلتے ہی، سب حاجیوں کی حالت کا بدل جانا، گردنوں میں خم آجانا، چھاتیوں پر تمغے لگ جانا، کوئی تن کر وی آئی پی بن گیا۔ زائر اور حاجی والی کیفیت سے باہر نکلتے ہی عورت دکھائی دے جانا، ایئر ہوسٹس کا ممتاز مفتی کے دل ودماغ پر چھا جانا۔

کراچی ائیر پورٹ پر پہنچتے ہی ان کے بے تکلف دوستوں کا تمسخر آمیز جملوں سے ان کو استقبال کرنا، مذاق کرنا۔ کسی نے کہا رندی ہے، کسی کو لگتا ہے دوہئ گئے تھے۔ حج پر گئے ہوتے تو چہرے پر یہ نحوست نہ ہوتی۔ کسی نے کہا جیسے تھے ویسے ہی لوٹ آئے ہیں۔ کسی نہ کہا، داڑھی رکھ لی ہے اور تہجد پڑھتے ہیں۔ ایک بے تکلف دوست نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ: ''جتھوں دی کھوتی۔ او تھے آن کھلوتی'' ۵۲؎

منہ ول کعبے شریف میں:

مستنصر حسین تارڑ حج کے زائرین کے ساتھ، احرام باندھ کر لاہور ائیر پورٹ سے نہیں چلے۔ بلکہ عام سوٹ میں ملبوس اپنے بیٹے کے ساتھ گئے۔ ان کا دوسرا بیٹا جو سعودی عرب میں اقوام متحدہ کے دفتر میں تعینات تھا۔ اس کے پاس جدہ پہنچے۔ انھوں نے عام سفرنامہ نگاری کی طرح پہلے جدہ کے گلیوں، بازاروں، لوگوں، علاقوں، سڑکوں، دکانوں اور ہوٹلوں کے بارے میں خوب لکھا۔ پھر جدہ سے مکہ تک کا سفر بیان کیا۔ مکہ میں داخلے کے وقت ان کی حالت، خانہ کعبہ پہنچنے پر قلبی کیفیات، بار بار تاریخی حوالے، اپنے نظریات، اپنے جذبات اور اپنی خواہشات کا اظہار، منیٰ میں کنکریاں چننے اور جمروں کو مارنے کی تمام تر تفصیل، ہوٹلوں میں قیام کے دوران پیش آنے والی مشکلات، انواع واقسام کے حاجیوں سے ملاقات، مزدلفہ میں، عرفات میں قیام کی عجیب داستانیں، لوگوں کے رویے، خیموں میں قیام، دعاؤں کے انداز، لوگوں کی نگاہیں، خواتین کے مسائل، سب کچھ انھوں نے اپنے مخصوص اسلوب میں لکھا۔ خدائے بزرگ و برتر سے دعا مانگنے کا انوکھا اسلوب ان کے اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے۔ جس میں ایک نیم خواندہ لاہوری بابا دھریک کے تنے کو پکڑ کر روئے جا رہا تھا اور کہتا تھا کہ میری کالک بہت زیادہ ہے۔ میرے گناہ بہت زیادہ ہیں۔ اس نے مجھے نہیں بخشنا۔ میرے اللہ نے مجھے معاف نہیں کرنا۔ میں دعا کیسے مانگوں، میں دعا نہیں مانگ سکتا۔ اپنی گناہوں کی ندامت، کھلے آسمان تلے رات، زم زم کے کنویں کا تاریخی بیان، صفا و مروہ کی سعی کی وجۂ تسمیہ، طواف اور سعی میں فرق کی وضاحت کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں

طواف مکمل عشق ہے
اور سعی مکمل دانش ہے
طواف اللہ تعالیٰ کی مرضی ہے
اور سعی تمہاری مرضی ہے ۵۳؎

خانہ کعبہ سے وداع کے بیان میں خود کو چڑیاں دا چنبہ اور خانۂ خدا کو بابل دا ویڑہ قرار دیتے ہوئے ہجر کی اداسی بیان کی۔ جمروں کو کنکریاں مارتے وقت وہ کنکریاں اپنے وجود پر برستی محسوس ہونا۔ ایک نہایت فکر انگیز

تاثر پیدا کرتا ہے۔ صُفّہ کے مقام پر خود کو اصحابِ صفہ کے تھڑے پر بیٹھا ہوا ایک لاچار صحابی محسوس کرتا۔ نبی کریم ﷺ پر ہونے والے مظالم کا دکھ بھرے انداز میں بیان سبز گنبد کے بارے میں معلومات دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ سبز گنبد پہلے ادوار میں مختلف رنگوں میں ہوا کرتا تھا۔ اسلام کی رنگارنگی میں سب رنگ ہیں۔ روضۂ رسول کے اندرونی حصے کی داستان بڑے پرنم انداز میں بیان کی ہے کہ پڑھنے والے کی آنکھیں اشک بار ہوئے بغیر رہ نہیں سکتیں۔ غزوات کے تاریخی حوالے دیے گئے ہیں۔ مساجد کی زیارت، اور حضرت عثمان کے کنویں پر حاضری سب ان کی تحریر میں محفوظ ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ سید عابد علی عابد، اسلوب، سنگِ میل پبلیکیشنز، ۲۰۱۱، ص ۱۹۳

۲۔ سید عابد علی عابد، اسلوب، سنگِ میل پبلیکیشنز، ۲۰۱۱، ص ۲۰۰

۳۔ ڈاکٹر نجیبہ عارف، ممتاز مفتی، شخصیت اور فن، اکادمی ادبیات پاکستان، ص ۱۱۲، ۱۱۳

۴۔ افتخار عارف، پیش نامہ، ممتاز مفتی، شخصیت اور فن، اکادمی ادبیات پاکستان، ص ۷

۵۔ فاروق اقدس، کالم، اخبارِ جہاں

۶۔ ممتاز مفتی، لبیک، رُمیل ہاؤس آف پبلیکیشنز، ۲۰۱۴، ص ۳۴

۷۔ مستنصر حسین تارڑ، منہ ول کعبے شریف، سنگِ میل پبلیکیشنز، ۲۰۱۷، ص ۱۲

۸۔ ممتاز مفتی، لبیک، رُمیل ہاؤس آف پبلیکیشنز، ۲۰۱۴، ص ۲۲

۹۔ مستنصر حسین تارڑ، منہ ول کعبے شریف، سنگِ میل پبلیکیشنز، ۲۰۱۷، ص ۴۳

۱۰۔ ممتاز مفتی، لبیک، رُمیل ہاؤس آف پبلیکیشنز، ۲۰۱۴، ص ۴۳

۱۱۔ مستنصر حسین تارڑ، منہ ول کعبے شریف، سنگِ میل پبلیکیشنز، ۲۰۱۷، ص ۵۳

۱۲۔ ممتاز مفتی، لبیک، رُمیل ہاؤس آف پبلیکیشنز، ۲۰۱۴، ص ۶۳

۱۳۔ مستنصر حسین تارڑ، منہ ول کعبے شریف، سنگِ میل پبلیکیشنز، ۲۰۱۷، ص ۸۵

۱۴۔ ممتاز مفتی، لبیک، رُمیل ہاؤس آف پبلیکیشنز، ۲۰۱۴، ص ۳۷

۱۵۔ مستنصر حسین تارڑ، منہ ول کعبے شریف، سنگِ میل پبلیکیشنز، ۲۰۱۷، ص ۹۰

۱۶۔ ممتاز مفتی، لبیک، رُمیل ہاؤس آف پبلیکیشنز، ۲۰۱۴، ص ۵۴

۱۷۔ مستنصر حسین تارڑ، منہ ول کعبے شریف، سنگِ میل پبلیکیشنز، ۲۰۱۷، ص ۲۰۵، ۲۰۶

۱۸۔ ممتاز مفتی، لبیک، رُمیل ہاؤس آف پبلیکیشنز، ۲۰۱۴، ص ۲۰۲

۱۹۔ ممتاز مفتی، لبیک، رُمیل ہاؤس آف پبلیکیشنز، ۲۰۱۴، ص ۲۰۶

۲۰۔ مستنصر حسین تارڑ، منہ ول کعبے شریف، سنگِ میل پبلیکیشنز، ۲۰۱۷، ص ۳۴۳

۲۱۔ مستنصر حسین تارڑ، منہ ول کعبے شریف، سنگِ میل پبلیکیشنز، ۲۰۱۷، ص ۳۵۲

۲۲۔ ممتاز مفتی، لبیک، رُمیل ہاؤس آف پبلیکیشنز، ۲۰۱۴، ص ۲۶۲

۲۳۔ مستنصر حسین تارڑ، منہ ول کعبے شریف، سنگِ میل پبلیکیشنز، ۲۰۱۷، ص ۴۴۲

۲۴۔ مستنصر حسین تارڑ، منہ ول کعبے شریف، سنگِ میل پبلیکیشنز، ۲۰۱۷، ص ۴۴۹

۲۵۔ مستنصر حسین تارڑ، منہ ول کعبے شریف، سنگِ میل پبلیکیشنز، ۲۰۱۷، ص ۴۵۳

۲۶۔ مستنصر حسین تارڑ، منہ ول کعبے شریف، سنگِ میل پبلیکیشنز، ۲۰۱۷، ص ۴۵۷

۲۷۔ سید عابد علی عابد، اسلوب، سنگِ میل پبلیکیشنز، ۲۰۱۱، ص ۵۹

۲۸۔ سید عابد علی عابد، اسلوب، سنگِ میل پبلیکیشنز، ۲۰۱۱، ص ۹۸

۲۹۔ ممتاز مفتی، لبیک، رُمیل ہاؤس آف پبلیکیشنز، ۲۰۱۴، ص ۳۳، ۳۴

۳۰۔ مستنصر حسین تارڑ، منہ ول کعبے شریف، سنگِ میل پبلیکیشنز، ۲۰۱۷، ص ۱۲

۳۱۔ ممتاز مفتی، لبیک، رُمیل ہاؤس آف پبلیکیشنز، ۲۰۱۴، ص ۶۳

۳۲۔ ممتاز مفتی، لبیک، رُمیل ہاؤس آف پبلیکیشنز، ۲۰۱۴، ص ۱۲۰

۳۳۔ مستنصر حسین تارڑ، منہ ول کعبے شریف، سنگِ میل پبلیکیشنز، ۲۰۱۷، ص ۶۷

۳۴۔ مستنصر حسین تارڑ، منہ ول کعبے شریف، سنگِ میل پبلیکیشنز، ۲۰۱۷، ص ۱۰۵

۳۵۔ ممتاز مفتی، لبیک، رُمیل ہاؤس آف پبلیکیشنز، ۲۰۱۴، ص ۸۰

۳۶۔ مستنصر حسین تارڑ، منہ ول کعبے شریف، سنگِ میل پبلیکیشنز، ۲۰۱۷، ص ۳۶

۳۷۔ مستنصر حسین تارڑ، منہ ول کعبے شریف، سنگِ میل پبلیکیشنز، ۲۰۱۷، ص ۲۰۹

۳۸۔ ممتاز مفتی، لبیک، رُمیل ہاؤس آف پبلیکیشنز، ۲۰۱۴، ص ۳۵

۳۹۔ ممتاز مفتی، لبیک، رُمیل ہاؤس آف پبلیکیشنز، ۲۰۱۴، ص ۸۵

۴۰۔ مستنصر حسین تارڑ، منہ ول کعبے شریف، سنگِ میل پبلیکیشنز، ۲۰۱۷، ص ۹۶

۴۱۔ مستنصر حسین تارڑ، منہ ول کعبے شریف، سنگِ میل پبلیکیشنز، ۲۰۱۷، ص ۱۴۸

۴۲۔ ممتاز مفتی، لبیک، رُمیل ہاؤس آف پبلیکیشنز، ۲۰۱۴، ص ۷۳

۴۳۔ ممتاز مفتی، لبیک، رُمیل ہاؤس آف پبلیکیشنز، ۲۰۱۴، ص ۷۸

۴۴۔ مستنصر حسین تارڑ، منہ ول کعبے شریف، سنگِ میل پبلیکیشنز، ۲۰۱۷، ص ۵۰، ۵۱

۴۵۔ ممتاز مفتی، لبیک، رُمیل ہاؤس آف پبلیکیشنز، ۲۰۱۴ء، ص ۶۵

۴۶۔ ممتاز مفتی، لبیک، رُمیل ہاؤس آف پبلیکیشنز، ۲۰۱۴ء، ص ۱۳۴

۴۷۔ مستنصر حسین تارڑ، منہ ول کعبے شریف، سنگِ میل پبلیکیشنز، ۲۰۱۷ء، ص ۳۵

۴۸۔ مستنصر حسین تارڑ، منہ ول کعبے شریف، سنگِ میل پبلیکیشنز، ۲۰۱۷ء، ص ۱۶۹

۴۹۔ ممتاز مفتی، لبیک، رُمیل ہاؤس آف پبلیکیشنز، ۲۰۱۴ء، ص ۲۶۳، ۲۶۴

۵۰۔ مستنصر حسین تارڑ، منہ ول کعبے شریف، سنگِ میل پبلیکیشنز، ۲۰۱۷ء، ص ۳۲۷

۵۱۔ ممتاز مفتی، لبیک، رُمیل ہاؤس آف پبلیکیشنز، ۲۰۱۴ء، ص ۲۰۵

۵۲۔ ممتاز مفتی، لبیک، رُمیل ہاؤس آف پبلیکیشنز، ۲۰۱۴ء، ص ۲۷۵

۵۳۔ مستنصر حسین تارڑ، منہ ول کعبے شریف، سنگِ میل پبلیکیشنز، ۲۰۱۷ء، ص ۲۳۱

حاصل بحث، نتائج اور سفارشات:

لبیک اور منہ ول کعبے شریف کے تقابلی جائزہ کے بعد ہمیں جو نتائج حاصل ہوئے ان سے ہمیں ان باتوں کا ادراک ہوتا ہے کہ اردو میں سفرنامۂ حج کی روایت بہت پرانی ہے۔ مختلف ادوار میں مختلف لوگوں نے حج کے سفرنامے لکھے۔ جن میں خواتین بھی شامل ہیں۔ بحری جہاز پر، پیدل، ہوائی جہاز پر، قافلوں میں اور ہر طرح کے حج کے سفر کے قصے ان سفرناموں میں ملتے ہیں۔ ان سفرناموں میں تحریر کی ندرت، بوقلمونی اور نیاپن موجود ہے۔ ہر لکھنے والے کا اپنا اسلوب ہے۔ ان سفرناموں اور ان کے مصنفین کا ذکر ہم باب نمبر 1 ہو چکا ہے۔ ہر سفرنامے کا اپنا اسلوب ہے۔ ہمیں ان کی تاریخ اور مختلف اسالیب کے بارے میں مکمل رہنمائی حاصل ہوئی۔ مختلف ادوار میں کس طرح لوگوں نے حج کی صعوبتیں برداشت کیں۔ کیسے سفر کیے۔ کن کن علاقوں سے گزرے وہاں کے لوگوں کے رہن سہن کیا تھے۔ کیسے کیسے عجیب وغریب حالات سے ان کے واسطے پڑے۔ کھانے پینے اور دیگر ضروریات زندگی سے کیسے نبرد آزما ہوئے۔ کس علاقے کی آب وہوا کیسی تھی۔ وہاں کی تہذیب، معاشرت، مذہب کیسے تھے۔ عشقِ رسول میں ڈوبے ہوئے قصے بھی ملتے ہیں۔ اور عام دنیادار زائرین کی کیفیات بھی۔

طواف، حطیم، سعی، مزدلفہ، منیٰ، وقوف، وداع اور سبھی کیفیات کا بیان ہے۔ عام قاری جو کبھی عمرہ یا حج پر نہیں گیا اسے ان سفرناموں کو پڑھ کر کافی حد تک ادراک ہو جاتا ہے کہ کون سا مقام کہاں ہے۔ کونسا رکن کب ادا کرنا ہے۔ کونسے مناسک کی ادائیگی فرض ہے اور کونسی سنت، مذہبی میلان، ایمان کی کمی یا زیادتی، اپنی خوبیوں اور خامیوں کا ادراک، فلسفۂ حج، خدا کے احکامات، نبی کریم ﷺ کی ترجیحات اور عام آدمی کے حج کی مکمل روداد، ان سفرناموں میں موجود ہے۔

دوسرے باب میں ہم نے لبیک کے مصنف ممتاز مفتی کے حالاتِ زندگی کے بارے میں جانا۔ ان کی پیدائش، ابتدائی تعلیم، خاندانی پس منظر، لکھنے کا آغاز، افسانوں کی تعداد، کتب کے نام، جس جس صنف میں کام کیا ان کے بارے حوالوں کے ساتھ ثبوت، ان کے آئیڈیل قدرت اللہ شہاب کے بارے میں معلومات۔ ان کی خاندانی زندگی، بیوی بچوں اور گھریلو معاملات کا بیان ملتا ہے۔ خصوصاً ان کے سفرنامہ حج لبیک کے بارے میں مختلف طبقہ ہائے فکر کے لوگوں کی آراء، اور بے لاگ تبصرے۔ ان کی خودنوشت علی پور کا ایلی اور الکھ نگری میں سے لی گئی ان کی ذاتی معلومات سے قارئین کو آگاہی ہوئی۔

دوسرے باب کے حصہ (ب) میں ہمیں منہ ول کعبے شریف کے مصنف مستنصر حسین تارڑ کے بارے میں جاننے کا موقع ملا۔ ان کی پیدائش کا گاؤں، ان کے والد کا زرعی کاروبار، لاہور میں ان کی آمد،

ڈراموں میں کام، کالم نگاری،کوہ پیمائی اور سفرنامہ نگاری،ان کے سفرناموں اور ناولوں کی تعداد،ان پر کیے گئے تبصرے،ان پر ملنے والے ایوارڈ کے بارے میں معلومات ملتی ہیں۔ان کی ذاتی زندگی کے بارے میں معلومات ملتی ہیں۔

تیسرے باب میں ہم نے لبیك اورمنه ول کعبے شریف میں فکری اور موضوعاتی اشتراکات پر بحث کی۔ پہلے دونوں سفرناموں کے فکری اور اسلوبیاتی پہلو پر روشنی ڈالی گئی۔ پھر ان دونوں سفرناموں کے مشترک فکری و موضوعاتی پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی۔اس باب میں ان دونوں سفرناموں میں موجود ذہنی میلانات، آغازِ سفر، مناسکِ حج سے لاعلمی اور لوگوں سے مشورے، سفر کی کیفیات، جدہ میں قیام، خانہ کعبہ پر پہلی نظر، دعاؤں کا سلسلہ، طوافِ کعبہ، بوسہ حجرِ اسود، عبادات، عورتوں اور مردوں کی ایک جگہ موجودگی، منیٰ کا بیان، وقوفِ عرفات، روضۂ رسول پر حاضری، الوداعی جذبات، وطن واپسی پر لوگوں کے تاثرات، جیسے موضوعات پر سیر حاصل بحث کی گئی۔ یہ موضوعات دونوں سفرناموں میں مشترک ہیں۔

دونوں سفرناموں میں اسلوبیاتی اشتراکات پر بات ہوئی تو دونوں ادیبوں کے مخصوص اسلوب کے بارے میں جاننا ضروری تھا۔ جو ان کی سابقہ تحریروں سے ہم نے اخذ کیا۔ اسلوب کے متعلق سید عابد علی عابد، سر سید، غالب اور لوکس کی آرا کا جائزہ لیا گیا۔لبیك اورمنه ول کعبے شریف کے اسلوبیاتی اشتراکات سادہ بیانی، مکالمہ نگاری، کیفیت بیانی، روحانیت، منظر نگاری، ذاتی رائے، اپنی شخصیت، ذاتی رائے، تمثال نگاری اور جزئیات نگاری ہیں۔ دونوں مصنفین کے اسلوب میں درج بالا خصوصیات پائی جاتی ہیں۔

چوتھے باب میں ہمیں لبیك اورمنه ول کعبے شریف کے درمیان فکری و موضوعاتی امتیازات کو جاننے کا موقع ملا۔ اس سے ہمیں بات کو بخوبی اندازہ ہوگیا کہ دونوں مصنفین نے مختلف موضوعات پر قلم اٹھایا ہے۔ اور ان کے فکری انداز بھی مختلف ہیں۔

ان دونوں سفرناموں میں خیال افروزی کا فرق ہے،تصویریت مختلف ہے۔ دونوں کے ذہنی رجحان مختلف ہیں۔آغازِ سفر، مناسکِ حج سے متعلق مشوروں، احوالِ سفر، خانہ کعبہ پر پہلی نظر پڑنے پر پیدا ہونے والی کیفیات، عبادات کے سلسلوں میں، منیٰ کے بیان میں، جذبۂ عشقِ رسول میں، الوداعی جذبات میں، غارِ حرا کی حاضری، بوسۂ حجرِ اسود اور دیگر کئی موضوعات میں واضح فرق موجود ہے۔

دونوں سفرناموں میں اسلوبیاتی امتیازات کا جائزہ لیتے ہوئے ہمیں ان باتوں کے بارے میں پتہ چلا کہ دونوں مصنفین نے اپنے اپنے اسلوب میں بات کی ہے۔ ایک نے کسی ایک موضوع پر لکھا ہے تو دوسرے نے لکھا ہی نہیں۔ اسی طرح بہت سے اسلوبیاتی امتیازات سامنے آئے۔ جن میں اختصار، جو کہ ممتاز مفتی کا اسلوب ہے۔ اور طوالت مستنصر حسین تارڑ کا، زورِ بیان میں فرق ہے۔ بذلہ سنجی، جو مستنصر حسین تارڑ کا خاصہ

ہے۔ممتاز مفتی سنجیدہ مصنف ہیں۔تشبیہات کا فرق ہے،لوگوں سے اثر قبول کرنے میں امتیازات ہیں۔معرفتِ الٰہی کے بیان میں دونوں ادیبوں کا اسلوب یکسر مختلف ہے۔

تاریخ کے حوالے دینے میں مستنصر حسین تارڑ مستند تاریخی حوالے دیتے ہیں ،جبکہ ممتاز مفتی کہانیاں بیان کرتے ہیں۔ممتاز مفتی کو بوسۂ حجر اسود نصیب ہوا جبکہ مستنصر حسین تارڑ کو نہیں۔ممتاز مفتی روضۂ رسول کے اندر نہیں گئے جبکہ مستنصر حسین تارڑ کو روضۂ رسول کے اندر جانے شرف بھی حاصل ہوا۔ممتاز مفتی کی حیثیت ایک عام زائر کی تھی جبکہ مستنصر حسین تارڑ اپنے بیٹے سلجوق کی وجہ سے خصوصی زائر کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ممتاز مفتی کے ہاں عشقِ رسول پر وہ پُر درد اور اثر انگیز الفاظ نہیں ہیں جو مستنصر حسین تارڑ کے یہاں پائے گئے۔دیگر کئی مقامات پر بھی دونوں سفرناموں میں اسلوبیاتی امتیازات پائے گئے۔یہ امتیازات دونوں ادیبوں کے مخصوص اسلوب کا نتیجہ ہیں۔

حاصلِ کلام:

چاروں ابواب کے مرتب کرنے ،تحریر کرنے اور انھیں ایک مقالہ کی شکل دینے کے دوران جو چیز ،ہمیں ایک خلاصہ کے طور پر حاصل ہوئی وہ خانہ کعبہ اور مسجد نبوی میں جانے کی تڑپ ہے۔راقم الحروف کا دل بھی ان مقدس مقامات پر جانے کے لیے تڑپ تڑپ اٹھا۔ان مقامات کا جغرافیائی شعور، مذہبی اہمیت ،فلسفہ، مصائبِ سفر، برداشت کرنے کی تربیت، ان مقامات پر پہنچ کر تبدیل ہونے والی قلبی حالت کا بیان اس کے علاوہ ہے۔یہ سب کچھ نہ صرف راقم الحروف کے علم میں بے بہا اضافہ کا باعث بنا بلکہ جس ذی روح تک بھی یہ تحریر پہنچے گی۔جو کوئی اس کا مطالعہ کرے گا اس تک بھی یہ معلومات، کیفیات اور یہ تڑپ ضرور پہنچے گی۔

نئی جہتیں:

ان سفرناموں سے پہلے جن لوگوں نے سفرنامہ ہائے حج تحریر کیے۔انھوں نے بے بہا موضوعات پر قلم اٹھایا۔عشق و سرمستی کی کیفیات بیان کیں۔انھوں نے اپنے اپنے دور کے مطابق اپنے قلم کو جنبش دی۔سب نے بڑے پیارے اور خوبصورت انداز میں ان مذہبی عقائد اور جوش و جذبے کو قلم بند کیا۔لیکن لبیک اور منہ ول کعبے شریف ان سفرناموں سے مختلف ہیں، کیونکہ انھوں نے فنِ سفرنامہ نگاری میں نئی نئی جہتیں متعارف کروائیں۔رب سے بے تکلفی کا جو انداز ممتاز مفتی نے اپنایا۔اس سے پہلے کسی نے نہیں اپنایا۔مقدس مقامات کے بارے میں عام سے اور گرے ہوئے الفاظ کا استعمال کرنے کا اسلوب بھی ممتاز مفتی سے پہلے کسی کے حصے میں نہیں آیا تھا۔انھوں نے اس جہت سے سفرِ حج کیا کہ حج کے دوران پیش آنے والے مسائل کو مصیبت کہا۔رب کو خانہ کعبہ کی چھت پر دیکھنے کے قصے بیان کیے۔اللہ کو دعا دینے کا انوکھا آئیڈیا متعارف کروایا۔ان کے انداز کا نوکیلا پن انکا مخصوص اسلوب ہے ،جو پورے سفرنامے پر چھایا ہوا ہے۔یہی اسلوب ان کی نئی جہت

ہے۔ جو اس سے پہلی کسی حج نامہ نگار کے حصے میں نہیں آئی۔ اس اسلوب سے کام لیتے ہوئے انھوں نے ایسی ایسی باتیں بھی کہہ ڈالیں جن کے بارے میں لوگوں کی رائے تھی کہ ممتاز مفتی روس کے ایجنٹ ہیں۔ اور انھیں ایسی کتابیں لکھنے کے لیے روس مالی سپورٹ کرتا ہے، تاکہ لوگ مذہب سے بیزار ہوسکیں۔ ان کا یہی باغیانہ انداز ان کے سفرنامے کا نیا پن ہے۔ جو انھیں سابقہ تمام سفرناموں سے ممتاز کرتا ہے۔ ان کے اس سفرنامے نے تہلکہ مچادیا تھا۔ مخالفین اور حامی دونوں نے بھرپور انداز میں اس پر تبصرے کیے۔ الغرض ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ممتاز مفتی نے لبیک لکھ کر حج سفرناموں میں ایک نئی جہت متعارف کروائی ہے۔

منہ ول کعبے شریف میں نئی جہتیں:

پرانے سب سفرناموں کے اجمالاً تعارف سے ہمیں یہ بات بھی پتہ چلتی ہے کہ مستنصر حسین تارڑ سے پہلے ایسے نوکیلے، تیکھے، سرشاری والے اور بہکے ہوئے انداز کسی اور سفرنامہ نگار نے بات نہیں کی۔ مستنصر حسین تارڑ اپنے روایتی سفرناموں کی طرح اس سفرنامۂ حج میں بھی قاری کی انگلی پکڑ کر اسے ساتھ لے چلتے ہیں۔ اسے کعبہ کی روشنیاں دیکھنے کے لطف سے سرشار کرواتے ہیں۔ خانہ کعبہ کے بیرون اور اندرون کا حال سناتے ہیں۔ وہ بھی عبادت کے سلسلے میں اتنے پکے مسلمان نہیں۔ لوگوں کے عبادت کرنے سے بیزار ہو جاتے ہیں۔ بھنورے جیسی کسی چیز کو خانہ کعبہ اور حرم شریف میں ہر جگہ دیکھتے ہیں۔

معجزات کا ذکر کرتے ہیں۔ تاریخی حوالے ایسے پُر درد انداز میں دیتے ہیں کہ آنسو چھلک پڑتے ہیں۔ ہاجرہ کو ایسی عورت گردانتے ہیں جو حج کی اصل ہے اور اللہ کی ہمسائی ہے۔ غارِ حرا کے بارے میں مفصل تحریر کرتے ہیں۔ مدینہ منورہ اور روضۂ رسول کے بارے میں تاریخی معلومات کے ساتھ ساتھ وفورِ عشق میں ڈوبی ہوئی بات بیان کرتے ہیں۔ الغرض ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مستنصر حسین تارڑ کے سفرنامۂ حج ''منہ ول کعبے شریف'' نے فنِ حج نامہ نگاری میں نئی جہتیں متعارف کروائی ہیں۔ جو ان سے پہلے کسی کے حصہ میں نہیں آئیں۔ دونوں سفرنامہ نابغۂ روزگار ہیں۔ ان کتب کا ہر مسلمان کے گھر میں ہونا ضروری ہے۔

کتابیات

☆ ابن بطوطہ،مولانا عطا الرحمان(مترجم)،عجائب الاسفات،رحمانی پریس،دہلی،۱۹۴۹

☆ اختر اورینوی،بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقاء،ترقی اردو بیورو،نئی دہلی،۱۹۸۹ء،بحوالہ مضمون رخشاں ابدالی: ندیم، بہار نمبر،۱۹۳۵ء

☆ امۃ الغنی نور النساء،مرتبہ:حسن جہاں،سفر نامہ ء حجاز،شام و مصر،حیدرآباد،ورڈ ماسٹر کمپیوٹر پبلی کیشنز سینٹر،۱۹۹۶ء

☆ انور سدید،ڈاکٹر،اُردو ادب میں سفر نامہ

☆ پروفیسر مختار الدین احمد،نشاط آبلہ پائی،از اطہر صدیقی (فلیپ)،علی گڑھ ہیریٹیج پبلی کیشنز،علی گڑھ، ۲۰۰۷ء

☆ پروفیسر ممتاز چٹھہ،جلال و جمال،لاہور،ابلاغ پبلی کیشنز،۲۰۰۳ء

☆ تجمل حسین،سراج الحرمین،بریلی،مطبع صدیقی،۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳ء

☆ جمیل جالبی،ڈاکٹر،قومی انگریزی اردو لغت،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،دہلی،س ن،جلد۲

☆ حکیم ناصر خسرو،محمد عبدالرزاق کان پوری،(مترجم)،سفر نامہ حکیم ناصر خسرو،انجمن ترقی اردو،دہلی،۱۹۴۱ء

☆ خداداد خان،پا پیادہ حج خدا داد،مرادآباد،مصنف،ت ن

☆ خطیب قادر بادشاہ،سفر حجاز،مدارس،مطبع نامی،۱۳۴۵ھ/۲۷-۱۹۲۶ء،طبع دوم

☆ ڈاکٹر ابدال بیلا،لو سٹوری،مشمولہ ممتاز مفتی

☆ ڈاکٹر خالد محمود،اُردو سفر ناموں کا تنقیدی مطالعہ،نئی دہلی،۱۹۹۵

☆ ذوالفقار احمد تابش،تعارف لبیک

☆ راحیل شیروانیہ،زاد السبیل،مقام اشاعت و مطبع نامعلوم،ت ن

☆ رشید امجد،ڈاکٹر،ممتاز مفتی کی ہند یاترا،مشمولہ ہند یاترا

☆ رفیع الدین فاروقی مرادآبادی،نسیم احمد آفریدی امروہوی(مترجم)،سفر نامہ حجاز

☆ سہیل بخاری،ڈاکٹر،علی پور کاایلی اردو کے چند معروف ناقدین اور قارئین کی

آراء، مکتبہ میری لائبریری لاہور

☆ سید احمد دہلوی، مولوی، فرہنگ آصفیہ، اردو سائنس بورڈ، لاہور، ۱۹۸۷ء، جلد ۳، ۴

☆ سید دلاور علی، سیاحت الحرمین، بزیارت الثقلین، حیدر آباد، مطبع عزیز دکن، ت ن

☆ سید شاہ عطا حسین فانی گیاوی، دید العرب المعروف به ہدایت المسافرین، (قلمی)، مخزونہ: خانقاہ منعمیہ، گیا، ۱۲۶۴ھ/ ۱۸۴۸ء

☆ شاہ ولی اللہ، سعادت کونین (ترجمہ)، مطبع احمدی متعلق مدرسہ عزیزی، ت، ن

☆ شوکت علی شاہ، پہنچے تیرے حضور، خزینہ علم وادب، لاہور، ۲۰۰۲

☆ صادقہ ذکی، خیموں کے شہر میں، نئی دہلی، مصنفہ، ۱۹۹۸ء

☆ عبدالحق محدث دہلوی، حکیم سید عرفان علی (مترجم)، دیار المحبوب، تاج کمپنی، دہلی، ۱۹۸۴ء

☆ عبدالحق، ڈاکٹر، The Standard English, Urdu Dictionary، انجمن ترقی اُردو، نئی دہلی، ۲۰۰۱ء

☆ علیم الدین، رسالہ ء حج، لکھنو، نامی پریس، ۱۸۹۲ء

☆ فاروق اقدس، کالم، اخبارِ جہاں

☆ فانی گیاوی، مثنوی سرِ عطا، (عکس مخطوطہ) مخزونہ: ذاتی لائبریری، ڈاکٹر عطا خورشید علی گڑھ (اصل مخطوطہ خانقاہ منعمیہ، گیا میں موجود ہے۔)

☆ فیروز الدین، مولوی، جامع فیروز اللغات، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۱ء

☆ قدسیہ قریشی، ڈاکٹر، اردو سفر نامے۔انیسویں صدی میں، مکتبہ جامع لمٹیڈ، نئی دہلی، ۱۸۹۷

☆ لویس معلوف، المنجد، المکتبۃ الکاثولیکیۃ، بیروت، ت۔ن۔مادہ رحل

☆ ماہر القادری، کاروان حجاز، نئی دہلی، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، ۲۰۰۳ء

☆ محمد حفظ الرحمن وفا ڈبائیوی، راہ وفا، علی گڑھ، مسلم یونیورسٹی پریس، ۱۹۳۸ء/ ۱۳۵۷ھ

☆ محمد حفیظ اللہ، سفر نامۂ عرب، پٹنہ، مبع احمدی، ۱۳۱۲ھ/ ۹۵۔۱۸۹۴ء

☆ محمد خاں، کرنل، دیباچہ اندلس میں اجنبی، سنگِ میل پبلیکیشنز، ۱۹۷۲

☆ محمد ذاکر علی خان، میاں کی اٹریاتلے، کراچی

☆ محمد عمر علی خان، زادِ غریب، میرٹھ، مطبع گلزار محمدی، ۱۳۱۳ھ/ ۹۶۔۱۸۹۵ء

☆ محمد قیوم اعوان،لا شریک،لاہور،ساگر پبلشرز،۱۹۹۹ء

☆ محمد مصطفیٰ خان شیفتہ،سید زین العابدین (مترجم)،سراج منیر،مطبع آگرہ اخبار،آگرہ،۱۹۱۰ء

☆ مرزا عرفان علی بیگ،سفر نامہ ء حجاز،لکھنو،مطبع منشی نول کشور،۱۸۹۵ء

☆ مستنصر حسین تارڑ،منہ ول کعبے شریف،سنگِ میل پبلیکیشنز، ۲۰۱۷

☆ مستنصر حسین تارڑ،اندلس میں اجنبی،سنگِ میل پبلیکیشنز،۱۹۷۲

☆ مستنصر حسین تارڑ،دیو سائی،سنگِ میل پبلیکیشنز،۱۹۸۲

☆ مستنصر حسین تارڑ،نکلے تری تلاش میں،سنگِ میل پبلیکیشنز، ۱۹۷۱

☆ مسعود قریشی،بیسویں صدی کا نمائندہ ادیب،مشمولہ مہا اوکھا

☆ مفتی محمد حسین،تذکرہ ٔ مفتیاں، فیروز سنز لاہور،۱۹۹۲

☆ ممتاز شاہین مظہر،مفتیریا،مشمولہ ممتاز مفتی

☆ ممتاز مفتی،الکھ نگری

☆ ممتاز مفتی، ہونی ان ہونی،مشمولہ ممتاز مفتی

☆ ممتاز مفتی، گہما گہمی

☆ ممتاز مفتی،لبیک،رُمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز،۲۰۱۴

☆ ممتاز مفتی،ہند یاترا

☆ ممتاز مفتی،باندی،مشمولہ اوکھے لوگ،یونیورسل بکس لاہور،۱۹۸۶

☆ منصب علی خان،ماہ عرب المعروف بہ کعبہ نما،میرٹھ،مطبع محب کشور ہند،۱۲۸۸ھ/۱۸۷۱ء

☆ مولانا کوثر نیازی،فلیپ لبیک

☆ مولانا مسعود احمد ندوی،دیار عرب میں چند ماہ،کراچی،مکتبہء چراغ راہ،۱۹۵۰ء

☆ نجیبہ عارف،ڈاکٹر،ممتاز مفتی شخصیت اور فن،اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۰۷

☆ نذیر احمد،تعارف لبیک

☆ نواب احمد حسین خان،سفر نامہ ء حجاز و مصر،دہلی،کرزن اسٹیم پریس،۱۹۰۴ء

☆ نواب سکندر بیگم،یادداشت تاریخ و قائع حج (قلمی)،مخزونہ: رام پور رضا لائبریری،رام پور

☆ نورالحسن نیر، مولوی، نوراللغات، نیر پریس، لکھنو، ۱۳۴۷ھ، ج:۳

☆ Webester's Third International Dictionary, Massashusetts

☆ The Oxford English Dictionary

☆ Webester's Third International Dictionary

International Islamic Univ
CENTRAL
LIBRARY
ISLAMABAD